رضا علی عابدی

نغمہ گر

برصغیر کے نغموں کی تاریخ — عوامی تھیٹر سے مقبول فلموں تک

نغمہ گر

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

780.1 **Raza Ali Abdi**
Naghma Gar/ Raza Ali Abdi.- Lahore :
Sang-e-Meel Publications, 2013.
268pp.
1. Urdu Literature - Music.
I. Title.

2013ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2306-7
ISBN-13: 978-969-35-2306-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

آرزو لکھنوی کے نام

جنہوں نے گانے کو نغمہ بنایا

نغمے یوں آراستہ ہیں

پہلا بول

یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے

ہمارے دوست قیصر تمکین کہا کرتے ہیں کہ ہر اردو داں شاعر ہوتا ہے چاہے اُس نے عمر میں ایک شعر بھی نہ کہا ہو لیکن ضرورت پڑے تو لمحے بھر میں شعر موزوں کر سکتا ہے۔

میرا استدلال یہ تھا کہ یہ خوبی ہندی داں طبقہ میں بھی ہے۔ عجب اتفاق ہوا کہ مجھے اپنی دلیل کو آزمانے کا موقع مل گیا۔ ہندی داں احباب کا مجمع تھا اور مجھے ہندوستانی فلموں میں شاعری کے موضوع پر تقریر کرنی تھی۔

گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے کہا: خواتین وحضرات، کیا آپ کو پتہ ہے کہ آپ سب شاعر ہیں۔ میری اس بات پر کچھ لوگ آہستہ سے ہنسے اور کچھ زور سے۔ میں نے کہا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے (اس کہاوت کے آگے اسکول کے اردو داں لڑکے کہا کرتے تھے: بن پڑھے لکھے فارسی کیا ہے)۔ میں نے کہا کہ ابھی آزمائے لیتے ہیں۔ میں ابھی ابھی سوچ کر کوئی مصرعہ پڑھتا ہوں، آپ لوگ فوراً ہی اس پر دوسرا مصرعہ بٹھایئے، دیکھتے ہیں آپ سب شاعر ہیں یا نہیں۔ لوگ یوں سنبھل کر بیٹھ گئے جیسے کرکٹ کے میدان میں فیلڈر یوں تیار ہو جاتے ہیں جیسے بلّے کو چھو کر گیند سیدھی اُن ہی کے ہاتھوں میں آئے گی۔ میں نے مصرعہ پڑھا

کیسا پیارا منظر ہے

کچھ لمحے گزرے۔ کچھ لوگوں نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ بعض نے برابر والوں سے مشورہ کیا اور پھر تو مصرعوں کی جھڑی لگ گئی۔ سامنے بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے شعر مکمل کیا:

کیسا پیارا منظر ہے　　　کیونکہ ساتھ میں دلبر ہے

اور پچھلی نشستوں سے اٹھ کر ایک ہندی داں خاتون نے مصرعہ لگایا

کیسا پیارا منظر ہے　　　لیکن دل کے اندر ہے

جو بات میں ثابت کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ ہم سب کے دلوں کے اندر ایک شاعر چھپا بیٹھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم سب شعر نہیں کہتے لیکن اکثر موقعوں پر شعر جیسی باتیں ضرور کرتے ہیں اس کا سبب سیدھا سادا ہے۔

جس ماحول میں ہم رہتے بستے ہیں اس میں ہمیں محسوس ہو یا نہ ہو نغمے ہمارے گرد منڈلاتے ہیں۔ کہیں ریڈیو یا ٹیلیویژن پر، کہیں تہواروں میں، کہیں لوگوں سے بھری گلیوں میں، کہیں سودے والوں کی صداؤں میں اور خدا جانے کہاں کہاں، ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، نغمہ ہمارے کان کے پردوں سے چھو کر گزر رہا ہوتا ہے۔

(اس پر یاد آیا۔ اردو کے بہت بڑے دانشور مسعود حسن رضوی مرحوم کہا کرتے تھے کہ رات کے وقت نیچے گلی میں کوئی لڑکا غالب کا منسوخ کلام گاتا گزرتا ہے۔)

تو یہ نغمے ہماری قدیم روایتوں، لوک گیتوں، تھیٹر کے گانوں اور فلموں کی وہ فصلیں ہیں جو ہماری فضاؤں میں لہراتی جاتی ہیں اور پتوں میں سرسراتی ہوا کی مانند دبے پاؤں ہمارے دل و دماغ میں گھر کئے جاتی ہیں۔

غالب کے کلام پر ایک واقعہ یاد آیا۔

یہاں برطانیہ میں ہماری طرف کے ایک صاحب کو اپنے دفتر میں ملازمت کے لیے ایک ذہین نوجوان کی تلاش تھی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں سے کہا کہ کوئی موزوں لڑکا ہو تو انٹرویو کے لیے میرے پاس بھیجو۔ ایک ہونہار لڑکا ملازمت کی تلاش میں تھا جوان صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ انٹرویو ہوا تو نوجوان نے بتایا کہ اسے شاعری کا شوق ہے۔ وہ

صاحب بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ تمہیں کون سا شاعر پسند ہے۔نوجوان نے جھٹ غالبؔ کا نام لے دیا۔ان صاحب نے کہا کہ اچھا چلو غالبؔ کے کچھ شعر سناؤ۔نوجوان نے بڑی سعادت مندی سے وہ سارے شعر سنا دیئے جو فلم مرزا غالب میں ثریا، طلعت محمود اور محمد رفیع نے گائے تھے۔

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں کمال غالب کا ہے یا فلمی گانوں کا لیکن حقیت یہ ہے کہ جہاں جہاں ہوا پہنچتی ہے، مقبول نغمے بھی پہنچتے ہیں اور جہاں لوگ نغمے سنتے ہیں وہ پہلے دو چار بول یاد رکھتے ہیں، گانے والے کی آواز پہچانتے ہیں اور اس کا نام بھی انہیں یاد رہتا ہے۔ ذرا دلچسپی بڑھے تو میوزک ڈائریکٹر کے نام سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ اس ساری فہرست میں جس کا نام رہ جاتا ہے وہ غریب نغمہ گر ہے۔ایک زمانے میں تو گراموفون ریکارڈ پر اس کا نام بھی نہیں ہوتا تھا۔ ریڈیو والے گانا نشر کرتے وقت ساری تفصیل بتاتے تھے، نغمہ گر کا حوالہ تک نہیں دیتے تھے۔ گانے کی رائلٹی کی رقم سب کو جاتی تھی، گیت کار کو صاف بُھلا دیا جاتا تھا۔

وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے ساحر لدھیانوی کا جن کی نغموں کی دنیا پر حکمرانی تھی اور جن کی نازک مزاجی سے دنیا واقف تھی۔ انہوں نے ریڈیو والوں کی گوشمالی کی تو نغمہ نگار کا نام بھی نشر ہونے لگا اور اُسے رائلٹی کی رقم بھی ملنے لگی۔ چنانچہ پہلی بار گانے لکھنے والے کی اتنی شہرت ہوئی کہ ایس ڈی برمن جیسے بزرگ موسیقار جلنے لگے کہ گیت کاران سے زیادہ مشہور ہوئے جاتے ہیں۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اسے لکھنے کے جتنے اسباب ہیں اُس میں ایک چھوٹا سا سبب یہ مقصد بھی ہے کہ نغمہ نگاروں کو اُن کا جائز مقام دیا جائے۔

لیکن یہ کتاب لکھنے کا بڑا مقصد یہاں بیان کر دیا جائے تو اچھا ہو۔ میرے دوست اور بی بی سی کے ساتھی عبید صدیقی نے، جو اب جامعہ ملیہ اسلامیہ دلّی کے استاد ہیں، ایک بار کہا کہ کسی یونیورسٹی کو چاہیئے کہ کسی طالب علم سے اس موضوع پر ڈاکٹریٹ کرائے کہ فلمی گانوں نے ہماری شاعری میں اپنا کتنا حصّہ ڈالا ہے اور شاعری کی نزاکتوں اور نفاستوں اور

سب سے بڑھ کر ضابطے اور تنظیم کے آداب کو عام لوگوں تک کیونکر پہنچایا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو سنہ ۱۹۳۳ء سے یعنی جب سے بولنے والی فلمیں چلی ہیں۔ لاکھوں گیت، نظمیں، گانے یا نغمے، جو بھی کہہ لیجئے، عوام کے درمیان آئے ہیں اور گنگنائے گئے ہیں۔ کیا اس سوال کا جائزہ لینا مناسب نہ ہوگا کہ اس میدان میں دس بیس نہیں، سینکڑوں شاعروں نے اپنی ہنرمندی کو طرح طرح سے بروئے کار لا کر اور نئے نئے تجربے کر کے شاعری کی اس صنف کی کیسی کیسی خوبیوں کو ابھارا ہے۔

میں نے عبید صدیقی سے کہا کہ اس ساری گفتگو کا تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ کہیں بھی کوئی یونیورسٹی مقبول نغموں پر ریسرچ کرانے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری دینے کے عمل کو شایان شان نہیں سمجھے گی۔

مگر کیوں؟

کیونکہ فلمی گانوں کو سنجیدہ شاعری سے اچھوتوں کی طرح دور اور الگ رکھا جاتا ہے۔ فلم کے گانوں کی توقیر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات انہیں گھٹیا سمجھا جاتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ فلمی گانے لکھنے والے شاعروں کے ساتھ ایک عجیب سی حقارت برتی جاتی ہے۔

پاکستان کے سرکردہ نغمہ نگار قتیل شفائی مرحوم کہا کرتے تھے کہ یہ شاعر حضرات خود کو علمی شاعر اور مجھے فلمی شاعر کہتے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں نغمہ نگاروں کا کیس لڑا ہے اور اُن کے حق میں ان گنت دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ بڑے بڑے دیوان وقت کی خاک چاٹتے رہ جائیں گے اور ان فلمی شاعروں کے لکھے ہوئے مصرعے عرصہ دراز تک گونجا کریں گے۔

نغمے کے اس سفر کا آغاز اساتذہ کے زمانے سے ہوتا ہے جب ڈومنیاں اور طوائفیں بڑے بڑے شاعروں سے مانگ کر ان کا کلام لے جاتی تھیں۔ یہ کلام کوٹھے پر یا رجواڑوں میں گایا جاتا تھا جسے سننے کے لیے امیر اور رئیس جایا کرتے تھے۔ غریب غرباء نیچے گلی میں کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے۔

پھر لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے دربار میں اردو تھیٹر کی بنیاد پڑی۔ یہاں تک کہ تھیٹر

ایک بڑا کاروبار اور پیسہ کمانے کا ذریعہ بن گیا۔ دھیان رہے کہ اس میں تھیٹر کم اور گانا زیادہ ہوتا تھا۔ اس دوران گراموفون ریکارڈ ایجاد ہوا (۱۹۰۲ء کے لگ بھگ) یہ ریکارڈ انگریزوں کی راجدھانی کلکتے میں بنتے تھے جن میں اپنی آواز بھروانے کے لیے ملک بھر کے گانے والے کلکتے پہنچنے لگے۔ ان ریکارڈوں میں یا تو ٹھمری دادرے یا تھیٹر کے گانے بھرے جاتے تھے۔ وہی مقبول تھے اور ان ہی کا چلن تھا۔ ابھی تھیٹر کا زور باقی تھا کہ پہلے خاموش اور پھر بولنے والی فلمیں بننے لگیں مگر ان پر بھی تھیٹر کے انداز کی چھاپ تھی۔

بنگالیوں میں گانے کا سلیقہ بہت تھا مگر اس کے لیے انہیں سلیقہ مند نغمہ نگار درکار تھا۔ اُس وقت ہمارے منظر پر آرزو لکھنوی ابھرے جو مانے ہوئے شاعر تھے اور زبان کے ایسے بڑے ماہر تھے کہ پورا مجموعہ کلام ایسی نظموں کا ترتیب دے دیا جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ میں آرزو لکھنوی کو بابائے نغمہ تصوّر کرتا ہوں اور یہ کتاب اُن ہی کے نام ہے۔

فلم کی صنعت کلکتے کے بعد لاہور اور خصوصاً بمبئی میں پروان چڑھی (اس وقت اس شہر کا نام ممبئی نہیں تھا اس پوری کتاب میں آپ اس کا نام بمبئی ہی پائیں گے) اس دوران آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد پڑی، نغمہ سراہنے والوں کو کہیں جا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی اور نغمہ گھروں کے اندر جا پہنچا۔ ساتھ ہی ہمارے شاعر لاہور اور بمبئی پہنچنے لگے اور پھر جو گیت لکھے گئے انہوں نے بڑی عمر پائی۔

اسی کے ساتھ موسیقی کے انداز بھی بدلے گئے۔ تھیٹر کے ٹھمری دادرے کا دور ختم ہوا اور خدا بھلا کرے ہمارے موسیقار غلام حیدر کا جنہوں نے جدید نغمے کی بنیاد رکھی۔ ادھر ترقی پسند تحریک نے سر اٹھایا اور اس تحریک سے وابستہ شاعروں نے مختلف وجوہ اور اسباب کی بناء پر فلمی صنعت کا رخ کیا۔ اس کتاب میں اُن سب کا اور ان کی خوبیوں کا احوال محفوظ ہے۔

چلتے چلتے ہماری بات راجندر کرشن، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی اور آخر میں مجروح سلطان پوری تک پہنچتی ہے۔ مجروح صاحب اس داستان کے ہیرو ہیں، ساحر کریکٹر

ایکٹر ہیں، شکیل اور راجندر کرشن سائیڈ ہیرو ہیں۔ انہیں یہ مقام میں نے نہیں وقت نے دیا ہے۔ میں نے صرف یہ حقیقت ابھاری ہے کہ نغمے کو شاعری کے خوبصورت اور دیدہ زیب لباس سے آراستہ کر کے اِن شاعروں نے شعری روایات کو بڑی پختہ اور مستحکم بنیاد عطا کی ہے۔ اور دو ایک کے سوا یہ سارے شاعر اب ہمارے درمیان نہیں۔ میری یہ تحریر اُن ہی کے نام خراج عقیدت ہے۔

یہ کتاب کوئی بڑا گھمبیر اور عالمانہ مقالہ نہیں ہے جس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملے۔ میں میر تقی میر کی سنت کا قائل ہوں۔ میری ساری گفتگو عوام سے ہے۔ کتاب میں بے شمار قصے، کہانیاں اور واقعات درج ہیں۔ کچھ کا تعلق میرے ذاتی مشاہدے اور تجربے سے ہے، کچھ مختلف مقامات سے لیے گئے ہیں۔ لیکن جس شخص کو میں نے اپنا گواہ بنایا ہے وہ قتیل شفائی مرحوم ہیں۔ کتاب کے آخر میں ان کی گفتگو شامل ہے جہاں ایک نغمہ نگار خود بتا رہا ہے کہ اس فن کو دنیا کس نگاہ سے دیکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ کام اتنا سہل نہیں جتنا باہر سے نظر آتا ہے۔ قتیل کی گفتگو ایک ورکشاپ کی طرح ہے اور ساری کتاب کے مطالعے کے بعد وہ نغمہ نگاری کے بہت سارے دلچسپ بھید کھولتی ہے۔

یہ کتاب کوئی مسلسل کہانی نہیں۔ جہاں آپ اکتاہٹ محسوس کریں۔ اس حصے کو چھوڑ دیجئے اور جہاں دل لگے، اُسے پڑھ کر لطف اٹھایئے۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

یہ کتاب مہینوں کی تحقیق کے بعد مکمل ہوئی ہے۔ کہاں سے کیسی کیسی معلومات بٹوری گئیں، یہ قارئین جان لیں تو اچھا ہو۔ ممکن ہے کسی کو مزید جستجو کی خواہش ہو تو جی چاہتا ہے کہ وہ بنیادی معلومات حاصل کرنے کی ابتدائی تحقیق کی زحمت سے بچ جائے۔

اِس کتاب کی سب سے بڑی بنیاد کانپور کے ہرمندر سنگھ ہمراز کے ترتیب دیئے ہوئے انسائیکلو پیڈیا "ہندی فلم گیت کوش" کو بنایا گیا ہے۔ ہندوستان میں اوّل دن سے جتنی بھی اردو و ہندی فلمیں بنی ہیں، ہرمندر سنگھ نے ان چھ جلدوں میں ان سب کا احوال جمع کر دیا ہے اور جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، فلموں میں گایا جانے والا ایک ایک گیت،

نغمہ، ترانا، حمد، بھجن، غزل اور قوالی کا پہلا بول اس کتاب میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔ اوپر سے یہ کہ جس زمانے کی فلم ہے اس دور کی متعلقہ شخصیتوں سے پوچھ کر ضروری اور دلچسپ معلومات بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت انگیز کارنامہ ہے جو ایک تنہا شخص نے خدا جانے کتنی مشقت اٹھا کر انجام دیا ہے۔ بس سردار جی نے ایک غضب کیا ہے۔ انہوں نے جو ہندی زبان لکھی ہے اُس کے آگے سنسکرت بھی شرما جائے۔ سکھوں کو تو اردو کی اچھی خاصی شُد بُد ہوتی ہے لیکن ہر مندر سنگھ تو جیسے قسم کھا کر بیٹھے تھے کہ کچھ بھی ہو جائے کوئی آسان یا اردو کا لفظ نہیں لکھیں گے۔ مثلاً تیسرے حصّے کا عنوان ہے:

" کھنڈ ہو۔ پری وردھرت ایوں پری ماجرت سنسکرنٹر" حد یہ ہے کہ لفظ "اور" بھی لکھنا گوارا نہیں۔ اس کی جگہ "ایوں" لکھا ہے۔ ان چھ ضخیم جلدوں میں بعض لمبے مضمون بھی ہیں۔ انہیں تو جو سمجھے وہ سمجھے خود ہر مندر سنگھ ہمراز سے خدا ہی سمجھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان چھ بھاری بھر کم جلدوں میں آسانی سے سمجھ میں آنے والا واحد لفظ خود سردار جی کا تخلص "ہمراز" ہے۔ (میں نے ہمراز صاحب کو ای میل لکھا کہ یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ بیشک ہندی لکھتے مگر ذرا آسان لکھ دیتے۔ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ہمراز صاحب گہرا راز بن گئے۔ جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔)

دنیا میں طرح طرح کے لوگ پڑے ہیں۔ کسی نے ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۹۹۵ء تک دنیا میں بننے والی ہر فلم کا احوال جمع کر کے انٹرنیٹ پر ڈال کر کمال کر دکھایا ہے۔ اس ویب سائٹ کا پتہ ہے۔ www.citwf.com/index.htm

اس میں ۱۷۵ ملکوں میں بننے والی تقریباً ساڑھے چار لاکھ فلموں کی تفصیل درج ہے۔ یہ کام کرنے والوں نے بس ایک غضب کیا ہے کہ اس میں نغمہ نگاروں کا ذکر شامل نہیں۔

میری نسل کی زندگی میں پنسلین کی ایجاد سے لے کر آج تک جو بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں کمپیوٹر کی ایجاد سرفہرست ہے۔ انٹرنیٹ نے دنیا کی سب سے بڑی لائبریری میرے گھر کی میز پر کھول دی ہے۔ اور حال یہ ہے کہ مجھے کسی پرانی کتاب کی گرد پھانکنے کی ضرورت نہیں۔ انگلی کی ایک جنبش سے علم اور آگہی کا سمندر آنکھوں

کے سامنے ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ جو لوگ اس سعادت سے محروم ہیں وہ جیتے جی پیاسے ہی رہیں گے۔ بس انٹرنیٹ میں ایک قباحت ہے (جو کتابوں میں بھی ہوتی ہے) اس میں یہ طے نہیں کہ کیا مستند ہے اور کیا نہیں۔ کسے صحیح مان لیں اور کس کو نہیں۔ بس اتنا ضرور ہے کہ علم کے ایک گوشے کو سو جگہ آزما دیکھئے کسی حد تک تصدیق ہو جائے گی۔

آیئے دیکھیں میں نے کہاں کہاں سے استفادہ کیا ہے۔

سب سے پہلے ہے انٹرنیٹ کا انسائیکلوپیڈیا en.wikipedia.org

اس میں دنیا کا قریب قریب ہر موضوع اور ہر قابل ذکر شخصیت موجود ہے مگر اس میں بھی ایک نقصان ہے۔ یہ ذرا بھی مستند نہیں۔ مداحوں اور چاہنے والوں نے اپنی پسندیدہ شخصیتوں کی شان میں خدا جانے کیا کیا لکھ دیا ہے۔ اوپر سے غضب یہ کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی بات غلط لکھی ہے تو آپ اسے درست کر سکتے ہیں (یا اور زیادہ غلط بھی کر سکتے ہیں)

دوسرے مقامات جن سے میں نے استفادہ کیا یہ ہیں۔

www.suhanegeet.com/legends/lyricists/

tilakrishi.sulekha.com/blog/post/2005/10/the-pioneers-in-indian-cinema.htm

members.tripod.com/oldies_club

www.imdb.com/name/nm0538281/filmoyear

www.mazhar.dk/film

www.pakmdb.com/db

http://lyricsindia.net

www.earthmusic.net

ITRANS Song Book=www.smriti.com/hindi-songs

اس کے علاوہ Google اور Yahoo کے اس خانے میں جو Search کہلاتا ہے ایک نام یا ایک لفظ ٹائپ کر کے سرچ کے بٹن پر کلک کر دینا کافی ہے۔ علم کا ایک دریا امڈ پڑتا ہے۔ اس پر خوب مشق کیجئے، خوب آزمایئے مگر کسی بھی بات کو ہر طرح تصدیق کے بغیر سچ نہ

ماہئیے۔

اس کتاب میں مجروح سلطان پوری کے بارے میں بہت دلچسپ معلومات ذکا صدیقی کے ۱۹۹۱ء کے مضمون سے لی گئی ہیں جو السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں چھپا تھا۔ میں اُن کا شکر گزار ہوں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے وہ یوں ہیں:

The Gramophone Company's First Indian Recordings-1899-1908

by Michael S Kinnear-Bombay Popular Prakahan 1994

Pakistan Cinema 1947-1997 by Mushtaq Gazdar

Oxford University Press Karachi 1997

-چند قدیم ڈرامے۔مصنف: پروفیسر سیّد وقار عظیم۔ترتیب: ڈاکٹر سیّد معین الرحمان۔لاہور ۱۹۶۲ء

-پنجاب کی فلمی تاریخ۔مصنف: پرویز راہی۔راہی پبلشرز، لاہور

-ہندوستانی سینما کے پچاس سال۔مصنف: پریم پال اشک۔بُک ہوم، لاہور۔۲۰۰۴ء

-گائے جا گیت ملن کے۔شکیل بدایونی کے گیتوں کا مجموعہ۔تعارف: دلیپ کمار۔الحمد پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۹۷ء

-گاتا جائے بنجارا۔ساحر لدھیانوی کے نغموں کا مجموعہ۔تعارف: اظہر غوری۔الحمد پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۹۶ء

-کبھی کبھی۔ساحر کے گیتوں، غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔الحمد پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۹۱ء

میں ان تمام مصنفوں، ناشروں، مرتبین اور ویب سائٹ قائم کرنے والوں کا صدق دل سے شکر گزار ہوں۔ان کے علاوہ بھی میرا ہاتھ بٹانے والے بے شمار ہیں۔خدا انہیں جیتا رکھے۔

رضا علی عابدی
razaali33@hotmail.com
۳۰/اپریل ۲۰۰۹ء، لندن

گُلفام کو مل گئی سبز پری

ایک آسمانی صحیفے میں لکھا ہے کہ جب کائنات نہ تھی تو لفظ تھا۔
دوسرے صحیفے میں لکھا ہے کہ لفظ ادا کیا گیا تو کائنات بنی۔
صحیفہء دل پہ لکھا ہے کہ وہ لفظ سپاٹ نہ ہوگا۔ اُس میں سُر ہوگا۔ لے ہوگی۔ ترنم ہوگا۔ بعد میں وہی لحن ایک سچّے نبی کو عطا ہوا کہ جب اُس کی لے بلند ہوتی تھی تو چرند و پرند، وادیاں اور پہاڑ، یہاں تک کہ سنگریزے بھی اس کے ساتھ گنگناتے تھے۔

انسان جب بھی سرشار ہوا، مسرور ہوا، ماتم کناں ہوا یا ملول ہوا، سُر اس کے ساتھ ساتھ رہا اور لے ہی اس کے جذبے کے اظہار کا وسیلہ بنی۔

جذبے اور احساس کا عجب معاملہ ہے کہ اپنے اظہار کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیسے کیسے مقام آتے ہیں جب انسان چاہتا ہے کہ وہ کہے اور دوسرا سنے۔ بات اُس کے سینے سے نکلے اور دوسرے کے قلب میں اتر جائے۔ اُس کے ذہن کی کیفیت کا دوسرا بھی حصّہ دار بنے اور بعض اوقات دل کی بات کہتے ہوئے وہی دل یہ بھی چاہتا ہے کہ بات چند افراد تک محدود نہ رہے اور دور دور تک پہنچے۔

تبھی تو ہمارے خدائے سخن میر تقی میرؔ نے کہا تھا

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میرؔ تقریباً نوّے سال جیئے۔ ان نوّے برسوں کے دوران ریڈیو، ٹیلی ویژن اور گراموفون ریکارڈ ہونا تو کجا، اردو کا چھاپہ خانہ تک نہ تھا۔ مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر کا کہیں وجود بھی نہ تھا۔ بڑے مشاعروں کا تصور بھی نہیں تھا۔ احباب کی محفلوں میں شعر پڑھے جاتے تھے جو اپنی گفتگو اور خط و کتابت میں موقع کی مناسبت سے یہ شعر دہرایا کرتے ہوں گے۔

میرؔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر شعر پڑھنے سے رہے۔ تو پھر عوام سے ان کی گفتگو کیوں کر ہوتی ہوگی۔ ناٹک، رہس، جلسے یا مرقع کا کسی کو خیال تک نہیں آیا تھا۔ بس اگر کچھ تھا جو گفتگو کا وسیلہ بنتا وہ گانے والی ڈومنیاں اور مجرے والی طوائفیں تھیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے شاعر جنہیں ہم اساتذہ میں شمار کرتے ہیں، اپنا کلام لکھ کر گانے والیوں کو دیا کرتے تھے اور پھر کلام کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کے عمل میں ذرا سی لذّت اس وقت شامل ہو جاتی ہوگی جب ڈومنی چل کر شاعر کے گھر پر آتی ہوگی اور حنا سے سجے اور چوڑیوں سے بھرے ہاتھ بڑھا کر کلام مانگا کرتی ہوگی۔ یہ ادا کبھی شاعر کو مار رکھتی ہوگی اور کبھی خود ڈومنی کو۔

کچھ بھی ہوا، اس طرح شاعر کا کلام محفل، مجرے اور کوٹھے کے راستے عام لوگوں تک پہنچا مگر کتنے لوگ ہوں گے جو ان محفلوں، مجروں اور کوٹھوں تک پہنچنے کے متحمل ہوتے ہوں گے۔ عوام میں کتنے ہوں گے جنہیں رقص و سرود تک رسائی ہوگی۔ میر تقی میرؔ کی گفتگو عوام تک کیسے پہنچ پاتی ہوگی۔ غرض یہ کہ شاعر اور عوام کے درمیان دیوار نہ صرف بلند تھی بلکہ دبیز بھی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ یہ پردہ اٹھا، اور وہ تھا تھیٹر کا پردہ، رہس، جلسے اور مرقع کا پردہ۔ ڈراما اب تک گجراتی، بنگالی اور مراٹھی جیسی علاقائی زبانوں تک محدود تھا اور اس وجہ سے مغربی، جنوبی اور مشرقی ہند کے علاقوں کے اندر قید تھا۔ آخر اس زبان نے اسے رہائی دلائی جسے آج ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔

رہس اور ناٹک نے اردو کا جامہ پہنا اور برصغیر کی آزاد فضاؤں میں دور دور تک

اڑان بھرنے لگا۔ڈرامے نے اہل ہندوستان کو دل بہلانے کا اور تفریح کا ایسا ذریعہ عطا کیا جوارزاں بھی تھا اور جسے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق اسٹیج کے قریب یا فاصلے پر بیٹھ کر دیکھا کرتا تھا۔

ناٹک بمبئی، کلکتے اور احمد آباد سے نکل کر دور دور تک پہنچا اور پھر تو کیا آگرہ کیا علی گڑھ، کیا دلّی اور کیا لکھنؤ، شہر شہر اور قصبے قصبے ناٹک کھیلا جانے لگا۔کہاں ڈھاکہ اور کہاں پشاور ہر جگہ اسٹیج سجائے جانے لگے اور لوگوں کی شامیں کھیل دیکھنے میں کٹنے لگیں۔

اس کاروبار میں پیسہ اتنی کثرت سے آنے لگا کہ بمبئی کے پارسی سیٹھوں نے اپنے کاروبار بند کیے اور تھیٹر کھول دیئے۔بمبئی میں پارسی تھیٹر نے دھوم مچائی، ادھر کلکتہ انگریزوں کے ہندوستان کا صدر مقام تھا جہاں الفریڈ تھیٹر کا پرچم بلند ہوا۔کہیں منروا تھیٹر کھلا، کہیں کوہ نور اور اسٹار تھیٹر، کہیں کلاسیک تھیٹر نے نئے پرانے ڈرامے پیش کئے اور کہیں کورن تھئین Coronthien تھیٹر نے آغا حسن امانت کی اندرسبھا سے لے کر نرائن پرساد بیتاب بنارسی کی شکنتلا تک درجنوں کھیل پیش کیے۔

ڈرامے کا کاروبار چمکا تو کتنے ہی لوگوں نے اس پر قلم آزمانے کا سلسلہ شروع کیا۔کچھ اچھے لوگ تھے کچھ کم اچھے، کچھ نے گجراتی ڈراموں کو اردو میں ڈھالا اور چند نے پرانے ڈراموں کو سنوارا۔مگر یہ سارے کے سارے اہل قلم مصلحتوں کے مارے تھے۔انہیں اپنی اپنی صلاحیتوں کو بھلا کر پیسہ سمیٹنے والے پارسی سیٹھوں اور سستے ٹکٹ خریدنے والے مجمع کے ذوق وشوق کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

ان ڈراموں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ان کے مکالموں میں نثر کم اور نظم زیادہ ہوتی تھی۔سارے اداکار اسٹیج پر آ کر اپنی بات لہک لہک کر اور گا گا کر کہا کرتے تھے چنانچہ ڈرامے لکھنے والے کا شاعر ہونا ضروری تھا۔مگر وہ سیٹھوں کے حکم کا تابع تھا اور معیار سے گرے ہوئے شعر کہنے پر مجبور تھا کیونکہ عوام میں وہی شعر اور وہی ڈرامے مقبول ہوا کرتے تھے۔مجمع ہر شام وہی تک بندی سننے کی خاطر آتا تھا۔ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر ایسے ہی مکالموں کے نام پر ہجوم ٹوٹا کرتا تھا۔

مختصر یہ کہ کمائی ایسے ہی معمولی مکالموں اور غیر معیاری گانوں کے سبب سے تھی۔ یہ ڈرامے دیکھنے والوں میں ذرا تصور کیجئے ہمارے اہلِ لکھنؤ بھی تھے جنہیں مارے نفاست کے ناک پر مکھی بیٹھنا بھی گوارا نہ تھا۔ ان اہلِ لکھنؤ میں ایک نام مرزا محمد ہادی رسوا کا بھی آتا ہے جو اچھے بھلے باذوق احباب کے کہنے پر تھیٹر گئے۔ اور پھر اپنی رائے قلم بند کی۔ لکھتے ہیں:

"بعض احباب، سیّد شہنشاہ حسین صاحب بی اے، سیّد بہادر علی خاں صاحب عرف ابو صاحب، مولوی عبدالحلیم شرؔر کے اصرار سے متواتر تھیٹروں کے جلسے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ یہ مذاق پہلے ہی پسند تھا، اب دوستوں کے اصرار سے زیادہ لطف آیا۔ تماشا کرنے والوں کی پیاری پیاری صورتیں، ان کے ناز و انداز، رونا دھونا، جان کھونا، سب کچھ دل کو بھایا۔ ذوق شعر و سخن بچپن سے طبیعت میں ہے۔ نشو و نما ایسے شہر میں پائی شاعری جس کی طینت میں تھی۔ حیران تھا کہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں کی زبانی سنتا ہوں۔ سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دہلی لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، بمبئی کے مچھلی بازار کی بول چال ہے، یہ دساور وہیں کی ہے۔"

یہ سب دیکھ کر مرزا محمد ہادی رسؔوا نے مرقع لیلیٰ مجنوں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ عامیانہ زبان تو لکھنے سے رہے۔ انہوں نے نہایت عمدہ نثر اور نظم ملا کر کلاسیکی طرز کا ڈراما لکھنے کی ٹھانی۔ یہ بات ۱۸۸۵ء کے آس پاس کی ہے۔ بہت اعلیٰ زبان اور بیان کو کام میں لا کر سراسر منظوم قصہ لیلیٰ مجنوں لکھا گیا اور کہتے ہیں کہ تھیٹریکل کمپنیوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

وہی ہوا جو ہونا تھا۔ تھیٹر والوں نے اُس دور کی زبان میں 'منڈیا ہلا دی'۔ ہندوستان کے ناظرین اتنے اعلیٰ کھیل کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ مرقع لیلیٰ مجنوں نامنظور ہو گیا۔

ڈراموں میں گانوں کی بھرمار کا اندازہ ۱۸۹۰ء کے قریب لکھے جانے والے کریم الدین مراد بریلوی کے مشہور ڈرامے 'بادشاہ خداداد' کے پہلے باب پر ایک نگاہ ڈالنے سے

ہوتا ہے۔اس باب میں بارہ منظر ہیں۔ پہلے منظر میں ایک کردار جس کا نام خداداد ہے اسٹیج پر آتا ہے اور دو غزلیں گا کر چلا جاتا ہے۔دوسرے منظر میں چند سپاہی ایک مسخرے کے ساتھ آتے ہیں اور گاتے ہوئے اسٹیج سے نکل جاتے ہیں۔تیسرے منظر میں کچھ ماہی گیر گاتے ہوئے اسٹیج پر آتے ہیں اور گانا ختم کر کے وہ جال لئے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور پھر مل کر گانا گاتے ہیں۔اتنے میں طوفان میں گھرا ہوا ایک جہاز نظر آتا ہے اور ماہی گیر گھبرا کر ایک گانا گاتے ہیں۔ جہاز ڈوب جاتا ہے تو وہ دوسرا گانا گاتے ہیں۔ایک ماہی گیر لڑکا دریا میں جال پھینکتا ہے اور ساتھ ہی گانا گاتا ہے۔اس پر سردار ماہی گیر خفا ہو کر ایک گانا گاتا ہے۔اس سے ڈر کر لڑکا ایک گانا اور گاتا ہے اور بھاگنے کا ارادہ کرتا ہے۔اتنے میں خداداد دریا سے نکل کر آتا ہے اور ایک غزل گاتا ہے۔پھر وہ تحت اللفظ میں ایک خمسہ پڑھتا ہے اور غش کھا کر گر جاتا ہے۔اگلے ہی لمحے ماہی گیروں کا سردار اسٹیج پر آتا ہے اور ایک غزل گاتا ہے۔خداداد ہوش میں آتا ہے اور مسدّس کے دو بند گانے کے بعد اسٹیج سے چلا جاتا ہے۔ادھر ماہی گیر جال کھینچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس دوران کورس کے انداز میں گاتے ہیں۔پانچویں منظر میں کئی گانے ہیں۔ایک خداداد کا، ایک مہار کا، ایک سب ماہی گیروں کا، پھر دو گانے خداداد کے ہیں۔اس کے بعد مصرعوں میں باتیں ہوتی ہیں۔ پھر خداداد ایک مسدّس اور ایک غزل گاتا ہے۔ چھٹے منظر میں فیروز شاہ ایک لمبی غزل گاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ساتویں منظر میں کامدین، کریمن اور ایک مسخرا اسٹیج پر آتے ہیں اور گانا گاتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔اس طرح صرف سات منظروں میں پچیس گانے گائے جاتے ہیں۔

اگر ان گانوں سے حاضرین کی سخن فہمی کی تربیت ہوتی ہوگی تو ان کی حالت قابل رحم ہوگی کیونکہ ان نغموں میں اعلیٰ قسم کی شاعری کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔اکثر تک بندی تھی۔ بعض گانے تو خود پارسی سیٹھوں نے لکھ دیئے تھے۔یہ ضرور ہے کہ ایک خلقت تھیٹر میں آتی تھی کیونکہ اس وقت دل بہلانے کا زریعہ نٹ اور مداری کا تماشا تھا یا پھر یہ ناٹک اور انکی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یہ کتابوں کی شکل میں شائع ہوتے تھے اور ان کے بیس بیس ایڈیشن چھپ کر بک جاتے تھے۔ جبکہ دیوانِ غالب کے اُس وقت صرف پانچ ایڈیشن شائع

ہوئے تھے۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ جو ایک ڈراما ان سارے تھیٹروں کی بنیاد بنا وہ نہ تو کسی طرح لچر تھا اور نہ غیر معیاری۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں مشہور ناٹک 'اندر سبھا' کھیلا جا چکا تھا۔ یہ بات ۱۸۵۲ء کے آس پاس کی ہے۔ پریوں کے اکھاڑے میں راجا اندر کا براجمان ہونا اس کھیل کا مرکزی منظر تھا۔ رنگ رنگ کی پریاں آتی تھیں، ناچتی گاتی تھیں اور راجا جی کا جی بہلاتی تھیں۔ لیکن سب پریوں سے بڑھ کر سبز پری تھی جو ایک روز دورانِ پرواز انسان زادے یعنی شہزادہ گلفام کو سوتے دیکھ کر اسے دل دے بیٹھی اور کالے دیو کو بھیج کر شہزادے کو اٹھوا لیا۔ شہزادے کی آنکھ کھلی تو وہ برہم ہوا اور سبز پری پر گرجا برسا۔ بالآخر اس شرط پر نرم پڑا کہ وہ لے جا کر اسے راجا اندر کا اکھاڑا دکھائے گی (یہ اس زمانے کی پریوں کا اکھاڑا تھا۔ ہمارے زمانے کے پہلوانوں کا نہیں۔) سبز پری نے شہزادے کو لے جا کر درختوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ پریوں کا ناچنا گانا دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک دیو کی نگاہ پڑی اور اس نے وہاں چھپے ہوئے آدم زاد کو دیکھ کر لکھنؤ کے مصاحبوں کے انداز میں راجا اندر کے کان میں پھونک دیا۔ بس پھر تو غضب ہو گیا اور شہزادہ گلفام کو پکڑ کر اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا اور سبز پری کے پر نوچ کر شہر میں خوار ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

پری کو فاقوں مرنا منظور نہیں تھا۔ اس نے جوگن کا روپ دھار لیا اور شہر میں ناچنے گانے لگی یہاں تک کہ جوگن کی دھوم راجا جی تک پہنچی۔ ان کے اشتیاق کا یہ عالم ہوا کہ جوگن کو پریوں کے اکھاڑے میں بلوا کر اس کا گانا سنا اور ناچ دیکھا اور خوش ہو کر وہی تاریخی فیاضی کا مظاہرہ کیا: مانگ کیا مانگتی ہے۔ جوگن نے بھی ناز و ادا سے ایسا کام لیا کہ راجا تین بار قول ہارا۔ اب تو غضب ہو گیا۔ سبز پری نے شہزادہ گلفام کی رہائی مانگ لی۔ راجا نے بڑے ہاتھ پاؤں پٹخے مگر سب بے سود۔ شہزادے کو رہائی ملی اور اکثر ڈراموں کے آخری منظر کی طرح اس ڈرامے میں بھی خدا نے دو چاہنے والوں کے دن پھیرے مگر سب کے دن نہیں پھرے۔ راجا اندر کا پارٹ ادا کرنے والے جان عالم پیا پر آفت ٹوٹی۔ ان کے اودھ پر فرنگیوں کا قبضہ ہوا جنہوں نے بادشاہ کو پورے اکھاڑے کی پریوں سمیت لکھنؤ کے محلوں

سے نکال کر کلکتے کے مٹی کے قلعے میں ڈھکیل دیا۔

اس طرح ہمارا ڈراما کئی سرزمینوں کے پار کلکتے تک اور بڑھ کر ڈھاکے تک جا پہنچا جہاں کہتے ہیں کہ اس زمانے میں 'ڈھکیا' اردو کا چلن عام تھا۔

اندر سبھا میں رقص کا انداز کتھک کا تھا اور غزل گائیکی اپنے دور کی طرح خیال کے رنگ میں تھی۔ امانت کی یہ اندر سبھا آج کھیلی جائے تو شاید لوگ ہنسیں مگر اپنے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ نہایت سلیقے اور قرینے کی چیز تھی، خصوصاً اس میں گائی جانے والی چیزیں غیر معیاری نہیں تھیں۔

البتہ اس کے بعد ہندوستان میں جو ناٹک پھلا پھولا اس میں ایسا شاہانہ انداز آنا ممکن نہ تھا۔ تھیٹر کاروباری اور کھانے کمانے کا دھندا ہو گیا البتہ تفریح کا واحد اور سستا ذریعہ تھا۔ اس لئے شہر شہر اور نگر نگر پہنچا اور پسند کیا گیا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ یکا یک منظر بدل گیا۔

بیسویں صدی سائنسی ایجادات کا نقارہ بجاتی ہوئی آ پہنچی۔

دیوار پر سنہ ۱۹۰۰ء کا کیلنڈر آویزاں ہو گیا۔

کوئلیا مت کر پکار

بازار میں سنہ ۱۹۰۰ء کی جنتری آ گئی۔

اس میں آنے والے برسوں کا احوال درج نہیں تھا۔ احوال لکھنے والے کو احساس تک نہ تھا کہ گراموفون ریکارڈ آنے میں صرف دو سال باقی تھے۔ خاموش فلم تیرہ سال بعد بننے والی تھی۔ بولنے والی فلم نمودار ہونے میں صرف ۳۱ برس بچے تھے۔ اور ریڈیو کے قیام کو صرف ۲۷ برسوں کی مہلت درکار تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تھیٹر اور ڈرامے کی دنیا میں ایک حشر بپا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بنارس کے دریائی ساحل سے سر اٹھانے والی لہر آغا حشر کاشمیری کے نام سے اسٹیج کے سمندر میں ہلچل مچانے پر آمادہ تھی۔

تو ہوا یہ کہ لندن سے بن کر پچاس کے قریب گراموفون ریکارڈ درآمد ہوئے۔ لندن ہی میں مقیم کوئی احمد صاحب تھے جنہوں نے ایک ریکارڈ میں گراموفون کے بارے میں اردو میں تقریر فرمائی اور کوئی حضرت تھے جن کا نام بھی حضرت تھا۔ انہوں نے شادی کے گانے کے انداز میں شاہانہ ریکارڈ کرایا اور اپنی ہی آواز میں تین ریکارڈوں میں غالبؔ کے اشعار بھرے۔ اب نہ وہ احمد باقی ہیں، نہ وہ حضرت اور نہ وہ ریکارڈ۔ صرف رجسٹروں کا اندراج رہ گیا ہے۔

۱۹۰۲ء میں کلکتے میں گراموفون ریکارڈ بننے شروع ہوئے اور سب سے پہلے کلکتے میں گانے والیوں نے اپنے وقت کے مشہور ڈرامے 'خونِ ناحق' کے گانے ریکارڈ کرائے۔

یہ ڈراما مہدی حسن احسنؔ نے شیکسپیئر کی تقلید میں لکھا تھا اور کامیاب بھی ہوا تھا۔ احسنؔ کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا اور برج بھاشا اور اودھی بولیوں پر عبور حاصل تھا لہٰذا اپنے وقت کے چلن کے مطابق ٹھمری دادرا کے نہ صرف بول لکھے ہوں گے بلکہ ان کی طرزیں بھی بنائی ہوں گی۔ اس طرح گانا بجانا اسٹیج سے نکل کر گراموفون ریکارڈ کی شکل میں لوگوں کے گھروں میں پہنچا۔

اس کے بعد جن قابل ذکر ڈراموں کے گانے ریکارڈ کی شکل میں آئے ان کو یوں سمجھ لیجئے: مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی کا فسانہءعجائب۔ حافظ عبداللہ کا ۱۸۸۵ء کا لیلیٰ مجنوں۔ امانت کی اندر سبھا۔ احسن لکھنوی کا دل فروش اور بھول بھلیّاں۔ کریم الدین مراد بریلوی کا ۱۸۹۰ء کا خداداد۔ منظر بریلوی یا احسن لکھنوی کا چندراولی۔ طالب بنارسی کا گوپی چند اور ونا یک پرساد طالب بنارسی کا الہ دین۔

ادھر یہ سلسلہ جاری تھا اُدھر تھیٹر کے میدان میں آغا حشر نمودار ہوئے اور ان کے دو ڈراموں 'میٹھی چھری' اور 'اسیرِ حرص' کے ریکارڈ بنے۔

ریکارڈوں میں بھرے جانے والے اکثر گانے عامیانہ، بے تکے اور وہی ٹھمری دادرے کے انداز میں تھے۔ البتہ تصور کی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ تھیٹر میں بیٹھے ہوئے حاضرین اس قسم کے گانوں پر کیسے لہالوٹ ہوتے ہوں گے۔ اُن کے بول ملاحظہ کیجئے:

دلدار یار چھیلے سے نین لگائیں گے

لاحول پڑھ تو اپنی شکل پر

دور دور ہو مغرور

مَر دا اور مرغے کا کیا اعتبار

تو ہی میری جانی، تو ہی میری نانی

تھیٹر کے گانوں کا دور ختم ہوا تو ٹھمری اور دادرے نے زور پکڑا۔ اپنے ریکارڈ بھروانے کے لیے پورے برصغیر سے گانے والے کم اور گانے والیاں بے شمار کلکتے کی طرف چل پڑیں۔ کئی ہزار ریکارڈوں کی فہرست دیکھنے سے اُس دور کے موسیقی نوازوں کے ذوق و

شوق پر حیرت ہوتی ہے کہ ہر روز سینکڑوں گراموفون ریکارڈ فروخت ہو کر گھروں میں سُنے جاتے تھے اور لوگ بیٹھ کر وہی دوہے، ہوری، کجری، بھیروی، جوگ، منڈ، ملہار، پیلو دادرا اور کھماج سنا کرتے تھے۔ بیچ میں کہیں کہیں اِکا دُکا غزل اور قوالی نظر آتی ہے۔ اس پر ایک نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء تک کون کون کہاں سے چل کر اور کلکتے کو آباد کر کے وہاں کیسے کیسے راگ الاپ رہا ہوگا۔ کچھ ہلکی پھلکی چیزوں کی اس فہرست کو نمونہ ہی جانئے:

پیارا صاحب (کلکتہ) چکھا دے چاشنی شربت دیدار تھوڑی سی۔

عبدالستار (کلکتہ) تم تو خفا ہو مجھ کو گلے سے لگائے کون۔

کالی جان (دہلی) وہ ستم کریں میں ستم سہوں۔

زہین جان (دہلی) ہولی کھیلوں میں کہہ کر بسم اللہ (رجسٹر میں اندراج اسی طرح ہے)

بنّی جان (دہلی) علاج دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا۔

اصغری جان (آگرہ) یہ نہ تھی ہماری قسمت۔

محمودہ جان (میرٹھ) فنا کا جام اے ساقی تو بھر دے۔

استاد فضل حسین خاں (لاہور) چمن میں کوچہء جاناں سے صدا آتی ہے۔

گوہر جان (کلکتہ) میرے دردِ جگر کی خبر نہیں۔

استاد عبدالغفور (کلکتہ) یہ زمانہ عالم خواب ہے۔

ہیتکن بائی (کلکتہ) اس عشق نے یارو۔

اللہ باندی (جے پور) جفائیں کرتے جاتے ہیں پشیماں ہوتے جاتے ہیں۔

امام باندی (مشہور طوائف۔ دہلی) ناز و انداز جب آئے تو جفا بھی آئی۔

اللہ دی (دہلی) تم نے بدلے ہم سے گن گن کے لیے۔

زہین جان (جھجر) لیلیٰ کو یار تو نے مجنوں بنا کے مارا۔

ممتاز جان (دہلی) یہ تو میں کیونکر کہوں تیری خریدار ہوں میں۔

پنڈت گھنشام (امرتسر) تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔

کیٹی جان (میرٹھ) تیری ذات پاک ہے اے خدا۔ (یہی حمد تقریباً چالیس سال بعد فلم نیک پروین میں حمیدہ بانو نے گائی)

جانکی بائی، چھپن چھری (الہ آباد) میرے حال زار کی اے بتو، تمہیں کیا، کسی کو خبر نہیں۔

ملکہ جان (آگرہ) ہم نے دیکھیں نہ سنیں ایسی ستم گر آنکھیں۔

اصغری جان (آگرہ) غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا۔ (داغ دہلوی کی یہ غزل تقریباً چالیس سال بعد محمد رفیع نے گائی)

اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے، کہاں گیا میرا بچپن خراب کر کے مجھے۔ (یہ شعر تقریباً ۴۵ سال بعد نوشاد کی فلم دیدار میں استعمال ہوا)

گوہر جان (کلکتہ) یہ نہ تھی ہماری قسمت (۱۹۰۶ء)

عزیزی جان (دہلی) مرادِ دل تو بر آئے تمہارا حوصلہ نکلا۔

محمودہ جان (میرٹھ) حور و غلماں چاہئے نہ باغِ رضواں چاہئے۔

مس شمیم (لکھنؤ) جانچ لو ہاتھ میں پہلے دلِ شیدا لے کر۔

ننھی جان (آگرہ) نمایاں دونوں جانب داغ ہجراں ہوتے جاتے ہیں۔

وحیدن جان (آگرہ) کر دیا خاک جلا کر مجھے فرقت نے تری۔

نصیب جان (جہلم) ستم سے باز آ ظالم قیامت ہونے والی ہے۔

عمدہ جان (حیدر آباد) ذبح بھی کرتا ہے اور کہتا ہے فریاد نہ کر۔

نواب جان (علی گڑھ) اٹھا کر جب وہ کہتے ہیں نقاب آہستہ آہستہ۔

محسوس ہوتا ہے کلکتے نے پورے ہندوستان کی جان نکال لی۔ سوچئے شہر میں کیسی طوائف الملو کی رہی ہوگی۔

تو اس طرح کے نغموں کا چلن تھا۔ ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ان ریکارڈوں کا بیشتر ذخیرہ ضائع ہو چکا تھا۔ جو قدیم ریکارڈ پرانے گوداموں میں ملے ہیں ان کی آوازیں ممکن حد تک درست اور صاف کر کے ان کے آڈیو کیسٹ اور سی ڈی جاری کئے گئے ہیں جو دستیاب

ہیں مگر ان کو سننا اور ان سے لطف اندوز ہونا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ مثال کے طور پر اپنے وقت کی قتالۂ عالم گوہر جان کے ریکارڈ سنئے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر چیخ چیخ کر کیوں گا رہی ہیں۔ پتہ چلا کہ اُس وقت تک مائیکروفون ایجاد نہیں ہوا تھا بلکہ ایک بڑی سی قیف جیسے بھونپو میں منہ ڈال کر بلند آواز سے گانا پڑتا تھا۔ اسی طرح طبلچی کو زور لگا کر طبلہ بجانا ہوتا تھا تب کہیں ریکارڈ میں چوڑیاں ڈالنے والی سوئی کی حرکت ہوتی تھی اور اُس میں آواز محفوظ ہوتی تھی۔

یہاں بات چونکہ گانے کی ہو رہی ہے، گانے والوں کی نہیں اس لئے گوہر جان کون تھیں اور چھپّن چھری کون، اس قسم کے احوال کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے۔

ایک بار پھر کہہ دوں کہ یہاں غزلوں کی جو مثالیں جمع کی گئی ہیں، جنہیں ہم لائٹ کلاسیکل اور ہلکی پھلکی گائیکی کہہ سکتے ہیں۔ بس آٹے میں نمک کے برابر تھیں ورنہ لے ٹھمری اور دے ٹھمری، لے دادرا اور دے دادرا۔

اس سے اُس وقت کے سننے والوں کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہاں تو وقت بدلا اور ہمارے افق پر آغا حشر کاشمیری نمودار ہوئے۔ تھیٹر میں رچے بسے تھے۔ دنیا بھر کے ڈرامے پڑھ ڈالے تھے۔ بنارس میں ان کے گھر میں ان کی پڑھی ہوئی کتابیں اب تک آراستہ ہیں۔ غضب کی نثر لکھتے تھے اور منشیوں کو املا بول کر خالص تھیٹری انداز میں لکھواتے تھے۔ بلا کا زور خطابت تھا۔ اوپر سے غزل کے شاعر تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ راگ راگنیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

ان کے ڈرامے 'آنکھ کا نشہ' کا نغمہ 'کوئلیا مت کر پکار، کریجوا لاگے کٹار' گاتے گاتے اختری بائی فیض آبادی کہاں سے کہاں جا پہنچیں اور فریدہ خانم کی زبانی ان کی ایسی ایسی غزلیں ایک بار پھر جی اٹھیں

؎ سوئے میکدہ نہ جاتے تو کچھ اور بات ہوتی   وہ نگاہ سے پلاتے تو کچھ اور بات ہوتی

؎ تم اور فریب کھاؤ بیان رقیب سے   تم سے تو کم گلہ ہے زیادہ نصیب سے

آغا حشر نے اردو ہندی ڈرامے کا حلیہ ہی بدل ڈالا۔ اعلیٰ مکالمے بولے جانے

لگے۔ عمدہ غزلوں کا چلن شروع ہوا اور ناظرین کے ذوق کی تربیت کے ڈھنگ بدل گئے۔ تھیٹر کے شوق میں گھر سے بھاگنے والے اس لڑکے نے ڈرامے کی انگلی تھامی اور اسے بھی برق رفتاری عطا کر دی۔ پہلے پہل ان کے دو ڈراموں 'میٹھی چھری' اور 'اسیرِ حرص' کے گانوں کے ریکارڈ بنے۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۳۱ء تک وہ ۳۲ ڈرامے لکھ چکے تھے اور اتنی دھوم مچا چکے تھے کہ انہیں شیکسپیئر ہند کا خطاب دے دیا گیا۔

اس دوران ایک اور انقلاب آیا۔ ۳ر مئی ۱۹۱۳ء کو بمبئی کے کورونیشن سینما میں ہندوستان میں بننے والی پہلی خاموش فلم 'راجا ہریش چندرا' نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کے فلم ساز دادا صاحب پھالکے تھے۔ اگرچہ فلمیں خاموش تھیں مگر ان کے ساتھ زندہ ساز اور گانے بھی ہوتے تھے۔ دادا صاحب نے چار سال بعد فلم 'لنکا دہن' بنائی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ملک کی پہلی باکس آفس ہٹ تھی اور یہ کہ اس فلم کی روز کی آمدنی تھیلوں میں بھر کر بیل گاڑیوں کے ذریعے پولیس کے پہرے میں لائی جاتی تھی۔

تھیٹر پر زوال آنے لگا۔ فوراً آغا حشر نے پیشن گوئی کی کہ اب تھیٹر کا چل چلاؤ ہے اور فلم کا دور شروع ہو رہا ہے۔ شروع میں سال میں پچیس تیس فلمیں بنتی تھیں۔ ۱۹۳۱ء میں دو سو سات فلمیں بنیں اور یہ ان فلموں کی بات ہے جن میں آواز نہ تھی۔ اس وقت کے فلم سازوں میں فاطمہ بیگم بھی تھیں جنہوں نے فلم بلبلِ پرستان (۱۹۲۶ء) بنائی اور اس وقت کی اداکاراؤں میں پیشنس کوپر Patience Cooper بھی تھیں جو اینگلو انڈین تھیں، جن کا ناک نقشہ ہالیووڈ کی اداکاراؤں سے ملتا تھا، جو روانی سے اردو بولتی تھیں، کلکتے کے مدن تھیٹر میں اداکاری کرتی تھیں، جنہوں نے چالیس سے زیادہ فلموں میں مختلف کردار ادا کیے، اپنے وقت کے سرکردہ اداکار اور دریائے کابل کے کنارے پیر پائی کے گُل حمید سے شادی کی، صابرہ بیگم کہلائیں اور عمر کے آخری برس اُس وقت کے مشرقی پاکستان میں گزارے۔

جب تک خاموش فلمیں بنتی رہیں اینگلو انڈین اداکاروں، کہانی کاروں، ہدایت کاروں اور پرڈیوسروں نے ان میں خوب خوب حصہ لیا کیونکہ انہیں زبان اور لب و لہجے سے کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ فلموں میں آواز آتے ہی ان میں سے زیادہ تر ادھر اُدھر

بکھر گئے۔

خاموش فلموں کے ساتھ زندہ سازینہ ہوتا تھا جو کہانی کے ماحول میں جان ڈالنے کے خیال سے سینما ہال میں طرح طرح کی دھنیں بجایا کرتا تھا۔ کلکتہ تو چونکہ انگریزوں کا شہر تھا۔ وہاں بہت سے بینڈ وجود میں آ گئے تھے۔ اُن ہی میں سے ایک بینڈ کی طرزیں بنانے اور انہیں فلم کے ساتھ ساتھ بجانے کا کام ایک نوجوان پنکج کمار ملک نے سنبھالا اور آگے چل کر یہی نوجوان اپنے وقت کا بڑا موسیقار اور گلوکار پنکج ملک بنا۔

خاموش فلموں کا ذکر چل رہا ہے تو یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اُس وقت فلموں پر سخت قسم کی سنسر شپ نہیں تھی۔ فلم ساز زندگی کے مختلف منظر دکھانے کے لیے تکلف کے پردے اٹھا دیتے تھے اور رات کی تنہائی میں چھپ چھپ کر دیکھی جانے والی کہانیاں اپنا لیتے تھے۔

صرف بنگالی فلم ساز ایسے تھے جنہوں نے اپنا دامن غیر معیاری چلن سے بچا کر رکھا، ابتداء ہی سے سنجیدہ موضوع فلمائے اور چونکہ آزادی کی تحریک چل نکلی تھی انہوں نے اپنے ڈراموں اور فلموں میں قوم پرستی کا مظاہرہ شروع کیا۔ اُس وقت انگریز حکمرانوں کو سختی اختیار کرنی پڑی اور تھیٹر اور سینما میں روک تھام شروع ہوئی۔ بمبئی کے برعکس کلکتے میں جتنی بھی فلمیں بنیں سب میں سنجیدہ موضوع کو کہانی بنایا گیا اور وہ مخصوص رویہّ اختیار کیا گیا جو فنونِ لطیفہ کے معاملے میں اہلِ بنگال کی پہچان تھا۔

چھارہی کالی گھٹا

اب آواز کی دنیا میں ایک اور انقلاب آیا۔
۱۹۲۵ء کے لگ بھگ وہ مائیکروفون ایجاد ہوا جو کاربن مائیکروفون کہلاتا ہے اور جو ترقی یافتہ شکل میں آج تک استعمال ہوتا ہے۔ یہ مائیکروفون آواز کی لہروں کو برقی لہروں میں تبدیل کر دیتا تھا۔ اسے آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس سے پہلے جو گانے والا قیف نما بھونپو سے منہ لگا کر اونچی آواز میں گاتا تھا، طبلے پر دھپ دھپ ہاتھ مارا جاتا تھا اور سارنگی کے تار بیکار رہ جاتے تھے۔ اب جو وہ گانے والا برقی مائیکروفون کے سامنے سانس بھی لیتا تھا اس کی آواز ریکارڈ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ گانے والا نیچے سروں میں گانے لگا، ہر ساز کی آواز سنائی دینے لگی اور پورے پورے آرکسٹرا اپنے ساز یئے ریکارڈ کرانے لگے۔ چنانچہ گوہر جان اور ملکہ جان کے زمانے کا بھونپوا اٹھا کر کباڑ میں پھینک دیا گیا یا عجائب گھر میں سجا دیا گیا اور سچ پوچھیئے تو اس کے بعد گراموفون ریکارڈ، بولنے والی فلموں اور ریڈیو کے دن پھر گئے۔
اس کے بعد ۱۹۳۱ء آیا اور سائنس نے چلتی پھرتی فلموں کو آواز عطا کر دی۔ فلموں کے کردار مکالمے ادا کرنے لگے، گانے لگے اور تھیٹر کے انداز میں اداکاری اور صداکاری کے جوہر دکھانے لگے۔
یہاں سے ہماری تحقیق اور جستجو ہمیں نئے اور مختلف راستے پر لئے چلتی ہے۔ یہاں سے ناظرین، حاضرین اور سامعین کو ایک اور طرح کی گفتگو اور مختلف انداز کے نغمے

سننے کو ملتے ہیں۔

ہمارا استدلال ہے کہ عمدہ نغموں اور اعلیٰ مکالموں کا مظاہرہ کرنے والے سینما گھر نہایت خاموشی سے خوش ذوقی کی درس گاہ بن گئے۔

ہوا یہ کہ ۱۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو بمبئی کے میجسٹک سینما میں فلم عالم آرا لگا دی گئی۔ سینما کے سامنے بھیڑ لگ گئی۔ لوگ سینما کے ملازموں سے پوچھ رہے تھے کہ فلم بھلا کیسے بول سکتی ہے۔ ملازم کہتے تھے کہ خود ہی دیکھو، یقین آ جائے گا۔

لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر اور فلم کی تیاری پر آنے والی بھاری لاگت وصول کرنے کے خیال سے سینما والوں نے ٹکٹ کے دام دوگنے کر دیئے یعنی دو آنے دے کر جو لوگ اگلی بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے اب اُن سے چار آنے طلب کیے گئے۔ اوپر سے غضب یہ کہ اس عجوبے کی خاطر ٹکٹوں کی بلیک بھی ہوئی اور چار آنے کا ٹکٹ پانچ روپے میں بکا۔ ہر روز سینما کے ٹکٹ گھر پر صبح ہی سے مجمع آ جاتا تھا اور کبھی کبھی تو لوگوں میں ہاتھا پائی بھی ہوتی اور ہر بار پولیس آ کر حالات پر قابو پاتی۔

عالم آرا اتنی مقبول ہوئی کہ سات ہفتوں تک ہاؤس فُل رہا۔ فلم اتر جانے کے بعد لوگوں کا اصرار بڑھا تو چھ مہینے بعد دوبارہ لگائی گئی، ساتھ ہی ملک کے دوسرے شہروں میں بھی عالم آرا نمائش کے لیے پیش کی گئی۔

'عالم آرا' امپیریل مووی ٹون بمبئی نے بنائی تھی۔ اس کی کہانی اپنے وقت کے مشہور ڈراما نویس جوزف ڈیوڈ نے لکھی تھی۔ اس کے پروڈیوسر تھیٹر اور فلم کی مشہور شخصیت آردے شر ایرانی تھے۔ فلم میں سات گانے تھے جن کی طرزیں فیروز شاہ مستری نے بنائی تھیں۔ گانے کس نے لکھے، یہ تو پتہ نہیں مگر ان کے بول پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی خدمات حاصل نہیں کی گئیں، بمبئی والوں نے گانے خود ہی لکھ ڈالے۔

عالم آرا کے اداکاروں میں تھیٹر اور خاموش فلموں کے مانے ہوئے فنکار شامل تھے مثلاً ماسٹر وٹھل، زبیدہ، جلّو، سوشیلا، جگدیش سیٹھی، وزیر محمد خاں اور راج کپور کے والد پرتھوی راج کپور جو ہمارے زمانے تک نہ صرف موجود تھے بلکہ اداکاری بھی کرتے تھے۔

فلم عالم آرا کے دو گانے ایسے تھے جنہوں نے پورے برصغیر میں دھوم مچا دی۔ فلم کی تاریخ کا پہلا گانا فقیر کا کردار ادا کرنے والے وزیر محمد خاں نے گایا تھا ؎

دے دے خدا کے نام پہ پیارے طاقت ہو گر دینے کی

کچھ چاہے اگر تو مانگ لے مجھ سے ہمّت ہو گر لینے کی

گداگری کی تاریخ میں یہ دوسرا مصرعہ کسی فقیر نے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔

فلم کا دوسرا مقبول گانا اداکارہ زبیدہ نے گایا تھا۔ فلم میں بھی ان کا نام زبیدہ تھا۔ اس کے بول بھی شاید آردے شر ایرانی نے خود ہی لکھ دیئے تھے۔ یہ بھی بہت مشہور ہوا تھا ؎

بدلہ دلوائے گا یا رب تو ستم گاروں سے   تو مددگار تو کیا خوف جفا کاروں سے

کاٹھ کی تیغ جو تو چاہے تو وہ کام کرے   جو کہ ممکن ہی نہیں لوہے کی تلواروں سے

یہ فلم کی تاریخ کا دوسرا گانا تھا۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ یہ فلم، اس کی آواز، اس کے ریکارڈ سب ضائع اور تلف ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ سن چالیس بیالیس کے قریب اداکار ماسٹر نثار نے 'دے دے خدا کے نام پہ' اپنی آواز میں ریکارڈ کرایا تھا۔ وہ شاید دستیاب ہوگا۔ اس کے علاوہ بمبئی کی کسی تقریب میں پرانے گلوکاروں نے عالم آرا کے گانے گا کر سنائے تھے جن کا وڈیو بنا تھا۔ وہ بھی کہیں نہ کہیں ملتا ہوگا۔

فلم عالم آرا کی خاص بات یہ تھی کہ یہ فلم بہت تیزی سے اور جلدی جلدی بنائی گئی تھی کیونکہ اس وقت بمبئی اور کلکتے میں کم سے کم دو درجن فلمیں ساتھ ساتھ بن رہی تھیں اور پہلی بولنے والی فلم کا اعزاز پانے کے لیے ایک دوڑ لگی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ ساڑھے دس ہزار فٹ لمبی فلم عالم آرا بنانے پر چالیس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے اور اس فلم سے بیس لاکھ کی آمدنی ہوئی تھی۔

کچھ بھی ہو، ۱۹۳۱ء تاریخی برس تھا۔ عالم آرا کی نمائش کے پورے دو مہینے بعد ۳۰ مئی کو آغا حشر کی لکھی ہوئی ایک بڑی فلم شیریں فرہاد پیش کی گئی جسے فلم اور تھیٹر کے مانے ہوئے پروڈیوسر جے جے مدن نے اپنے ادارے مدن تھیٹرز کلکتہ سے ریلیز کیا۔ اس کے نغمے بھی آغا حشر نے لکھے تھے جن کی طرزیں برج لال ورما نے بنائی تھیں۔ شیریں فرہاد کے

اداکاروں میں ماسٹر نثار، جہاں آرا کجن، محمد حسین، عبدالرحمان کابلی، موہن اور مس شریفہ شامل تھیں۔ جہاں آرا کجن شیریں بنی تھیں اور فرہاد کا کردار مشہور زمانہ ماسٹر نثار نے ادا کیا تھا جن کی گائی ہوئی ایک غزل گھر گھر مقبول ہوئی تھی

تم جو بیگانہ ہوئے کوئی یگانہ نہ رہا — وہ مقدر نہ رہا اور وہ زمانہ نہ رہا
آ میری گود میں گر کوئی ٹھکانہ نہ رہا — او زمیں تو ہی لب گور سے اتنا کہہ دے
اے اجل آ کہ کوئی اب تو بہانہ نہ رہا — جس کی امید میں جیتے تھے خفا ہے وہ ہی
تیر پھر کس پہ چلیں گے جو نشانہ نہ رہا — رحم کر رحم کہ یہ عشق ستم ہے مجھ پر

ایک روایت کے مطابق فلم شیریں فرہاد میں اٹھارہ اور دوسری روایت کے مطابق بیالیس گانے تھے۔ اسی روایت کے مطابق دو گانے ہر گلی کوچے میں گائے جانے لگے

شرطِ وفا نہیں — اے عاشقِ حزیں

اور دوسرا گانا جو شیریں (کجّن) نے فرہاد (ماسٹر نثار) کی قبر پر گایا تھا

سوئے ہو تم مزار میں — جل رہا ہے میرا جسم

کہتے ہیں کہ لوگ اس فلم کے دیوانے ہو گئے تھے۔ ایک تانگے والے نے اپنا گھوڑا تانگا گروی رکھ کر یہ فلم اپنے کنبے کے ساتھ ایک بار اور تنہا بائیس مرتبہ دیکھی تھی۔ مدن تھیٹرز کی یہ فلم بمبئی میں ۱۴ ہفتے چلی تھی۔ اس کے کچھ اور نغموں کے بول یہاں نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ فلمی شاعری کے معیار کا اتار چڑھاؤ نظر میں رہے

۱۔ لب پہ آہیں نہیں، شکوہ نہیں، فریاد نہیں
۲۔ یارب نہ کسی کو ہو آزار محبت کا
۳۔ سنگریزوں میں گہر تھا مجھے معلوم نہ تھا
۴۔ مسیحا تماشا دکھائے چلا جا میں مرتا ہوں اور تو جلائے چلا جا
۵۔ رُکا ہے دم ہر اک شے سانس لینے کو ترستی ہے
۶۔ پائی نہ گھڑی بھر بھی راحت تیری چاہت میں
۷۔ کیسا نصیب لائی تھی گلشن روزگار میں

اسی برس آغا حشر کی ایک اور فلم 'بھارتی بالک' بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ یہ بھی شیریں فرہاد کی طرح کلکتے کے مدن تھیٹرز کی تخلیق تھی۔ اس کی اداکارہ اپنے وقت کی نہایت حسین خاتون اور ہندوستانی فلموں کی پہلی ہیروئن پیشنس کوپر تھیں، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے ایک گانے کے بول تھے

گوری صورت گوری قسمت کا ہے ہاں آج زمانہ

ایک اور گانا خود آغا حشر کے دل پسند شغل کے تعلق سے تھا

بھر دے میرا پیمانہ   ساقی مستانہ   ہاں

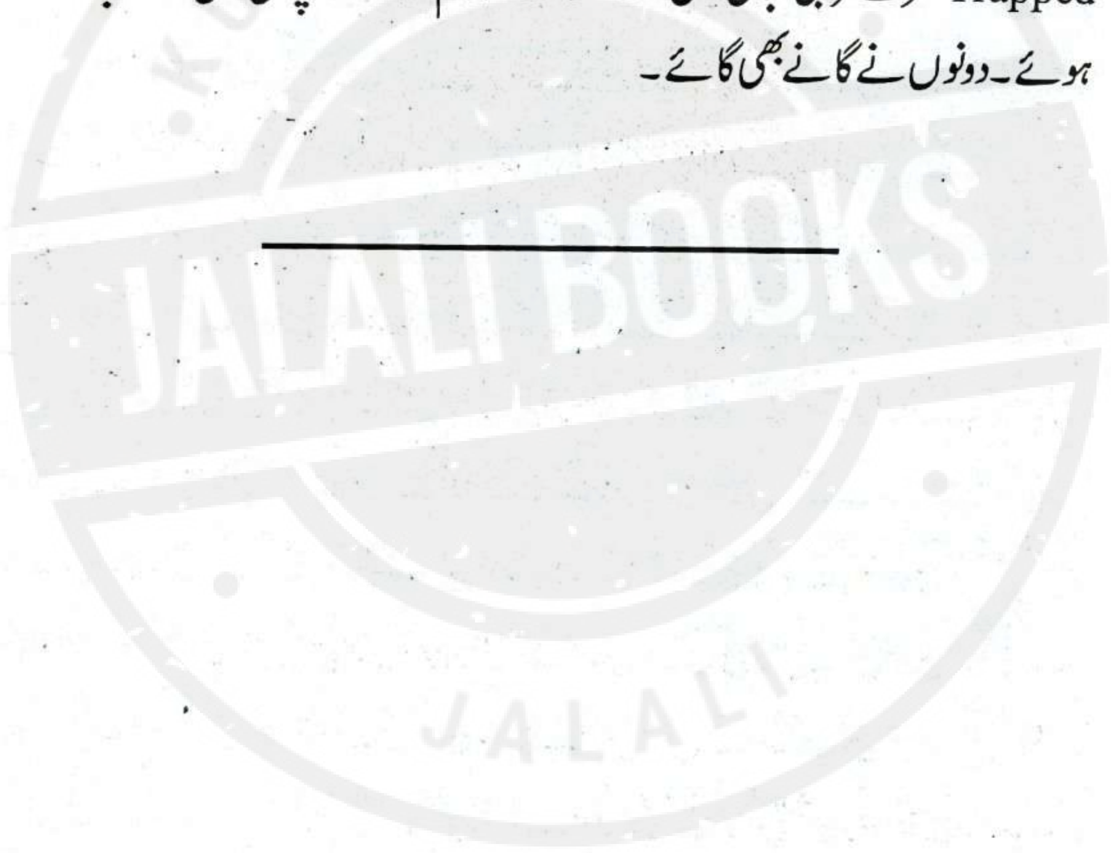
عالم آرا بنانے والے بمبئی کے ادارے امپیریل مووی ٹون نے اپنی دوسری فلم 'انگ سینا' جاری کی۔ اسے بھی ڈراما نویس جوزف ڈیوڈ نے لکھا تھا اور اس میں مشہور نغمہ 'چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے رے' شامل کیا گیا۔ فلم میں غالب کی دو غزلیں بھی شامل تھیں۔

۱۹۳۱ء کی ایک اور فلم جسے تاریخی حیثیت حاصل ہے رنجیت مووی ٹون کی سب سے پہلی فلم 'دیوی دیویانی' تھی جو چندولال شاہ نے بنائی تھی اور اپنے وقت کے عظیم موسیقار استاد جھنڈے خان صاحب نے جس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ وہ تھیٹر کے زمانے کے نامور میوزک ڈائریکٹر تھے اور جنھوں نے دس سال بعد کیدار شرما کی مشہور فلم 'چترلیکھا' (۱۹۴۱ء) کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے سارے یادگار گانے راگ بھیرویں میں کمپوز کیے گئے تھے۔

بولتی فلموں کے اس پہلے برس کی ایک اور قابل ذکر فلم کرشنا ٹون، بمبئی کی 'ہیر رانجھا' تھی جو منشی نازاں نے لکھی تھی۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر علی بخش تھے، جن کی بیٹی مینا کماری کے نام سے تاریخ ساز اداکارہ بننے والی تھی۔ اس ادارے نے ان ہی منشی نازاں کی لکھی ہوئی لیلیٰ مجنوں بھی بنائی جس کے اداکاروں میں علی بخش کا نام بھی ملتا ہے۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ مینا کماری نے یہ ساری خوبیاں کہاں سے پائی تھیں۔

لیکن اُسی برس جو لیلیٰ مجنوں کلکتے میں بنی اس کی شان ہی نرالی تھی۔ اس میں ماسٹر نثار نے مجنوں کا اور جہاں آرا کجن نے لیلیٰ کا کردار ادا کیا تھا لیکن یہاں جس عظیم

عمارت کی پہلی اینٹ رکھی گئی وہ ایک نوخیز اداکارہ شہلا تھی۔ وہ سترہ سال پہلے لاہور کے قصبہ چونیاں میں پیدا ہونے والی ارشاد بیگم تھی جو آگے چل کر ہمارے دور کی خورشید بانو بنیں۔ (تان سین ۱۹۴۳ء) اس فلم میں ماسٹر نثار کا وہ مقبول نغمہ بھی شامل تھا۔ 'لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں، میری لیلیٰ بسی میرے من میں۔' شہلا کے نام سے خورشید نے اُسی برس مدن تھیٹرز کلکتہ کی فلم شکنتلا میں بھی کام کیا جس میں ایک روایت کے مطابق ۴۲ گانے تھے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ خورشید نے اُس وقت تک گانا شروع کیا تھا یا نہیں۔ اس فلم میں ہمارے دور کے بہت بڑے کریکٹر ایکٹر نواب بھی تھے۔ اُسی برس بمبئی کی فلم Trapped عرف فریبی جال میں درگا کھوٹے اور فلم رومانٹک پرنس میں یعقوب نمودار ہوئے۔ دونوں نے گانے بھی گائے۔



دنیا یہ دنیا طوفان میل

۱۹۳۲ء میں فلم کے پودے پر سب سے زیادہ مہکتا ہوا پھول کھلا۔ کلکتے کی فلم محبت کے آنسو میں سہگل نمودار ہوئے۔ کندن لال سہگل جو اپنے آبائی علاقے جموں میں ریلوے کی ٹائم کیپری، ٹائپ رائٹر کی سیلز مین شپ اور کسی ہوٹل کی مینجری کرتے کرتے محض ایک درویش صفت سلمان یوسف کی صحبت میں رہ کر گلے سے ایسے ایسے سُر نکالنے لگے کہ نیچے میدانوں میں کسی کو خبر تک نہیں ہوئی یہاں تک کہ کلکتے کے فلمساز ادارے نیو تھیٹرز والوں نے انہیں جالیا۔ ایسے سُریلے گلوکار کے لیے سرزمین بنگال کے بے حد ذہین موسیقار رائے چند بورال نے دھنیں ترتیب دیں اور محبت کے آنسو کے نام سے فلم بنائی گئی۔ یہ فلم تو شاید ادھر اُدھر ہو گئی لیکن اُسی برس نیتن بوس نے آرسی بورال کی ترتیب دی ہوئی موسیقی کے ساتھ ایک اور فلم صُبح کا ستارا بنائی جس میں کے ایل سہگل کے ساتھ اتنی ہی سریلی گلوکارہ رتن بائی بھی تھیں۔ رتن بائی دراصل اپنے زمانے اور تھیٹر کے دور کی مشہور طوائف امام باندی تھیں۔ اوپر سے یہ کہ ہمارے آرزو لکھنوی کلکتے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے صبح کا ستارا کے گانے لکھے۔ چند گانے یوں تھے:

۱۔ اب دوا دیتے ہیں وہ اور نہ دعا دیتے ہیں
۲۔ خیال کاش وہ کرتے کچھ اپنے بسمل کا
۳۔ نہ ہنستے ہیں تیرے قیدی نہ کچھ فریاد کرتے ہیں

۴۔ نہ سکون ہوں نہ خمار ہوں، نہ سکون ہوں نہ قرار ہوں

۵۔ آرزو اتنی ہے اب میرے دل ناشاد کی

۶۔ اشک بہے بہا کرے، درد بڑھے بڑھا کرے

۷۔ التجا خالق سے یہ ہے اس دل ناشاد کی

گویا فلم میں غزل اپنی پوری آب وتاب سے آگئی۔ آرزو صاحب کلکتے کیا پہنچے وہاں ترتیب پانے والے گانوں پر شاعری کا حُسن چھا گیا۔

۱۹۳۲ء میں آغا حشر کی اہلیہ مختار بیگم بھی نمودار ہوئیں۔ اسی برس لوگوں نے شانتا آپٹے کو پہلی بار فلم میں دیکھا اور سنا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

آغا حشر کے ڈرامے بلوا منگل کی کہانی پر پہلی رنگین فلم بنی جو سمندر پار بھیج کر دھلوائی گئی۔ خورشید اس وقت تک شہلا کے نام سے فلموں میں آتی رہیں خصوصاً ان کی فلم چترا بکاؤلی میں تقریباً پچاس گانے تھے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ اُس وقت تک فلم سازوں کو خورشید کی اصل خوبی یعنی گلوکاری کا کتنا اندازہ تھا۔

سنہ ۳۲ء کے دوران استاد جھنڈے خاں نے دو فلموں میں اور استاد وزیر خاں نے بھی دو فلموں میں موسیقی ترتیب دی خصوصاً ان کی فلم اندر سبھا میں ۷۱ گانے تھے۔ اندر سبھا میں جیسا کہ ہر ایک جانتا ہے پریوں کا اکھاڑا تھا جس کے درمیان اندر براجمان ہوا کرتے تھے۔ تھیٹر میں تو یہ ڈراما بار بار کھیلا گیا۔ لیکن جب مدن تھیٹرز کلکتہ نے اسے فلم کے قالب میں ڈھالا تو سوچئے کیسے کیسے اداکار اس میں لئے گئے، ماسٹر نثار، جہاں آرا کجن اور عبد الرحمان کابلی۔ فلم میں پریوں کی اداکاری کرنے کے لیے پروڈیوسر جے جے مدن نے اینگلو انڈین لڑکیوں کو چنا۔ شہزادہ گلفام تو ماسٹر نثار کو بنایا گیا۔ سبز پری کا کردار کجن کو سونپا گیا۔ اس کے بعد مِس سِلویا بیل پکھراج پری بنیں۔ مس پرل کو نیلم پری بنایا گیا اور عبدالرحمان کابلی کو کالا دیو بنایا گیا۔ راجا اندر بنانے کے لیے ولایت حسین کو چنا گیا۔ یہ سب لوگ تھیٹر کے تجربہ کار اداکار تھے۔

استاد جھنڈے خاں نے رنجیت مووی ٹون، بمبئی کی دوسری پیشکش 'رادھا رانی'

کی موسیقی ترتیب دی۔ اس کی ہیروئن اپنے وقت کی مشہور اور سریلی اداکارہ گوہر سلطانہ تھیں۔ اس فلم کے ان کے ایک گانے کے بول محفوظ ہیں جو پنڈت نرائن پرساد بیتاب نے لکھے تھے:

اے درد دل کسی دن ہونا نہ جدا ہم سے — آباد یہ میخانہ ہے تیرے دم قدم سے
ہم غم زدوں کا رونا دنیا کی اک ہنسی ہے — ہاں اشک خوں سنبھلنا، گرنا نہ چشم نم سے
اے حسرتو ہٹو بھی ہو لی مزاج پُرسی — ہم حالِ دل کہیں گے فرصت ملی جو غم سے
بیتاب اِس جہاں میں کوئی نہیں کسی کا — دیتے ہیں اب دکھائی اپنے ہی مجھ کو کم سے

اسی طرح اندر سبھا کا ایک گانا ملتا ہے جو جہاں آرا کجّن نے گایا تھا۔ اس کی طرز وزیر خاں نے بنائی ہوگی اور اس کے ساتھ باجا ساگر داس نائیک نے بجایا تھا۔ اشعار غالباً دوسرے گانوں کی طرح امانت کی اندر سبھا ہی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ بول یوں تھے:

چمن کو یوں مرے ساقی نے میخانہ بنا ڈالا — کلی کو شیشہء مے، گل کو پیمانہ بنا ڈالا
گرفتار بلائے عشق تو پہلے ہی تھے لیکن — تمہارے گیسوؤں نے اور دیوانہ بنا ڈالا
بھلا کچھ بات تھی بے بات اتنا تو کھنچا ہم سے — سوال وصل کو ظالم نے افسانہ بنا ڈالا
خدا کے گھر میں قبضہ کر لیا اندھیر تو دیکھو — بُتوں نے دل میں رہ کر دل کو بت خانہ بنا ڈالا

اسی برس حیدر آباد دکن میں فلم 'شکاری' بنی۔ جس میں اداکار جے راج نمودار ہوئے۔ جے راج خاموش فلموں کے زمانے سے اداکاری کرتے چلے آرہے تھے اور بولتی فلموں میں کون سا کردار ہوگا جو انہوں نے ادا نہیں کیا۔ ہندوستان کی فلموں کا جتنا زمانہ جے راج نے دیکھا کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ گیارہ خاموش فلموں اور دو سو سے زیادہ بولتی فلموں میں کام کرنے کے بعد وہ ابھی سنہ دو ہزار تک زندہ تھے۔ وہ خالص حیدر آبادی تھے اور اردو نہایت روانی سے بولتے تھے۔ جب تک زندہ رہے ملنے والوں کو فلم کے عجیب و غریب قصے سنایا کرتے تھے۔

سنہ ۳۲ء میں ایک اور شخصیت ابھری اور وہ تھے برصغیر کے عظیم نغمہ نگار ڈی این مدھوک جنہیں اب ہم کہتے ہیں مہا کوی دینا ناتھ مدھوک۔ انہوں نے لاہور میں بننے والی فلم

رادھے شیام کے نہ صرف گانے لکھے، اس کی دھنیں بنانے میں ہاتھ بٹایا بلکہ فلم میں اداکاری بھی کی۔ جیسے وہ مہا کوی تھے ویسے ہی موسیقار اعظم نوشاد علی کو وہ فلمی دنیا میں لے کر آئے۔ ان کی گفتگو کسی اور مقام پر ہوگی۔

ایک اور نمایاں نام جو سنہ ۳۲ء میں سامنے آیا وہ پاکستان کے سرکردہ موسیقار رفیق غزنوی تھے، جو لاہور میں بننے والی فلم ہیر رانجھا کے نہ صرف میوزک ڈائریکٹر بلکہ ایکٹر بھی تھے۔ ان کے ساتھ مشہور اداکار ایم اسماعیل بھی تھے۔ ہیر رانجھا کے صرف ایک گانے کا ذکر ملتا ہے: اُٹھ اے وفا شعار میرا حالِ زار دیکھ۔ کہتے ہیں کہ فلم کو کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

یہاں جن فلموں کا ذکر ہوا اکثر خود بھی مٹ گئیں اور ان کے نغمے بھی وقت کی گرد میں دب گئے، صرف ایک فلم مایا مچھندر کا ایک گانا اب بھی دستیاب ہے۔ یہ فلم وی شانتارام نے بنائی تھی اور اس کے موسیقار اور گلوکار گووند راؤ تینبے (Tembe) تھے۔ گانے کے بول کچھ یوں ہیں:

چھوڑ آکاش کو ستارے زمین پر لائے   دیکھئے سورگ کی کیا خیر خبر لائے

اتنی گاڑھی ہندی یا اس سے ملتی جلتی کوئی زبان ہے جسے خدا ہی سمجھے۔

سنہ ۳۳ء میں آغا حشر کی لکھی ہوئی کئی فلمیں جاری ہوئیں مثلاً آنکھ کا نشہ اور عورت کا پیار جو ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کلکتہ کی پہلی پیشکش تھی اور جس کے موسیقار مختار احمد اور پروڈیوسر اے آر کاردار تھے جنہیں آگے چل کر عظیم فلمساز بننا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن آغا صاحب کی اہلیہ مختار بیگم تھیں جنہوں نے غزل خوانی میں بڑا نام پیدا کیا۔ عورت کا پیار میں مختار بیگم نے اپنے شوہر کی مشہور غزل گائی:

چوری کہیں کھلے نہ نسیمِ بہار کی   خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

جب تک زندہ رہیں لوگوں کی فرمائش پر یہ غزل سناتی رہیں بعد میں ہوسکتا ہے ان کی چھوٹی بہن فریدہ خانم بھی گاتی رہی ہوں۔ اسی فلم میں پشاور کے گل حامد نے بھی اداکاری کی۔ جنہیں آگے چل کر پیشنس کوپر جیسی خوبصورت اداکارہ کا شوہر بننا تھا۔

سنہ ۳۳ء کا ایک اور بڑا واقعہ اردو فلموں میں کانن دیوی کا آنا ہے۔ بنگالی فلموں اور گراموفون ریکارڈ میں وہ بڑا نام پا چکی تھیں۔ فلم چار درویش میں ان کے نمودار ہوتے ہی گویا درجنوں یادگار گانوں کی بنیاد رکھی گئی۔

اے چاند چھپ نہ جانا
دنیا یہ دنیا طوفان میل
ڈولے ہردے کی نیّا
دور دیش کا رہنے والا آیا
کچھ یاد رہے تو سن کر جا
مورے انگنا میں آئے عالی

کانن اور ان کے گانوں کا ذکر آگے آئے گا۔

اسی برس کلکتے میں فلم 'ایک دن کا بادشاہ' بنی۔ یہ فلم یوں یادگار تھی کہ اس میں اداکاری اور گلوکاری کے لیے اپنے وقت کی بہت بڑی گلوکارہ اختری بائی فیض آبادی کو لایا گیا۔ اس کے گانوں کی فہرست دستیاب نہیں البتہ بزرگ موسیقار ماسٹر فدا حسین کو ایک گانے کے بول یاد تھے: وہ اسیرِ دام بلا ہوں میں، جسے چین تک بھی نہ آسکے۔

سنہ ۳۳ء میں واڈیا مووی ٹون وجود میں آئی اور اس نے اپنی پہلی فلم لعل یمن جاری کی۔ اس کے گانوں کے ریکارڈ بنے تھے جن میں زیادہ تر آوازیں ماسٹر محمد اور فیروز دستور کی تھیں۔ یہ گانے ڈرامانگار جوزف ڈیوڈ اور منشی عاشق نے لکھے تھے۔

فیروز دستور (انتقال: ۱۰ مئی ۲۰۰۸ء، عمر ۸۹ برس) کیرانہ گھرانے کے گلوکار تھے اور کلاسیکی موسیقی پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ لعل یمن میں ان کی زندگی کا پہلا فلمی گانا تھا: جاؤ سدھارو تم پہ سایہ رب کا۔

جانداروں کی طرح گانوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ کوئی جلد مر جاتا ہے اور کوئی بہت جیتا ہے۔ ۳۳ء میں دو فلمیں ایسی بنیں کہ آج تقریباً ستر سال بعد بھی پرانی نسل کو نہ صرف ان کے گانوں کے بول بلکہ طرزیں بھی یاد ہوں گی۔ وہ فلمیں تھیں: نیو تھیٹرز کلکتہ کی

پورن بھگت اور یہودی کی لڑکی۔

فلم پورن بھگت میں مشہور گلوکار کے سی ڈے نمودار ہوئے۔ اکثر قارئین کو یاد ہوگا کہ وہ نابینا تھے لیکن پیدائشی نہیں۔ انہیں بچپن میں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا۔ وہ دن بھر پتنگ اڑاتے اور سورج ان کی آنکھوں میں آتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بینائی جاتی رہی۔ ۱۸۹۳ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ایس ڈی برمن کے استاد تھے۔ خود استاد زبیر خاں سے موسیقی سیکھی۔ بنگالی اور ہندوستانی فلموں میں اداکاری کی اور میوزک ڈائریکٹر بھی رہے۔ پہلے پہل فلم پورن بھگت میں دو گانے گائے جو آج بھی یاد کئے جاتے ہیں:

کیا کارن ہے اب رونے کا، کالی رات ہوئی اجیالی
پایا جیون کا اُجیارا، رہا اندھیرا سولہ برس تک

اور دوسرا گانا بھی اسی قدر مقبول ہوا:

جاؤ جاؤ اے میرے سادھو رہو گرو کے سنگ
سولہ برس پر آئے تھے اک دن شانت رہے ہم لوگ
اب پھر چھوڑ چلے ہم سب کو کہو یہ کون ہے ڈھنگ

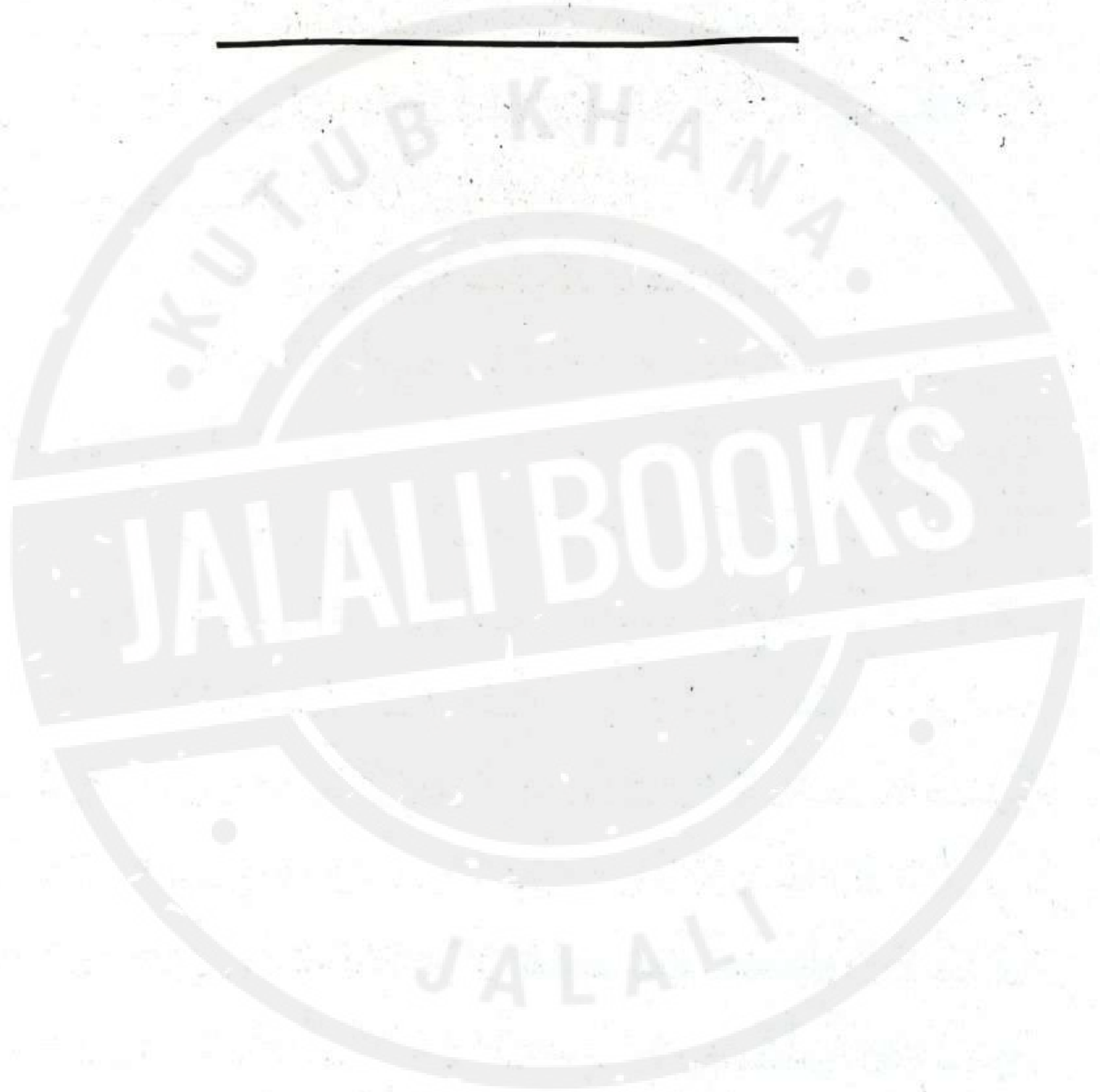
گانے میں سولہ سال کی تکرار کا تعلق پورن بھگت کی زندگی کی داستان سے رہا ہوگا۔ اس فلم میں کے ایل سہگل کے چار گانوں کے ریکارڈ بنے اور اس طرح ان کے گانے کا انداز گھر گھر پہنچا اور اس کی دھوم مچی۔ ہر چند کہ موضوع کی مناسبت سے یہ گانے مذہبی نوعیت کے تھے مگر اس میں ان کی تازہ تازہ آواز تھی جس میں بلا کی مٹھاس اور سریلا پن تھا۔ اس وقت شاید خود گاتے تھے۔ شراب سنگت نہیں کرتی تھی:

۱۔ بھجو میں تو بھاو سے شری گردھاری ہردے میں اب
پُن ہے کرشن نام کی پیاری

۲۔ دن نی کے بیتے جاتے ہیں، سُمرن کر سیا رام نام

۳۔ او سر بیتو جائے پرانی تیرو او سر بیتو جائے
اس کال کی ہیرا پھیری میں تیرو او سر بیتو جائے

یہ تو آرسی بورال کی ترتیب دی ہوئی موسیقی تھی۔ اس کے بعد آتی ہے فلم یہودی کی لڑکی۔ جو سب ہی جانتے ہیں آغا حشر کا لکھا ہوا مشہور ڈراما تھا اور اس کے موسیقار پنکج ملک نیو تھیٹرز کلکتہ کی اس پیشکش میں پہلی بار اہل ہند کے سامنے آئے۔



ساون کے نظارے ہیں

پنکج بہت بڑے میوزک ڈائریکٹر اور گلوکار تھے۔ انہیں نیو تھیٹرز کا ستون تصور کیا جاتا تھا۔ انہوں نے ٹیگور کے نغمے اتنی نفاست سے سنوارے کہ ٹیگور نے یہ گانے فلموں میں استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ٹیگور کے کچھ نغموں کا آرزو صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا جنہیں پنکج ملک نے گایا۔ پنکج کو سُر ساگر، سنگیت رتنا کر، پدم شری اور دادا صاحب پھالکے ایوارڈ جیسے اعزاز ملے۔ وہ ۱۹۷۸ء میں ۷۳ سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے۔

یہودی کی لڑکی کے اداکاروں میں کندن لال سہگل اور رتن بائی عرف امام باندی کے علاوہ دو بڑے کریکٹر ایکٹر نواب اور کُمار شامل تھے۔ فلم میں سہگل نے چار گانے گائے اور چاروں گلی گلی محلّے محلّے گائے گئے۔

۱۔ نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (غالب)

۲۔ لگ گئی چوٹ کریجوا میں ہائے راما
نینوں کے تیر موہے مار گیو سیاں
لگ گئی چوٹ کریجوا میں ہائے راما

۳۔ لاکھ سہیں ہم پی کی بتیاں ایک سہی نہ جائے

۴۔ یہ تصرّف اللہ اللہ تیرے میخانے میں ہے
عقل کی سب پختہ کاری تیرے دیوانے میں ہے
مے پرستی کا مزا جب ہے کہ ساقی کہہ اُٹھے
مے میں وہ مستی کہاں جو میرے مستانے میں ہے
ساقیٔ روز ازل کی وہ نگاہ مست مست
آج ہم رندوں کے اِس ٹوٹے سے پیمانے میں ہے

اس فلم سے سب سے بڑا بھید یہ کھلا کہ سہگل کو غزل خصوصاً اساتذہ کا کلام گانے میں مہارت حاصل ہے اور غالب کو جیسا انہوں نے گایا کوئی دوسرا نہ گا سکا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سہگل کو اردو اور فارسی سے لگاؤ رہا ہوگا اور وہ غزل کو پوری طرح سمجھ کر گاتے تھے جس کو سننے کا لطف ہی الگ تھا۔

سنہ ۳۳ء کی ایک اور قابل ذکر فلم زہری سانپ تھی جس میں دو خوش شکل خواتین جہاں آرا کجن اور پیشنس کوپر نے کام کیا تھا۔ کجن کے ایک گانے کے بول ملتے ہیں۔ خالص نسوانی گانا تھا:

راجا تورا پنیا ہم سے نہ بھرا جائے رے — بالی عمریا، سر پر گگریا
پتلی کمریا تین تین بل کھائے — راجا تورا پنیا ہم سے نہ بھرا جائے

۱۹۳۴ء نے فلم کی موسیقی کو دو آوازیں دیں: اختری بائی فیض آبادی اور شانتا آپٹے۔ اس دوران پونا میں پربھات فلم کمپنی نے امرت منتھن پیش کی جس میں شانتا آپٹے اگرچہ ہیروئن نہیں تھیں لیکن ان کی گلوکاری کی وجہ سے فلم مقبول ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سلور جوبلی بنانے والی یہ برصغیر کی پہلی ہندی فلم تھی۔ فلم میں شانتا کی آواز میں اس غزل نے دھوم مچائی:

رات آئی ہے نیا رنگ جمانے کے لیے — لے کے آرام کا پیغام زمانے کے لیے
گنگناتی ہوئی دھیرے سے جو آتی ہے صبا — تھپکیاں ماں کی طرح دے کے سلانے کے لیے
کیسی بے رحمی سے بکھرے ہوئے ہیں لعل و گوہر — آسماں کیا تری دولت ہے لٹانے کے لیے
کیا ہی اچھا ہے یہ بچپن کا زمانہ بھی یہاں — موج کرنے کے لیے کھیلنے کھانے کے لیے

اس فلم میں شانتا آپٹے نے ذرا اُداس کر دینے والی غزل گائی:

کمسنی میں دل پہ غم کا بار کیوں — وائے قسمت پاس گل کے خار کیوں
ٹوٹ جب امید ہی اپنی گئی — بندھ رہا ہے آنسوؤں کا تار کیوں
دل ہوا ٹکڑے تو پہلے وار میں — پھر بھی تیروں کی ہے یہ بوچھار کیوں
ویؔر اس دیوانگی میں ہے مزا — لوگ کہتے ہیں اسے آزار کیوں

ویؔر محمد پوری کی اس غزل کے وزن پر ۱۵ سال بعد قمر جلال آبادی نے فلم لیکھ کے لئے غزل لکھی جو مکیش نے گائی اور جس کی طرز ایم اے کرشنا دیال نے بنائی:

لٹ گیا دن رات کا آرام کیوں — اے محبت تیرا یہ انجام کیوں

یوں شانتا آپٹے کمسنی میں دل پر تنہائی کا بار لئے ۴۶ برس کی عمر میں مر گئیں۔ ان کے والد ریلوے اسٹیشن ماسٹر تھے اور موسیقی سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ ان ہی کے زیر اثر شانتا گلوکارہ اور پھر اداکارہ بنیں۔ نوعمری میں انہوں نے مراٹھی فلم میں کام کیا جو بمبئی میں ۲۰ ہفتے چلی۔ اس کے بعد وہ زمیندار، وہاں، دنیا نہ مانے اور امر جیوتی سمیت کئی اردو، ہندی فلموں میں نظر آئیں اور تامل اور گجراتی فلموں میں بھی کام کیا۔ آخر میں وہ اکیلی رہ گئیں اور تنہائی اور شراب نے مل کر انہیں مار ڈالا۔ شانتا آپٹے کے چند گانے اب بھی دستیاب ہیں:

۱۔ دیکھو دیکھو سکھیو کیسی چھائی بادری (امرت منتھن ۱۹۳۴ء)
۲۔ سنو سنو بن کے پرانی، بنی ہوں آج تمہاری رانی (امر جیوتی ۱۹۳۶ء)
۳۔ اب میں نے جانا ہے، ہائے پریم کیا ہے (امر جیوتی ۱۹۳۶ء)
۴۔ ایک تھا راجا ایک تھی رانی (دنیا نہ مانے ۱۹۳۷ء)
۵۔ ہر گلی میں ہیں بغیچے (وہاں ۱۹۳۷ء)
۶۔ موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ دے اے گردھر گوپال (زمیندار ۱۹۴۲ء)
۷۔ ارمان تڑپتے ہیں پہلو میں مرے آ کے
برباد ہو گئے ہیں اس گھر کو ہم بسا کے
آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور دل بھرا ہوا ہے

سہمی ہوئی پڑی ہے فریاد لب پہ آکے

یہ آخری گانا شانتا آپٹے نے فلم زمیندار میں گایا تھا جو ۱۹۴۲ء میں لاہور اور بمبئی میں بنی تھی۔ اس کی موسیقی غلام حیدر نے ترتیب دی اور بول ڈی این مدھوک نے لکھے۔ اس فلم میں قمر جلال آبادی نے 'چھوٹا سا سنسار ہمارا' کے بول لکھے تھے جس میں گاؤں کے جیتے جاگتے منظر بیان کیے گئے تھے۔

غلام حیدر مرحوم پہلے میوزک ڈائریکٹر تھے جنہوں نے گانے والیوں کے ٹھمری اور دادرے کا انداز بدلا اور چلتی ہوئی مقبول طرزیں بنائیں جن کی پہلی اور بڑی مثال فلم خزانچی (۱۹۴۱ء) کا گانا 'ساون کے نظارے ہیں' ہے۔ یہ ایک کورس تھا جس میں شمشاد بیگم اور خود غلام حیدر کی آوازیں نمایاں تھیں۔ یہ فلم سید شوکت حسین رضوی نے بنائی تھی جن کا ذکر آگے چل کر آتا رہے گا۔

آخری بات یہ کہ شانتا آپٹے مختلف زبانوں کا لب ولہجہ اتنی آسانی سے سیکھ لیتی ہوں گی کہ پنجاب کی فلم زمیندار کے گانے گاتے گاتے اُن کے لہجے میں پنجاب کا انداز آگیا۔ یہ بھی بڑی خوبی تھی۔

فلم زمیندار کے ذکر میں دو ایسے نغمہ نگاروں کے نام آئے جو آگے چل کر بہت بڑے نامور اور کامیاب گیت کار بننے والے تھے۔ مہاکوی دینا ناتھ مدھوک کا ذکر پچھلے صفحوں میں ہو چکا۔ وہ جب اپنے عروج کو پہنچے تو فلم رتن (۱۹۴۴ء) کا گانا لکھا: انکھیاں ملا کے، جیا بھرما کے چلے نہیں جانا۔ اور دوسرا نام قمر جلال آبادی کا ہے جنہوں نے فلم پیار کی جیت (۱۹۴۸ء) کے لئے خود اپنا پسندیدہ گیت لکھا جو گلی گلی گایا گیا جس کی طرز حُسن لال بھگت رام نے بنائی اور جسے محمد رفیع نے اپنے ابتدائی زمانے میں گایا۔ اس کے بول پڑھنے والوں کو آج بھی یاد ہوں گے: اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

وہ ۱۹۱۷ء میں امرتسر کے قصبے جلال آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام پرکاش تھا۔ وہ نوعمری ہی سے شعر کہنے لگے۔ شروع میں وہ لاہور کے اخباروں میں لکھتے رہے۔ سنہ ۴۲ء میں انہیں پنچولی پکچرز کی فلم زمیندار کے لیے گانے لکھنے کا موقع ملا۔ بہت سے دوسرے

لوگوں کی طرح بعد میں وہ بمبئی جا پہنچے اور چالیس سال کے لگ بھگ فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔

قمر جلال آبادی نے درجنوں فلموں کے نغمے لکھے ہوں گے مگر ان میں قابل ذکر فلمیں یہ ہیں: مرزا صاحباں (۴۷ء) سیندور (۴۷ء) لیکھ (۴۹ء) شبنم (۴۹ء) مینا بازار (۵۰ء) معشوقہ (۵۳ء) اور فلم پہلی تاریخ (۵۴ء) جس کا کشور کمار کی آواز میں یہ گانا ریڈیو سیلون سے ہر مہینے بجا کرتا تھا: "خوش ہے زمانہ آج پہلی تاریخ ہے۔"

سنہ ۳۴ء میں اپنے زمانے کی مشہور گلوکارہ اختری بائی فیض آبادی تین فلموں اینہ، ممتاز بیگم اور روپ کماری میں کاسٹ کی گئیں۔ اس کے بعد وہ فلم جوانی کا نشہ، نصیب کا چکّر، انار بالا اور بالآخر محبوب کی فلم روٹی (۱۹۴۲ء) میں نمودار ہوئیں اور انل بسواس کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں انہوں نے چھ نغمے ریکارڈ کرائے۔ محبوب نے کسی وجہ سے ایک گیت اور دو غزلیں فلم میں شامل کیں۔

۱۔ رہنے لگا ہے دل میں اندھیرا تیرے بغیر
بے نور ہو گئی مری دنیا تیرے بغیر (بہزاد لکھنوی)

۲۔ وہ ہنس رہے ہیں آہ کیے جا رہا ہوں میں،
پتھر کے دل میں راہ کیے جا رہا ہوں میں، (آرزو لکھنوی)

۳۔ الجھ گئے نینوا (آرزو لکھنوی)

اختری ۱۹۱۴ء میں فیض آباد میں مشتری بیگم کے ہاں پیدا ہوئیں۔ گلوکاری کے گھرانے سے نہیں تھیں مگر روزی کی خاطر وہ محفلوں میں گانے لگیں۔ ایک بار وہ والدہ کے ساتھ کلکتے گئی ہوئی تھیں جہاں مشہور و معروف الفریڈ تھیٹر میں موسیقی کی محفل ہو رہی تھی۔ استاد کے اصرار پر تیرہ سال کی لڑکی کو اسٹیج پر بلایا گیا اور اب جو نوعمر اختری غزل سرا ہوئیں تو مجمع میں دھوم مچ گئی۔ ان دنوں کلکتہ ہی فلم سازی کا مرکز تھا چنانچہ فلم والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جب ان کی پہلی فلم ایک دن کا بادشاہ نمائش کے لیے پیش کی گئی تو وہ اُنیس برس کی تھیں۔ اکیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ سات فلموں میں کام کر چکی تھیں۔ ان کا انتقال

۱۹۷۴ء میں ہوا۔ ولادت کے پورے ساٹھ برس بعد۔

۱۹۴۳ء کی دوسری قابل ذکر فلم چنڈی داس تھی۔ یہ بھی نیو تھیٹرز کلکتہ نے بنائی۔ نتن بوس اس کے پروڈیوسر تھے اور آر سی بورال جیسے ذہین موسیقار نے اس کی دھنیں ترتیب دی تھیں۔ چنڈی داس کے چند گانے آج بھی زندہ ہیں:

۱۔ پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں، تج کے سب سنسار
پریم کا آنگن، پریم کی چھت اور پریم کے ہوں گے دوار (اوما ششی اور سہگل)

۲۔ بسنت رتو آئی عالی پھول کھلے ڈالی ڈالی
کنج کنج کوئلیا بولے (اوما ششی)

۳۔ تڑپت بیتے دان رینا، نس دن برہا تورا ستاوے
کیسے آوے مو۔ ہے چینا (کندن لال سہگل)

اس فلم کے سارے گانے آغا حشر کاشمیری نے لکھے تھے۔ آغا صاحب بدستور کلکتے میں موجود تھے جو ابھی تک فلم اور گراموفون کا مرکز تھا البتہ اس دوران مشہور اداکار ماسٹر نثار بمبئی چلے گئے اور ہماری خوش رنگ حسینہ پیشنس کوپر بھی بمبئی جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد تو یہ سبھی لوگ بمبئی کو سدھار گئے۔

بابا من کی آنکھیں کھول

سنہ ۳۵ء میں برصغیر میں اگرچہ ایک سو چالیس سے زیادہ فلمیں پیش کی گئیں مگر وہ اپنا نقش نہ چھوڑ سکیں کیونکہ ایک فلم نے تنہا ان سب کو فراموشی کے غار میں دھکیل دیا۔ وہ ایک فلم نیو تھیٹرز کی دیوداس تھی جس میں سہگل کی اداکاری کے آج تک چرچے ہیں۔ شرت چندر چٹو پادھیائے کے ناول کی بنیاد پر یہ فلم اب تک تین مرتبہ بن چکی ہے۔ پہلی دیوداس کے اکثر نغمے کیدار شرما نے لکھے اور اس کے موسیقار تمر برن تھے۔ اس کے اداکاروں میں ذو اور مشہور گانے والے، کے سی ڈے اور پہاڑی سانیال بھی شامل تھے۔ فلم میں سہگل کی آواز میں دوگانے بے حد مقبول ہوئے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کی طرزیں خود سہگل صاحب نے تیار کی تھیں۔

۱۔ بالم آئے بسو مورے من میں ساون آیا تم نہ آئے
تم بن رسیا کچھ نہ بھائے من میں مور ہوک اُٹھت جب
کوئل کوکتی بن میں

۲۔ دکھ کے اب دن بیت ناہیں سکھ کے دن تھے ایک سپن تھا
اب دن بیت ناہیں دکھ کے اب دن بیت ناہیں
(سارنگی اور سہگل کی طنزیہ ہنسی سننے کے قابل ہے)

دیواس میں کے سی ڈے کے دو نغمے بھی سننے کو ملتے ہیں:

۱۔ مت بھول مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا
۲۔ نہ آیا من کا میت عمریا بیت گئی ساری

فلم میں پہاڑی سانیال نے دو نغمے گائے مگر وہ اِدھر اُدھر رہ گئے:

۱۔ روشن ہے ترے دم سے دنیا کا پری خانہ — اللہ تجھے رکھے او جلوۂ جاناناں
کیا جلوہ گری ہے یہ او مست نظر والے — پیمانے کے اندر ہے میخانے کا میخانہ

۲۔ چُھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا — نہ پھول تھے نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا
وہ باغ ہی نہ رہا جس پہ ناز تھا مجھ کو — وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

دیوداس اور پارو کی بچپن کی محبت پر جب شباب آیا تو پارو کسی رئیس سے بیاہ دی گئی۔اس کے بعد شراب اور طوائف کا کوٹھا بھی دیوداس کے سینے پر رکھا جدائی کا بھاری پتھر نہ ہٹا سکا۔آخر اس نے موت کو گلے سے لگا لیا البتہ پارو کو آخری بار دیکھنے کی خواہش دل میں لے کر اس نے پارو کی دہلیز پر دم توڑ دیا۔

اس منظر کے ساتھ کے سی ڈے کی آواز میں ایک نغمہ ہے:

تیری موت کھڑی ہو سرہانے جدھر — تیری بالیں پہ ہو جائے وہ جلوہ گر
تری جان میں آ جائے جان اگر — وہ جو پیار سے دیکھ لے ایک نظر

اسی برس ایک اور تاریخ ساز فلم بنی اور وہ تھی نیو تھیٹرز کلکتہ کی 'دھوپ چھاؤں'۔ روایت یہ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار اس فلم میں پلے بیک گانے فلمائے گئے۔اس کا ایک گانا "میں خوش ہونا چاہوں، خوش ہو نہ سکوں" پارول گھوش سمیت تین گلوکاروں کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا لیکن فلم میں تین مختلف اداکاروں نے نغمے کے ساتھ ساتھ صرف اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ پارول گھوش، جو مشہور بانسری نواز پنّا لال گھوش کی بیوی اور عظیم میوزک ڈائریکٹر انل بسواس کی بہن تھیں۔آگے چل کر بڑی گلوکارہ بننے والی تھیں۔

دھوپ چھاؤں کی موسیقی آر سی بورال اور پنکج ملک نے ترتیب دی تھی۔اس میں کے سی ڈے نے اپنی زندگی کے دو یادگار گانے گائے تھے:

۱۔ بابا من کی آنکھیں کھول

۲۔ تری گٹھری میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا

ایک اور گانا فلم میں کے سی ڈے نے اور ریکارڈ میں کے ایل سہگل نے گایا:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اندھے کی لاٹھی تو ہی ہے تو ہی جیون اجیارا ہے

سنہ ۱۹۳۶ء کے دوران فلم کی دنیا میں ایک انقلاب آیا اور یہ انقلاب اشوک کمار کی صورت میں آیا۔ اب تک فلموں میں اداکاری وہی تھیٹر کے انداز میں ہوا کرتی تھی۔ پر زور مکالمے، اُن کی پرجوش ادائیگی، ویسے ہی گانے، ویسا ہی اٹھنے بیٹھنے کا انداز، بلکہ شروع شروع میں تو یہ ہوا کہ فلم کے سیٹ پر تھیٹر کے منظر پیش کئے جاتے تھے اور ایک طرف کھڑا کیمرہ انہیں فلم بند کئے جاتا تھا۔

پھر ایک روز یہ ہوا کہ بمبئ کے اسٹوڈیو بامبے ٹاکیز میں فلم 'جیون نیا' بن رہی تھی جس کے بڑے اداکار وہی تھیٹر کے معروف کردار نجم الحسین تھے۔ وہ بیمار پڑ گئے اور اب نئے ہیرو کی تلاش شروع ہوئی۔ اسی دوران ڈائریکٹر ہمانشو رائے کی نظر نوجوان لیبارٹری اسسٹنٹ اشوک کمار پر پڑی۔ انہیں راتوں رات اداکار بنا دیا گیا اور پھر تو ان کی اداکاری کا سلسلہ کوئی ساٹھ سال چلا۔ ان کی فلموں کو شمار کرنا مشکل ہے۔

اشوک کمار نے وہ تھیٹر جیسی اداکاری ترک کر کے فطری اور قدرتی انداز میں مکالمے ادا کئے جنہیں ناظرین نے فوراً ہی قبول کر لیا۔ فلم 'جیون نیا' تو خدا جانے کیا ہوئی لیکن ان کی دوسری فلم 'اچھوت کنیا' نے فلم کے بنیادی خیال میں انقلاب برپا کر دیا۔ ایک تو اونچی ذات کے لڑکے اور نیچی ذات کی لڑکی کی محبت نے ہندو معاشرے کی صدیوں پرانی لعنت کو للکارا۔ دوسرے یہ کہ اشوک کمار کمال کے گلوکار بھی نکلے۔

اُس وقت تک پلے بیک کا چلن عام نہ تھا۔ اداکار کو خود ہی سیٹ پر گانا پڑتا تھا۔ مائیکروفون اس کے سر کے اوپر لٹکا ہوتا تھا اور طبلے اور باجے والے سازندے وہیں کہیں آڑ میں اور کیمرے کی نگاہ سے چھپ کر بیٹھے ہوتے تھے۔

اسی کیفیت میں فلم اچھوت کنیا میں اشوک کمار اور دیویکا رانی نے وہ یادگار گانا گایا

جو کبھی نہیں مرے گا:

میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے
میں بن کا پنچھی بن کے سنگ سنگ ڈولوں رے

موسیقار سرسوتی دیوی کا کمپوز کیا ہوا اور جے ایس کشیپ ناتواں کا لکھا ہوا یہ گانا آج بھی ٹیلی ویژن پر چلتا ہے تو دلوں کو گدگداتا ہے۔ اس فلم میں خود سرسوتی دیوی کا گایا ہوا گانا اب بھی دستیاب ہے: کِت گئے ہو کھیون ہار، نیا ڈوبتی۔

سنہ ۳۶ء میں تازہ ہوا کا ایک اور خوشگوار جھونکا سریندر کی شکل میں آیا۔ سریندر نہ صرف خوش شکل تھے بلکہ خوش گلو بھی تھے۔ وہ محبوب کی فلم 'دکن کوئین' میں نمودار ہوئے جس میں انہوں نے ہندوستانی فلم کی پہلی یادگار غزل گائی:

یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں
یار کی بزم ناز میں گزری ہوئی جوانیاں
تیری بلا سے جانِ جاں روتے ہیں ہم تو کیا ہوا
عشق میں یوں ہی بے سکوں کٹتی ہیں زندگانیاں
آپ کو مجھ سے عشق تھا اس لئے آپ چپ رہے
کہتی رہی دبی زباں آپ کی بے زبانیاں

یہ غزل ضیا سرحدی نے لکھی تھی اور اس کی طرز پران سُکھ نایک نے ترتیب دی تھی۔

دکن کوئین بمبئی اور پونا کے درمیان چلنے والی ایک تاریخی ریل گاڑی ہے لیکن اس فلم کا اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس میں جس جوان لڑکی کی جائیداد ہتھیا لی گئی تھی اُس نے اپنا حق واپس لینے کے لئے تنگ آمد بجنگ آمد کا رویّہ اختیار کیا۔ فلمساز محبوب کی بقول شخصے مار دھاڑ سے بھرپور یہ پہلی اور آخری فلم تھی۔

اسی برس سہگل نے فلم پجارن میں اپنا مشہور گانا گایا:

جو بیت چکی سو بیت چکی　　اب اسکی یاد ستائے کیوں

اور اُسی سال اشوک کمار نے فلم جیون نیا میں ایک نغمہ گایا جسے اُس وقت دنیا بھول گئی:

کوئی ہمدم نہ رہا کوئی سہارا نہ رہا

لیکن تقریباً چوتھائی صدی بعد ان کے چھوٹے بھائی کشور کمار نے بڑے بھائی کی اجازت سے اپنی فلم جھمرو میں یہی گانا دوبارہ گایا۔ انہوں نے اس کے نئے بول مجروح سلطان پوری سے لکھوائے جنہیں میں اپنے دور کا سب سے بڑا نغمہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔

کوئی ہمدم نہ رہا کوئی سہارا نہ رہا ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
شام تنہائی کی ہے آئے گی منزل کیسے جو مجھے راہ دکھائے وہ ستارا نہ رہا
کیا بتاؤں میں کہاں یوں ہی چلا جاتا ہوں جو مجھے پھر سے بُلائے وہ اشارا نہ رہا

یوں غزل اپنی پوری آب وتاب سے فلم میں در آئی اور یوں شاعر نے گفتگو عوام سے کی۔

یہ بات آگے چل کر تفصیل سے ہوگی، انشاءاللہ۔

لے بابل گھر آپنا، میں چلی پیا کے دیس

۱۹۳۷ء میں پانچ چھ فلمیں ہی اپنے پیچھے اپنا نام چھوڑ سکیں۔ ان میں بھی کلکتے کا نیو تھیٹرز ہی آگے آگے رہا اور سہگل اور پنکج ملک کے علاوہ اس بار کانن دیوی بھی نمایاں رہیں جنہیں لوگ کانن بالا پکارا کرتے تھے۔

فلم 'مکتی' پی سی بروا نے بنائی جس کے گانے آرزو لکھنوی اور اصغر حسین شورؔ نے لکھے اور طرزیں پنکج ملک نے بنائیں، جنہوں نے فلم میں اداکاری بھی کی۔ مکتی کے نصف درجن سے زیادہ گانے آج بھی سننے میں آتے ہیں خصوصاً کانن کی آواز میں یہ غزل جس کی طرز آر سی بورال نے بنائی اور سازینے کی نگرانی پنکج ملک نے کی۔ اس کی ریکارڈنگ آج بھی اچھے ساؤنڈ سسٹم پر سُنی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ گانے کے ساتھ ساتھ ساز بھی کیسی نفاست سے آراستہ کیے گئے ہیں۔ کانن کا ذرا سا بنگالی لہجہ سن کر گانے پر ویسا ہی پیار آتا ہے جیسے نئے نئے چلتے ہوئے بچّے کو دیکھ کر:

کیسا اجڑا چمن خوشی کا، کیسا نصیبہ پھوٹ گیا
پھول بھی رخصت، بو بھی رخصت، رنگ بھی گل کا چھوٹ گیا
جبر پہ بھی تو وفا کا پُتلا گھر سے نکلا دل سے نہ نکلا
اس کی للک ہے اب بھی باقی دیکھنے میں تو چھوٹ گیا
کچھ جو پتہ بھی اس کا پائے کیا منہ لے کر سامنے جائے

آئے گا وہ کیوں لاکھ بُلائے، یہ بھی سہارا ٹوٹ گیا

اس طرح فلم مکتی کا ایک سریلا نغمہ وہی کانن کے مخصوص لہجے میں آج بھی دلوں کو گرماتا ہے۔ بنگال کی سرزمین پر ایک بنگالی گلوکارہ کی زبان سے لفظ 'محو' کس خوبی سے ادا کرایا گیا ہے:

کیا یوں ہی ہوتی ہے الفت، کیا یوں ہی آتا ہے دل
دیکھتے ہی اُن کی صورت محو ہو جاتا ہے دل
نہ جانے کیا ہے دل کا راز سوز یہ ہے یا ساز
اَور کوئی کیوں کر پہچانے اپنا بھید وہ خود بھی نہ جانے
کون ہے یہ انداز

اس کے علاوہ کانن دیوی کا یہ نغمہ بھی بہت مقبول ہوا:

سانوریا من بھایا رے آنکھ سے من میں سمایا

مُکتی میں پنکج ملک کے دوگانے قابل ذکر ہیں: شرابی سوچ نہ کر متوالے، اورکون دیش ہے جانا بابوکون دیش ہے جانا۔ فلم میں غالب کی غزل 'کوئی امید بر نہیں آتی' بھی شامل ہے جس پر غالباً آرزو صاحب نے گرہیں لگائی ہیں مگر یہ سب سننے میں نہیں آتا۔ فلم کے وڈیو میں ضرور مُوجود ہوگا۔

اس کے علاوہ نیو تھیٹرز نے نِتن بوس کی فلم 'پریذیڈنٹ' جاری کی۔ اس کی موسیقی بھی آر سی بورال اور پنکج ملک نے آراستہ کی اور اس میں راجا کے بیٹے کی وہ کہانی بہت مقبول ہوئی جو سہگل نے بچوں کو سنائی تھی اور جس کے بول کچھ یوں تھے:

اک راجے کا بیٹا لے کر اڑنے والا گھوڑا دیش دیش کی سیر کی خاطر اپنے گھر سے نکلا
اڑتے اڑتے چلتے چلتے تھکے جو اس کے پاؤں تو اک جا پر بیٹھ گیا وہ دیکھ کے ٹھنڈی چھاؤں
اتنے میں ہونی نے اپنی بنسی وہاں بجائی جس کو سن کر پریوں کی شہزادی دوڑی آئی
اچھا بچّو، جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوا اس کے بعد بہت دیر تک آپس میں دونوں
جی بھر کر کھیلے

دونوں نے کھائے مل جُل کر سیب انار اور کیلے اچھا بچّو، اگر تمہیں وہ شہزادی مل جائے تو اس کے ساتھ کھیلو گے؟

وہ بچوں کو بڑی عمدہ عمدہ چیزیں کھلاتی ہے کہوہاں (یہاں سہگل کِھل کھلا کر ہنستے ہیں)

اسی طرح فلم پریذیڈنٹ میں سہگل کا یہ گانا بھی خوب تھا: اک بنگلہ بنے نیارا رہے کنبہ جس میں سارا۔ تیسرا گانا اتنا ہی سنجیدہ ہے: پریم کا ہے اس جگ میں پنتھ نرالا، پریم تو ہے دنیا میں کارن دکھ کا۔

نیو تھیٹرز کی اس سال تیسری فلم 'ودیا' بنی تھی جس کے ہیرو اپنے وقت کے خوب رو اداکار پرتھوی راج تھے اور اداکاری میں کانن اور کے سی ڈے بھی شامل تھے۔ جن کے دو گانے مشہور ہوئے: گوکل سے گے گردھاری، ہوئی سونی نگری ساری۔ اور پنگھٹ پہ کنہیا آتا ہے، آکر دھوم مچاتا ہے۔

ودیا ہی میں کانن دیوی کے چند گانے آج بھی سنے جاتے ہیں:

۱۔ دیکھت ہیں اب باٹ پیا کی جل سے بھرے مورے نین
کس بِدھ کٹے بیوگ کی گھڑیاں کیسے آئے موہے چین

۲۔ ہمری نگریا میں آئے بسو بنواری
بھانت بھانت کے پھول کھلے ہیں رت آئی اتی پیاری

۳۔ مورے انگنا میں آئے عالی، میں چال چلوں متوالی
جب آنچل ہمرا پکڑے ہم ہنس ہنس اُن سے جھگڑے
چولی پہ نجریا جائے موری چنری لپٹ موسے جائے
مورے انگنا میں آئے عالی
وہ اور بڑھنے، مورے پیّاں پڑے کیسے مانوں بات تمہاری
میں آہ پھیر کہوں، نہیں مانوں گی بات تہاری
مورے انگنا میں آئے عالی

۴۔ ڈولے ہردے کی نیّا، پگ دھرت ڈرے ہے کھویّا

یہ سارے گانے کیدار شرما نے لکھے تھے۔

نیو تھیٹرز کی ایک اور فلم 'ادھیکار' کے نغمے اِدھر اُدھر ہو گئے ورنہ ان میں آرزو اور رشید نے دلکش بول لکھے تھے اور تمر برن جیسے موسیقار نے دھنیں بنائی تھیں۔ فلم میں آرزو لکھنوی نے غزل لکھی جسے پنکج ملک، پہاڑی سانیال اور پرتاب مکرجی نے گایا:

عیش والوں سے غریبی کی مصیبت نہ کہو　　زخم کی طرح ہنسو درد کی حالت نہ کہو

فلم میں ایک نہایت سریلا نغمہ پنکج ملک کی آواز میں تھا:

برکھا کی رات آئی منوا　　ہر لے من کا بھار
گرجت سنکٹ کا بادروا　　دکھ کی پڑت پھوہار

اس فلم میں اسی انداز کا ایک اور گانا پہاڑی سانیال نے گایا تھا:

سہاگ کی رات آئی سجنی　　کاہے بھرے تورے نینا

یہ فلم ۱۹۳۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ وہی برس جس میں نیو تھیٹرز کلکتہ نے 'دھرتی ماتا' اور 'اسٹریٹ سنگر' جیسی مقبول فلمیں نمائش کے لیے پیش کیں جن کے گانے آج بھی گونج رہے ہیں، گلیوں میں نہیں تو کانوں میں۔

دھرتی ماتا کے میوزک ڈائریکٹر پنکج ملک تھے۔ آپ کو یاد ہوگا پنکج اپنی نوجوانی میں خاموش فلموں کے ساتھ سینما ہال میں موجود آرکسٹرا کو کنڈکٹ کیا کرتے تھے۔ اُس دوران انہیں مشرقی اور مغربی سازوں سے دھنیں آراستہ کرنے کا ہنر خوب آ گیا تھا۔ بعد میں تو وہ خود بھی ایسے گانے گانے لگے تھے جن کی طرزوں پر مغربی ہونے کا گمان ہوتا تھا: 'یاد آئے نہ آئے تمہاری' اس کی ایک مثال ہے۔ فلم دھرتی ماتا کے گانے ہندی کے بہت بڑے شاعر پنڈت سُدرشن نے لکھے تھے۔ غرض یہ کہ کلکتے والے فلمساز موسیقی پر چھائے ہوئے تھے کیونکہ رہی سہی کسر سہگل کے سروں نے پوری کر دی تھی۔ اس بات پر بمبئی والے پریشان بھی تھے اور برہم بھی۔

دھرتی ماتا میں سہگل کے علاوہ خود پنکج ملک، کے سی ڈے اور اوما ششی نے گانے گائے اور وہ گانے آج تک چلتی ہوئی نبض جیسے ہیں، زندگی کی علامت۔

۱۔ دنیا رنگ رنگیلی بابا　　دنیا رنگ رنگیلی
یہ دنیا اک سندر بگیا　　شوبھا اس کی نیاری ہے
ہر دھرتی پر جادو چھایا　　ہر ڈالی متواری ہے
اَد بھُت پنچھی پھول منوہر　　کلی کلی چٹکیلی بابا
دنیا رنگ رنگیلی　　(پنکج، اوما اور سہگل)

۲۔ میں من کی بات بتاؤں　　کیا کیا بات اُٹھت من مورے
سب کہہ کر سمجھاؤں　　میں من کی بات بتاؤں
(اوما ششی اور سہگل)

۳۔ کس نے یہ سب کھیل رچایا　　کس نے یہ سب ساج سجایا
اپنے آپ سبھی کچھ کر کے　　اپنا آپ چھپایا (کے ایل سہگل)

۴۔ اب میں کاہ کروں کِت جاؤں　　میں کاہ کروں کت جاؤں
چھوٹ گیا سب ساتھ سہارا　　اپنے بھی کر گئے کنارا
اک بازی میں سب کچھ ہارا　　آشا ہاری ہمت ہاری
اب کیا داؤ لگاؤں　　میں کاہ کروں کِت جاؤں
(کے ایل سہگل)

اس کے بعد نیو تھیٹرز والوں نے فلم اسٹریٹ سنگر جاری کی۔ موسیقی ترتیب دینے کے لیے آر سی بورال جیسے موسیقار کو چنا اور نغمے لکھنے کے لئے کلکتہ کو آباد کرنے والے لکھنو کے آرزو صاحب کا انتخاب ہوا۔ اداکاروں میں سہگل اور کانن سر فہرست تھے:

۱۔ پریتم سے پریت نبھاؤں گی (کانن)

۲۔ پنچھی مورت درس دکھائے، سر پر مکٹ گلے میں مالا، من للچائے، ہے کیا کوئی سہاون سپنا، دھن مایا سب اپنا اپنا، نہیں نہیں کھلی آنکھ میں، سپنا کہاں سمائے (کانن)

۳۔ جیون بین مدھر نہ باجے، جھوٹے پڑ گئے تار، بین کے جھوٹے پڑ گئے تار
(سہگل)

۴۔ اور یہ آخری گانا اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک سہگل کا نام رہے گا۔

ایک روایت کے مطابق اس کے بول تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے لکھے تھے اور بھیرویں میں اس کی طرز بھی یقیناً ان ہی کی ایجاد تھی۔ ایسے گانے والے سہگل پہلے گلوکار نہیں تھے۔ میں نے غالباً ملکہ جان کی آواز میں یہی نغمہ سنا ہے جس میں انہوں نے ایک عورت کا کرب بھرا تھا۔ سہگل نے ان ہی کے انداز میں گایا ہے۔ اس کے الفاظ توجہ کے قابل ہیں:

بابل مورا نئی ہر چھوٹو ہی جائے — چار کہار مل موری ڈولیا سجاویں
مورا اپنا بیگانا چھوٹو جائے — بابل مورا نئی ہر چھوٹو جائے
انگنا تو پربت بھیا اور دہری بھئی بدیس — لے بابل گھر آپنا' میں چلی پیا کے دیس

ادھر کلکتے میں فلم اسٹریٹ سنگر بنی، اُدھر بمبئی میں گراموفون سنگر بن کر تیار ہوئی۔ کلکتے میں سہگل چھائے ہوئے تھے۔ بمبئی والوں کو اپنے سہگل کی تلاش تھی جسے محبوب صاحب نے ڈھونڈ نکالا۔ سریندر نہ صرف سریلے تھے بلکہ خوب رو بھی تھے۔ آواز ان کی سہگل جیسی تو نہ تھی مگر اتنی بری بھی نہیں تھی۔

سریندر فلم دکن کوئین اور من موہن میں اپنی دھاک بٹھا چکے تھے۔ سنہ ۳۸ء میں ساگر فلم کمپنی، بمبئی نے انہیں فلم گراموفون سنگر کے لئے چنا۔ اُن کے ساتھ اپنے وقت کی مقبول اداکارہ بِبّو تھیں۔ فلم کے نغمے ضیا سرحدی نے لکھے اور میوزک ڈائریکٹر بنگال کے انل بسواس تھے، جو اب بمبئی جا کر بس گئے تھے۔ جس طرح فلم من موہن میں ان کا اور بِبّو کا دوگانا 'تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا، سوئے ہوئے ہردے کو جگایا'۔ بقول ضیا سرحدی مرحوم، سوپر ہٹ ہو چکا تھا اسی طرح گراموفون سنگر میں سریندر کے ایک نغمے نے شہرت پائی:

"کاہے اکیلا ڈولت بادل، موہے بھی سنگ لے جا۔"

۱۹۳۸ء کی اس فلم میں زہرہ بائی انبالے والی پہلی بار شریک ہوئیں اور دو ایک گانے گائے۔ وہ عام طور سے پرائیویٹ گانے گاتی تھیں اور صحیح معنوں میں گراموفون سنگر تھیں مگر ان کی تقدیر میں شہرت موسیقار اعظم نوشاد علی کے ہاتھوں لکھی۔ اُن کا ذکر آگے چل

کر آئے گا۔

سنہ ۳۸ء کا ذکر ہم مدھوک صاحب کے لکھے ہوئے ایک نغمے پر ختم کریں گے جو آج بھی پرانے گانوں کے ذخیروں میں مل جاتا ہے۔ کرشن مووی ٹون بمبئی کی فلم زمانہ میں یہ غزل امیر جان نے گائی تھی:

اے درد ذرا دم لے، کروٹ تو بدلنے دے
ارمان بھرے دل کو پہلو میں سنبھلنے دے

یہ برس تمام ہوا۔ دنیا پر دوسری عالمی جنگ کے بادل چھانے لگے جو کلکتے کی فلمی صنعت کو کچھ زیادہ راس نہ آئے البتہ فلم کی رونق اپنا بوریا بستر اٹھا کر سوئے بمبئی سدھاری۔ اس کا ذکر کچھ دیر بعد۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

سنہ ۱۹۳۹ء میں فلمی موسیقی کے تیور بدلنے شروع ہوئے۔ اس سال سی رام چندر کا نام سامنے آیا۔ وہ فلم گناہ گار عرف دی کریمنل میں موسیقار اے حسین کے معاون تھے۔ وہ آگے چل کر فلمی گانوں میں نئی روح پھونکنے والے تھے۔ اس فلم کے گانے احسان رضوی نے لکھے تھے۔

اسی برس سپریم پکچرز، بمبئی نے فلم غازی صلاح الدین بنائی، جس کے موسیقار کھیم چند پرکاش تھے۔ جن کی زندگی کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم کے لئے انہوں نے غالب کی ایک غزل پر طرز بٹھائی اور اُسے کلیانی کی آواز میں ریکارڈ کیا، سننے کے قابل ہے۔ اس کا غالباً جدید ورژن انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں کر کے اپنے آپ شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبہء دل کی مگر تاثیر الٹی ہے — کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

www.hummaa.com/music/artist/1430/khemchandprakash/charts

کھیم چند پرکاش نے جن فلموں کی موسیقی ترتیب دی ان میں قابل ذکر فلمیں ہیں: میری آنکھیں، ہولی، پردیسی، تان سین، سیندور، بھرتری، آشا، ضدّی، جان پہچان اور

فلم محل۔

آگے چلنے سے پہلے فلم غازی صلاح الدین کے ایک اور گانے کا ذکر ضروری ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں سبھی نے گایا۔ اس کے بول تھے:

اللہ باقی، مِن کُلِّ فانی

ادھر کلکتے میں نیو تھیٹرز بدستور نہایت عمدہ موسیقی سے آراستہ فلمیں پیش کر رہا تھا کیونکہ وہاں کانن جیسی گلوکارہ اور آرزو لکھنوی جیسے شاعر موجود تھے۔ سنہ ۳۹ء میں ان کی فلم جوانی کی ریت نمائش کے لئے پیش کی گئی جس میں کانن دیوی کے چار گانوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، فلم کے میوزک ڈائریکٹر آر سی بورال تھے:

۱۔ کون من لبھایا، کیسے من میں آیا
۲۔ بن میں بھی جو مہکے پھول، روپ سہانا ہی ہوگا
۳۔ لوٹ لیو من دھیر، کون رسیا مورے رے من بھایا
۴۔ چلی پون ہر سوں، مہک رہی سرسوں

نیو تھیٹرز کی فلم کپال کنڈلا کے گانے بھی مشہور ہوئے۔ اس مرتبہ موسیقار، اداکار اور گلوکار پنکج ملک تھے، جن کے لئے نغمے آرزو صاحب نے لکھے۔ فلم کا ایک گانا امر ہو گیا:

پیا ملن کو جانا جگ کی لاج،
من کی موج دونوں کو نبھانا
کانٹے بکھرا کے چلوں پانی ڈھلکا کے چلوں
سکھ کے لئے سیکھ رکھوں پہلے دکھ اٹھانا

پنکج کی آواز میں ایک اور نغمہ مقبول ہوا: یوں درد بھرے دل کی آواز سنائیں گے

ادھر بمبئی سے ایک اور یادگار فلم 'کنگن' جاری ہوئی۔ بامبے ٹاکیز کی اس پیشکش کے پروڈیوسر فرانز آسٹن تھے جو جرمن باشندے تھے لیکن جنھوں نے اپنی زندگانی ہندوستان کی فلمی صنعت میں کھپا دی۔ کنگن کے بڑے اداکار اشوک کمار اور لیلا چٹنیس تھیں اور کوی پردیپ نے پہلی بار چند گیتوں کے بول لکھے تھے:

۱۔ میں تو آرتی اتاروں رادھے شیام کی رے

۲۔ رادھا رادھا پیاری رادھا پریم اگادھا

۳۔ ہواتم دھیرے بہو، میرے آتے ہوں گے چت چور

۴۔ سونی پڑی رے ستار، میرا کے جیون کی

۵۔ کیوں بجے ہردے بینا کے تار، مرجھائی من کی بگیا میں

سنہ ۳۹ء کا ایک نغمہ میں نے کمسنی میں سنا تھا پر آج تک یاد ہے۔ فلم ٹھوکر میں اس گانے کی طرز گیان دت نے بنائی تھی اور اس کے بول پیارے لال سنتوشی نے لکھے۔ وحیدن بائی اس کے اداکاروں میں شامل تھیں اور نغمہ اُن ہی کے سُروں میں تھا:

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
روز آتا ہے مرے دل کو تسلّی دینے
تجھ سے تو دشمنِ جاں تیرا خیال اچھا ہے

لیکن اُس برس جس فلم نے بڑا دھا کہ کیا وہ مزوا مووی ٹون کی تاریخی تصویر پکار تھی۔ یہ فلم سہراب مودی نے بنائی تھی۔ نغمے کمال امروہوی نے لکھے جو اُس وقت تقریباً بیس سال کے تھے اور طرزیں میر صاحب نے بنائی تھیں۔ پری چہرہ نسیم نہ صرف ملکہ نور جہاں بنی تھیں بلکہ اپنے نغمے انہوں نے خود ہی گائے تھے۔ سہراب مودی اور چندر موہن نے جہانگیر کے دربار کے دبدبے کی جیسی تصویر کھینچی وہ تو شاید حقیقت سے بھی کچھ بڑھ کر تھی۔ پکار کی تیاری میں غیر ملکی ماہروں کا ہاتھ بھی تھا۔ اس کے پرنٹ بحفاظت موجود ہیں۔ جن میں اب رنگ بھی بھر دیا گیا ہے۔

فلم پکار کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں اردو نظم اور غزل نے اڑان بھرنے کے لئے پوری طرح پر پھیلائے۔ مصرعے سج دھج کے ساتھ آراستہ ہوئے، یوں روایتی غزل اور جدید نظم کی خوبیوں کو فلم کے پردے پر پیش کرنے کی پہل ہوئی اور پھر تو یہ سلسلہ نصف صدی تک چلا۔ اپنی اس تحقیق میں معاملے کے اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

فلم پکار کا ایک نغمہ تو ضرب المثل بن گیا: زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے، بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔ لیکن اس کا ایک نغمہ جو حمد کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اُس وقت بھی توجہ کا طالب تھا، آج بھی ہے:

دل میں تو، آنکھوں میں تو، سانسوں میں تو
لب پہ تو، پیالوں میں تو، خوابوں میں تو
صبح کے انگڑائیاں لیتے ہوئے جلوؤں میں تو
دوپہر کے جگمگاتے آتشیں شعلوں میں تو
بھینی بھینی شام کے رنگین نظاروں میں تو
رات کی موتی بھری گھنگورسی زلفوں میں تو
دل میں تو___
آندھیوں کے رات بھر آتے ہوئے جھونکوں میں تو
بارشوں کی جگمگاتی ان گنت لڑیوں میں تو
نور سے دھوئے ہوئے مہتاب کے چہرے میں تو
آگ سے دہکے ہوئے سورج کے رخساروں میں تو
دل میں تو___

پکار کے باقی گانے بھی ابھی تک سننے میں آتے ہیں:

۱۔ گیت سنو وہ گیت (شیلا)
۲۔ تم بن ہمری کون خبر لے (شیلا)
۳۔ دھوئے مہوبے گھاٹ (سردار اختر)
۴۔ زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے (نسیم بانو)
۵۔ عید کی ساعتیں، مبارک ہوں (کورس)

یہ آخری گانا اب فلم سے نکال دیا گیا ہے۔

منروا مووی ٹون نے پکار کے بعد فلم 'میں ہاری' بنائی۔ گانے کمال امروہوی سے

لکھوائے ۔ میوزک ڈائریکٹر کے طور پر میر صاحب کو لیا گیا اور ہیروئن کا کردار وہی پکار والی پری چہرہ نسیم بانو کو دیا گیا۔ فلم اپنے چھ گانوں سمیت گمنامی کے اندھیروں میں کھو گئی۔

یہ سنہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ اس برس مسافر میں خورشید کی آواز میں گانے بھی ریکارڈ کئے گئے ۔ صرف ایک گانے میں کچھ دم تھا: 'رُت بسنت کی آئی پیا، نہیں لاگے جیا گھر آ جا۔' اس فلم کا ایک گانا مجھے یاد ہے ہمارے گھر میں سب مل کر گایا کرتے تھے: 'رادھا رانی روٹھی، گھنشیام منائے، بولو ہاں، بولو ہاں۔' البتہ مسافر کا جو گانا مقبول ہوا وہ نور محمد چارلی کی آواز میں تھا: 'کھٹمل کی یہ بستی ہے مچھر کا ٹھکانا، ہائے ہائے ری مری ماں۔' فلم میں ایک کامیڈین کو شامل کرنے کی روایت تھیٹر کے زمانے سے چلی آ رہی تھی جسے مسخروں والے دو ایک گانے بھی گانا پڑتے تھے۔ چارلی اپنے وقت کے مقبول کامیڈین تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے اور گمنام ہو گئے۔

ادھر کلکتے میں نیو تھیٹرز نے دو فلمیں خود بنائیں اور ایک فلم ایسوسی ایٹڈ پروڈکشن کی جاری ہوئی جس کا نام زندگی تھا۔ اس کے موسیقار کے سی ڈے تھے اور زیادہ تر گانے آرزو صاحب نے لکھے تھے۔ سارے کے سارے گمنام رہے۔

خود نیو تھیٹرز نے اپنی دو فلمیں نرتکی اور زندگی جاری کیں۔ نرتکی میں میوزک ڈائریکٹر پنکج ملک نے آرزو صاحب کا لکھا ہوا گانا گایا: 'مدھ بھری رت جوان ہے۔' لیکن اُن کا جو نغمہ امر ہو گیا اس میں آرزو لکھنوی کا وجود پوری طرح نظر آتا ہے:

یہ کون آج آیا سویرے سویرے — کہ دل چونک اٹھا سویرے سویرے
کہا روپ نے چاند ہے چودھویں کا — مگر چاند کیسا سویرے سویرے
گیا من کا دھیرج بڑھی بے کلی بھی — یہ مجھ کو ہوا کیا سویرے سویرے
آتے ہی ایک طرح دار نے دل چھین لیا — دل رُبا بن کے دل آزار نے دل چھین لیا
بانکی چتون کے چھپے پیار نے دل چھین لیا — دے کے دھوکا کسی عیار نے دل چھین لیا
آنکھوں میں جادو باتوں میں ٹونا — دیا کیسا چرکا سویرے سویرے

اس طرح کے مصرعے لکھنے اور ایسی گرہیں لگانے کا کام لکھنؤ ہی کا شاعر کر سکتا

تھا۔اس گانے میں اردو شاعری پر خوب روپ اترا۔نرتکی کا ایک اور گانا مقبول ہوا:

'پریم کا ناتا چھوٹا، ناتا چھوٹا پریم نہ چھوٹا، بات کا پالن ٹوٹا'

فلم زندگی میں سہگل نمودار ہوئے اور پنکج ملک کے سجائے ہوئے سروں میں کیدار شرما کے لکھے کچھ نغمے گائے:

۱۔ میں کیا جانوں کیا جادو ہے — ان دو متوالے نینوں میں جادو ہے

۲۔ سو جا راجکماری سو جا — سو جا میں بلہاری سو جا

۳۔ دیوانہ ہوں دیوانہ ہوں — راحت سے میں بیگانہ ہوں

دل کو کیسے بہلاؤں میں — یہ زخم کسے دکھلاؤں میں

آنسو سن سن کر ہنستے ہیں — کیا درد بھرا افسانہ ہوں

آئی نہ بہار، خزاں ہی سہی — اجڑے دل میں ارماں ہی سہی

حیراں ہوں کہ آخر کیا ہوں میں — آباد ہوں یا ویرانہ ہوں

گھائل ہوں تم سے دور ہوں میں — پر پھونک چکا مجبور ہوں میں

اے شمع بلائیں لے آ کر — آخر میں بھی پروانہ ہوں

گویا اب وہ دادرے جیسے بول لکھنے کا رواج رخصت ہو رہا تھا اور کیدار شرما بھی جو اگر چہ مانے ہوئے شاعر نہ تھے، آرزو صاحب کے انداز میں نغمے لکھ رہے تھے۔

ان ہی دنوں فلم جے سودیش میں احمد دلاور کی آواز میں جگر کی غزل شامل کی گئی: اک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے۔ اسی طرح فلم قیدی میں غالب کی دو غزلیں شامل ہوئیں: دل ہی تو ہے سنگ وخشت اور رہیئے اب ایسی جگہ چل کر۔

فلم انار بالا میں اختری بائی نمودار ہوئیں اور فلم ہولی میں ستارا کا ایک گانا عام ہوا: پھاگن کی رت آئی رے، ذرا باجے بانسری۔ اسی طرح نجم نقوی کی فلم پُنرملن کے چند گانے گھر گھر گائے گئے۔

۱۔ ناچو ناچو پیارے من کے مور

۲۔ آؤ بنائیں گھروا پیارا، پیارا پیارا جگ سے نیارا

بامبے ٹاکیز نے اُس سال پُنر ملن کے علاوہ ایک اور فلم جاری کی جس کے نغموں نے بڑی شہرت پائی۔ فلم کا نام تھا بندھن اور اس کے گانے پردیپ نے لکھے تھے۔ اداکاروں میں لیلا چٹنس اوراشوک کمار کے علاوہ ان کے رشتے کے بھائی ارون کمار بھی تھے جن کا گانا 'چنے جور گرم بابو میں لایا مزے دار' آج بھی سننے میں آتا ہے۔ بندھن کا مرکزی گانا تھا: 'چل چل رے نوجوان، چلو سنگ چلیں ہم'۔ اس گانے کو ایک اور انداز میں گایا گیا 'چل چل رے نوجوان، کہنا میرا مان مان چل رے نوجوان، رُکنا تیرا کام نہیں چلنا تیری شان'۔

لیلا چٹنس کی آواز میں 'من بھاون، من بھاون لو ساون آیا رے'۔ اور 'کیسے چھپو گے اب تم کیسے چھپو گے، او سلونے ساجنا کیسے چھپو گے'۔ غرض یہ کہ اس فلم کے سارے ہی نغمے ریڈیو پر رات دن بجائے گئے اور گلی میں چنے بیچنے والے ہر شخص نے اس فلم کا گانا اختیار کیا۔

آخر میں ایک اور فلم کا تذکرہ ضروری ہے۔

فلم ساز محبوب نے اپنی مشہور فلم 'عورت' جاری کی۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت کو جو مقام حاصل ہے اس کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لئے محبوب نے یہ فلم دو مرتبہ بنائی۔ جس میں اداکارہ نرگس نے بے مثال کردار ادا کیا۔

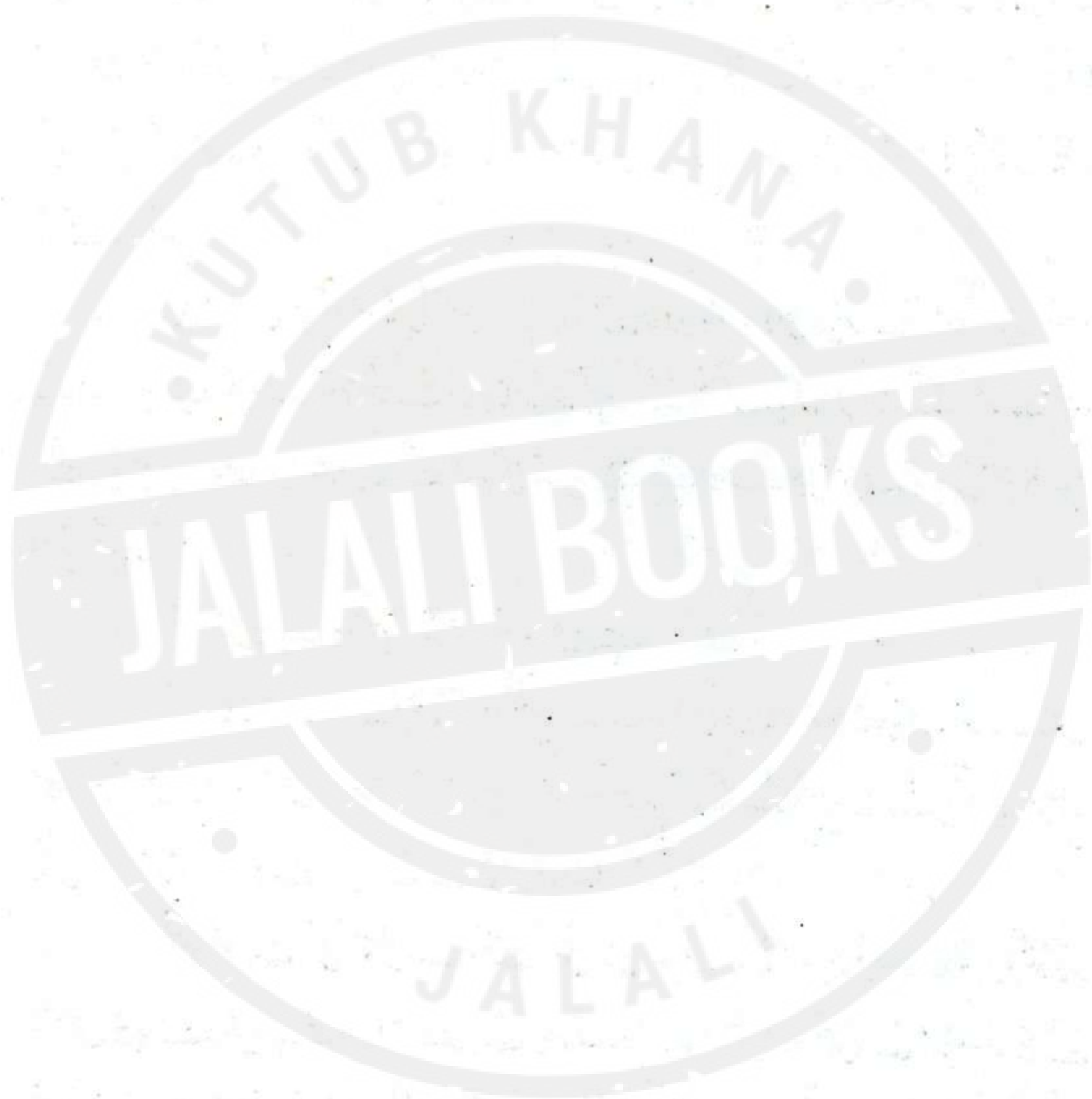
فلم 'عورت' کی تکمیل کے وقت بمبئی میں سریندر کے سوا کوئی سرکردہ مرد گلوکار مشکل ہی سے دستیاب تھا لہٰذا عورت کے میوزک ڈائریکٹر انل بسواس نے زیادہ تر گانے خود گائے۔ ان کا ایک گانا اب بھی دستیاب ہے 'کاہے کرتا دیر براتی کاہے کرتا دیر' عورت میں سریندر نے کئی گانے گائے جن میں سے دو آج بھی ملتے ہیں:

۱۔ تم روٹھ گئیں روٹھ گئیں پیاری سجنیا، بلہاری سجنیا۔

۲۔ اُٹھ سجنی کھول کواڑے، ترے ساجن آئے دوارے۔

فلم کے نغمے ڈاکٹر صفدر آہ نے لکھے تھے۔

اس کے ساتھ ہی سنہ چالیس کا عشرہ شروع ہوا جس میں گانے کا انداز بدلا گیا۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔



تصویر تری دل میرا بہلا نہ سکے گی

انگریزی میں ایک کہاوت ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ زندگی چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے۔

کم سے کم برصغیر کے گانوں کے بارے میں طے ہے کہ اُن پر شباب سنہ چالیس کے بعد آیا۔ کیا فلمی اور کیا غیر فلمی گانے، سارے کے سارے نکھر گئے۔

جب گراموفون ریکارڈ بننے شروع ہوئے تو اُن میں یا تو اُس وقت کے تھیٹر کے گانے یا پھر گانے والوں، خصوصاً طوائفوں کے وہ گانے بھرے ہوئے تھے جو بعد میں پرائیویٹ کہلائے۔

اس وقت ہم پرائیویٹ گانوں کی بات کریں گے جو فلم کے پہلو بہ پہلو ریکارڈ ہوتے اور مقبولیت کی مدارج کو چھوتے رہے۔ ایک تو اس دوران مغرب سے ریکارڈنگ کے عمدہ آلات اور برقیاتی مائیکروفون آ گئے۔ جدید ساز اور سازندے مہیا ہو گئے۔ دوسرے وہ ٹھمری دادرا کا سلسلہ ختم ہوا۔ اور نئے زمانے کے نئے انسانی جذبات اور احساسات گانوں کا موضوع بننے لگے۔

وہ گوہر جان، ملکہ جان، جانکی بائی چھپّن چھری، ماسٹر لبھو، محمد حسین اور پیارا صاحب کا دور ختم ہوا اور ذرا سوچئے کہ گلوکاری کے میدان میں کیسی کیسی ہستیوں نے قدم رکھا: سہگل، پنکج ملک، جگ موہن، جوتھیکا رائے، کملا جھریا، ایس ڈی برمن، طلعت محمود اور

مجدّ دنیازی۔ اسی طرح ہیمنت کمار، اختری بائی، ملکہ پکھراج، فیروزہ بیگم، ودیا ناتھ سیٹھ اور آخر میں کالو قوال، پیارو قوال، عظیم پریم راگی اور کلن خان قوال کے نام آتے ہیں۔ پھر قیامِ پاکستان کے بعد تو یہ فہرست اور طویل ہوئی اور روشن آرا بیگم، مہدی حسن، فریدہ خانم، اقبال بانو، غلام علی، نصرت فتح علی خاں اور امانت علی خاں جیسے نامور گلوکار موسیقی کی دنیا پر چھا گئے۔ اوّل تو یہ کوئی مکمل فہرست نہیں، دوسرے کلاسیکی راگ گانے والے ان میں شامل نہیں اور تیسری بات یہ کہ اب گفتگو غیر فلمی گانوں کی ہو رہی ہے۔

پیارو قوال اور کالو قوال کی جو نہایت عمدہ ریکارڈنگز ملی ہیں وہ ۱۹۲۰ء کے عشرے کی ہیں۔ بہت سے دوسرے فنکاروں کی طرح یہ دونوں بھی کلکتے میں آباد ہو گئے تھے۔ تو آیئے پہلے قوالوں کی بات کریں۔

پرانی قوالیوں کا مشاہدہ بہت مختلف اور دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ پیارو، کالو اور عظیم پریم راگی کسی پارٹی کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا گاتے تھے اور ان کے ساتھ تالیاں بجانے کا رواج نہیں تھا۔ کہیں کہیں تو ان کے ہمراہ جدید مغربی ساز بھی سنائی دیتے تھے۔ کلّن خان کی قوالی کے ساتھ تالیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایک ہمنوا ہوا کرتا تھا۔ کلّن کے ہر ریکارڈ پر یہی لکھا ہوتا تھا: کلّن قوال اور ہمنوا۔ مجھے تو یاد نہیں کہ کہیں اُس غریب ہمنوا کا نام بھی دیا گیا ہو حالانکہ وہ کلّن کے ساتھ اپنی آواز اور اپنے سُر اِس خوبی سے ملاتا تھا کہ بعض اوقات پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب کلّن گا رہے ہیں اور کب ہم نوا۔ بہت بعد میں حال کھلا کہ وہ پیچھے پیچھے چلنے والا قوال آگے چل کر بہت آگے نکل گیا اور بڑا قوال بنا اور وہ تھے بڑی بڑی زلفوں والے اور بیچ بیچ میں اپنی پاٹ دار آواز میں 'اللہ' کا نعرہ لگانے والے غلام فرید صابری قوال۔

ان چار بڑے قوالوں کا گایا ہوا جو کلام اب تک دستیاب ہے اس پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

کالو قوال

۱۔ دعا میکش نے دی ہے پی کے پیمانہ محمدؐ کا — قیامت تک رہے آباد میخانہ محمدؐ کا

۲۔ محمدؐ جو رو کر دعا مانگتے ہیں — خدا سے خدا جانے کیا مانگتے ہیں

۳۔ نام احمدؐ کے صدقے اتر جائیں گے — زندگی میں یہ اک کام کر جائیں گے
ہم مزار محمدؐ پہ مر جائیں گے
۴۔ حق دار امّت والے تم پہ لاکھوں سلام
۵۔ امّت پہ سخت گھڑی ہے — یہ کشتی ڈوب رہی ہے
اب تم ہی ہو کھیون ہار نبیؐ — تم رب کے راج دلارے
۶۔ یا محمدؐ اللہ والے جاؤں تم پہ میں نثار

پیارو قوال

۱۔ آرزو ہے کہ مری قبر ہو مسجد کے قریب — بعد مرنے کے بھی سنتا رہوں میں ذکر حبیبؐ
۲۔ اللہ اللہ ساری خدائی اُس پر واری — پیر و پیمبر اس کے بھکاری
کیوں نہ ہو پوری آس ہماری — اللہ ہے سرور
۳۔ دوریٔ طیبہ مرے دل پہ مصیبت ڈھائے ہے — حسرت دیدار رہ رہ کر مجھے تڑپائے ہے
۴۔ خدا کے سامنے جب سر جھکانا التجا کرنا — مدینے کا مسافر ہوں میرے حق میں دعا کرنا
نہ رستے کی خبر مجھ کو نہ میں واقف مدینے سے — خدا جانے کہاں پہنچوں اتر کر میں سفینے سے
جہاں تک ہو سکے اس رسم الفت کو ادا کرنا — مدینے کا مسافر ہوں میرے حق میں دعا کرنا
۵۔ جنت جسے کہتے ہیں وہ یثرب کی گلی ہے — یثرب میں جو مر جائے وہ بے شبہ ولی ہے
یہ بات مرے دل سے محبت نے کہی ہے — مجھ کو در محبوبی پہ مرنے کی خوشی ہے
۶۔ اللہ یہ مظلوم توحید کا پسر ہے — سر تاج بشر ہے
اولادِ محمدؐ ہے شہِ جن و بشر ہے — زہرہ کا جگر ہے (نوحہ)
۷۔ وہ چلچلاتی دھوپ وہ میدان کربلا — وہ گرم گرم لو وہ بیابان کربلا
وہ کالی کالی رات وہ مہمان کربلا — وہ چلتی چلتی تیغ وہ طوفان کربلا
کس کس طرح لٹے ہیں شہیدانِ کربلا

یہ آخری نوحہ حد درجہ پُر اثر ہے، پیارو قوال کی آواز سوز میں ڈوبی ہے اور اس کے

ساتھ کسی بڑے فنکار نے گٹار بجایا ہے جس نے اس کی تاثیر دو چند کر دی ہے۔

عظیم پریم راگی

عظیم پریم راگی اپنے وقت کے بڑے قوال تھے۔ شاعر تھے اور اپنا کلام خود کہتے تھے۔ ان کی ایک قوالی " سکھی ری ڈولی میں ہو جا سوار " نے وہ شہرت پائی کہ سب سے بڑی گراموفون کمپنی نے جو ہز ماسٹرز وائس کے نام سے ریکارڈ بناتی تھی عظیم پریم راگی کے ریکارڈ بنانے چاہے مگر ہمارے قوال کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ان کے دینی کلام کے ریکارڈ پر کتے کی تصویر بنی ہو چنانچہ معاملہ طے نہ ہو سکا اور بمبئی کی ایک اور ریکارڈنگ کمپنی نے ایسے ریکارڈ بنانے کی پیشکش کی جن پر ڈاک کے ٹکٹ کی طرح خود عظیم میاں کی تصویر چھپی ہو۔ اس کے بعد ان کے سارے ریکارڈ اسی شان سے بنے۔

عظیم پریم راگی نے درجنوں قوالیاں ریکارڈ کرائیں۔ ان کی ایک قوالی کے بارے میں مشہور ہے کہ بانی پاکستان محمد علی جناح کی فرمائش پر لکھی گئی جس کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنا تھا۔

یہاں ہم ان کی چند قوالیوں پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

۱۔ سکھی ری ڈولی میں ہو جا سوار ابھی دور ہے پیا کا دوار
کنبہ قبیلہ چھوڑ کے واری اصلی گھر کی کر تیاری
یوں نہ سمجھنا اکیلی سدھاری سب ہی چلیں گے باری باری
چار کے کاندھے سوار سکھی ری ڈولی میں ہو جا سوار

۲۔ بیمار ترے موت سے لیتے ہیں سنبھالے اے گیسوؤں والے
یا دے کے شفا اپنے مدینے میں بلا لے ہیں تیرے حوالے

۳۔ خورشید کی کرنوں میں مہ کی ضیاؤں میں دشت کے خاروں میں
گلشن کی فضاؤں میں میں نے تجھے پایا ہے

۴۔ منائے لا بھنورا مور پی ہُروا ہمرے خواجہ سے یوں جائے کہیو

تم بن سونا انگنوا منائے لا بھنورا

۵۔ مری راحتیں کدھر ہیں، مرا چین اب کہاں ہے مجھے جس کی آرزو ہے وہی مجھ سے بدگماں ہے
میرا سر جھکا ہوا ہے جس در پہ میرے خواجہ وہی تیرا سنگ در ہے، وہی تیرا آستاں ہے
۶۔ نہ سمجھو کوئی موت ٹل جائے گی بچے گی جو روح آج، کل جائے گی
۷۔ نگاہ پاک ہے دل بے نیاز ہے میرا نقابِ حسن میں پوشیدہ راز ہے مرا
۸۔ شام ہو شب ہو یا سحر زندگی چند روز ہے ایک پہر یا دو پہر زندگی چند روز ہے
۹۔ سن اے خواجہ ہندوستان مجھے اجمیر بلانے والے میری مشکل کر آسان مجھے اجمیر بلانے والے

عظیم پریم راگی کا پورا کنبہ پاکستان میں آباد ہے۔ ان کے ایک بیٹے پریم راگی ثانی کراچی میں وکالت کرتے ہیں اور دوسرے بیٹے سلیم شہزاد موسیقار اور گلوکار ہیں۔

کلّن خان قوال (میرٹھ)

کلّن نے بھی غیر معمولی شہرت پائی۔ انہوں نے بارہا سر کردہ شاعروں کا کلام گایا اور عشقیہ کلام بھی اختیار کیا۔ ایک بار پاکستان بھی گئے جہاں ای ایم آئی نے ان کا لانگ پلے ریکارڈ تیار کیا مگر وہ اُسی طرح ناکام رہا جیسے مشہور گلوکارہ خورشید کی جانی پہچانی طرزوں میں نئے نغمے ریکارڈ کرائے گئے اور وہ ناکام ٹھہرے۔

کلّن خان کی زیادہ تر قوالیوں میں تنہا وہ خود اور ایک ہم نوا ہے۔ چند ایک میں ان کی پارٹی بھی ہے جو عام روایت کے مطابق تالی سے سنگت کرتی ہے۔ ان کی سب سے مقبول قوالی جو مجھے یاد ہے شعری بھوپالی کی غزل ہے:

ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی
اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

بعد میں یہی غزل نور جہاں نے فلم جگنو میں گائی (۱۹۴۷ء موسیقی: فیروز نظامی) جس کی طرز

بھی کلن خان کی قوالی سے ملتی جلتی تھی۔

میرٹھ والے بتاتے ہیں کہ خان صاحب نے اپنا بڑھاپا وہیں گزارا۔ جاڑوں کی دوپہروں میں دھوپ میں ایک چارپائی پر لیٹے نظر آتے تھے اور بس۔

اُن کی جن قوالیوں کو میں قابل ذکر سمجھتا ہوں ان کے چند بول یہ ہیں:

۱۔ جس جگہ یار کا نقشِ کفِ پا ہوتا ہے — بس وہیں کعبۂ اربابِ وفا ہوتا ہے
جام غیروں ہی کو ہر بار عطا ہوتا ہے — ساقیا میں ترے قربان یہ کیا ہوتا ہے
۲۔ یہ مری حدِّ نظر کی دیدنی تاثیر ہے — جس طرف بھی دیکھتا ہوں تیری ہی تصویر ہے
۳۔ جب دل میں مکیں ہو تو میرے صنم — پھر تجھ کو ڈھونڈا کون کرے
جب سامنے ہو تو اے جانِ جہاں — پھر کعبے کو سجدہ کون کرے
۴۔ اس درجہ بڑھا ربط تری راہ گزر سے — اوجھل ہوا جاتا ہوں دو عالم کی نظر سے
۵۔ جو پائے ناز پہ میرا سر نیاز نہ ہو — قسم خدا کی مری پھر کبھی نماز نہ ہو
۶۔ کہتی ہے روحِ موسیٰ آقا تری گلی میں — جو طور پر نہ دیکھا، دیکھا تری گلی میں
۷۔ کرم اتنا مری حالت پہ کر دے — مجھے جام محبت بے خطر دے
گلِ امید سے دامن کو بھر دے — نہ منصب دے، نہ دولت دے، نہ زر دے
تجھے دیکھا کروں ایسی نظر دے
۸۔ جو جانے والے مدینے کو ہیں سنیں وہ ذرا — شہِ مدینہؐ سے اتنا ضرور کہہ دینا
کہ ایک زخمی تیرِ نگہ نظر جو پڑا — تڑپ تڑپ کے وہ کہتا تھا یا شہِ بطحا
اے ہرے گنبد کے اُجیالے سلام
۹۔ دولہا ہے اجمیری خواجہ — خواجہ کی آئی ہے سواری
سارے چشتی ہیں بلہاری
اس دولہا پر دنیا واری — دولہا ہے اجمیری خواجہ
۱۰۔ خدا تیرا، نبیؐ تیرے، علیؑ تیرے، حسنؑ تیرے — ہے شانِ پنجتن تری معین الدین اجمیری
تورے کارن میں تو بھئی ہوں دیوانی

۱۱۔ صبا میرا شہِ دیں سے سلام کہہ دینا زمیں کا عرش بریں سے سلام کہہ دینا
۱۲۔ اب کوئی بات بھی مری مانا کہ ہوش کی نہیں آپ کو بھول جاؤں میں ایسی تو بے خبری نہیں

غرض یہ کہ کلّن خان نے بہتر کلام گایا اور اس طرح لوگوں کے کانوں میں بہتر شاعری پڑی۔ سخن فہمی کی پہلی شرط یہی ہے جس کی تکمیل سرزمین میرٹھ کے ایک گلوکار نے کی۔ وہی میرٹھ جہاں سے دلّی تک پھیلے ہوئے علاقے کے بارے میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ زبان اردو نے وہیں جنم لیا اور ہند کو فرنگیوں کے تسلّط سے نجات دلانے والوں کے قدم اسی مٹی نے چومے۔

اِدھر قوالیوں کا شہرہ تھا، اُدھر نعت خوانی کو بھی قبول عام حاصل ہوا۔ مستقبل کے عظیم میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر نے امراؤ ضیا بیگم کی آواز میں مشہور و معروف نعت ریکارڈ کی: یثرب کو جانے والے میرا سلام لے جا۔

غالباً اسی سلام کے جواب میں قدرت نے غلام حیدر اور امراؤ ضیا بیگم کو شادی کی گرہ میں باندھ دیا اور یہ گرہ عمر بھر مضبوطی سے بندھی رہی۔

گھر گھر دہرائی جانے والی یہ نعت ایک روایت کے مطابق ۱۹۴۲ء میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ اس کے بول دلچسپ ہیں جن میں کچھ جدید نظم کا انداز ہے:

میرا سلام لے جا
وہ جان لیں گے سب کچھ پہچان لیں گے سب کچھ
ناشاد جستجوئیں برباد جستجوئیں ناکام ہو رہی ہیں
لیکن خموش رہنا تو دیکھ تو چلا ہے واں منہ سے کچھ نہ کہنا
لے اک پیام لے جا میرا سلام لے جا
جا دیر ہو نہ جائے تقدیر سو نہ جائے تیرا خدا محافظ
لے جا پیام الفت سرمایۂ عقیدت
لے اک پیام لے جا میرا سلام لے جا

مگر غلام حیدر کی کمپوز کی ہوئی جو دو نعتیں آج بھی زندہ ہیں اور بار بار سننے میں آتی

ہیں وہ شمشاد بیگم کی آواز میں ہیں اور سنہ ۳۰ء کے عشرے کے آخر یا ۴۰ء کے شروع میں ریکارڈ کی گئی ہوں گی۔

کہتے ہیں کہ اُن دنوں غلام حیدر نے کسی تُرک گلوکارہ کی آواز میں نعت سنی جس میں مصرعے کے آخری تین چار الفاظ دہرائے جاتے تھے۔ لفظوں کی یہ تکرار انہیں اتنی پسند آئی کہ انہوں نے دو نعتیں کمپوز کیں اور نوعمر شمشاد بیگم کی آواز میں ریکارڈ کرائیں۔ لفظوں کی تکرار کو اس طرح سمجھئے:

محمد مصطفیٰؐ کے نام کو ورد زباں کرلوں ورد زباں کرلوں۔ یا

پیغام صبا لائی ہے گلزار نبیؐ سے آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبیؐ سے دربار نبیؐ سے

شمشاد نے کئی نعتیں اور منقبت ریکارڈ کرائیں مگر یہاں جن دو نعتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ دس انچ کے سیاہ فام ریکارڈ کی شکل میں گھر گھر پہنچیں: کچھ منتخب مصرعے یہاں نقل کئے جاتے ہیں کیونکہ ہمیں عموماً پہلے دو تین بول ہی یاد رہ جاتے ہیں:

پیغام صبا لائی ہے گلزار نبیؐ سے آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبیؐ سے دربار نبیؐ سے

ہر آہ گئی عرش پہ یہ آہ کی قسمت ہر اشک پہ اک خلد ہے ہر اشک کی قیمت

تحفہ یہ ملا ہے مجھے سرکار نبیؐ سے آیا ہے بلاوا

بھاتی نہیں ہمدم مجھے جنت کی جوانی سنتا نہیں زاہد سے میں حوروں کی کہانی

الفت ہے مجھے سایۂ دیوار نبیؐ سے آیا ہے بلاوا

عرفاں کی گزک خلق کی مے صبر کا ساغر کیا لطف ملا کرتا ہے جو دیتے ہیں سرورؐ

یہ پوچھ لے آکے کوئی بیمارِ نبیؐ سے آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبیؐ سے دربار نبیؐ سے

کے ایل سہگل

اچھے مصرعے اور عمدہ اشعار جس طرح کندن لال سہگل نے عوام تک پہنچائے اُس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ انہوں نے بولنے والی فلموں کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۳۲ء میں غیر فلمی گانے ریکارڈ کرانے شروع کئے اور اس طرح کے ۴۳ گانے گائے جن میں ۱۳۷ اردو

اور ہندی میں تھے، دو بنگلہ میں، دو پنجابی اور دو فارسی میں تھے۔

سہگل نے خاص طور پر دو غزلوں کو حیات جاودانی عطا کر دی جن میں پہلی غزل اکبرالہ آبادی کی ہے اور اس کا مطلع کس کو یاد نہ ہوگا:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں   بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اور دوسری غزل جو استاد ذوق کی ہے، سہگل کی گلوکاری کے ہاتھوں ضرب المثل بن گئی اور گفتگو اور تحریروں میں کثرت سے برتی جانے لگی:

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے   اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے

سہگل کی گائی ہوئی چند اور غزلیں یہ ہیں:

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے   ولے مجھے تپشِ دل مجال خواب تو دے (غالب)

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک   کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک (غالب)

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار   پھول جنگل میں کھلیں کن کے لئے (امیر مینائی)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے (غالب)

ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (غالب)

اِدھر پھر بھی آنا اُدھر جانے والے   ارے جی کے بے چین کر جانے والے (آرزو)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی (غالب)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا   دل جگر تشنۂ فریاد آیا (غالب)

شمع کا جلنا ہے یا سوزشِ پروانہ ہے   چند لفظوں میں یہی عشق کا افسانہ ہے (حسرت)

گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے   رات کی رات کا بسیرا ہے (آرزو)

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں   چل نکلتے جو مے پیے ہوتے (غالب)

بقدرِ شوق اقرار وفا کیا   ہمارے شوق کی ہے انتہا کیا (سیماب)

اے بے خبری دل کو دیوانہ بنا دینا   ہر سانس کو ہستی سے بیگانہ بنا دینا (سیماب)

اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا   عرفانِ غم ہوا مجھے دل کا پتا ملا (سیماب)

سہگل کو زبان کا بہت سلیقہ تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ ان کی تعلیم جموں کے ایک بزرگ

کے آستانے پر ہوئی تھی۔ کاش بزرگ اُن کو شراب نوشی سے روک سکتے تو ان کا جگر چھلنی نہ ہوتا، وہ کچھ برس اور جی لیتے۔

پنکج ملک

سہگل کے بہت سے گانوں کی طرزیں پنکج ملک نے بنائیں۔ یہ دونوں کلکتے کے نیو تھیٹرز سے وابستہ تھے۔ پنکج نے خود زیادہ تر گانے فلموں کے لئے گائے البتہ چند غیر فلمی گانے خود ہی کمپوز کر کے گائے۔ اُن دنوں کلکتے میں جو انگریزوں کا صدر مقام تھا، مغربی انداز کے کئی بینڈ اور آرکسٹرا موجود تھے جن کے ساتھ پنکج نے خاموش فلموں کے زمانے سے کام کیا تھا چنانچہ اپنے گانوں کی سنگت کے لئے انہوں نے نہ صرف مغربی آرکسٹرا کو خوب خوب استعمال کیا، بلکہ طرزیں بھی فرنگی انداز کی بنائیں مگر اہلِ ہند کو یہ نغمے اجنبی اور بدیسی نہیں لگے اور عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ پنکج ملک کے چند پرائیویٹ گانے یوں ہیں:

۱۔ پران چاہے نین نہ چاہے — ارے تو کیوں یوں شرمائے

۲۔ میں نے آج پیا ہونٹوں کا پیالہ — امرت کو بھی جو شرما دے
آگ لگا کے آگ بجھا دے — ایسے مدھ کے ایک گھونٹ سے
بجھا چکا میں دل کا جوالہ — آج پیا ہونٹوں کا پیالہ

۳۔ پریم بیل میں پھول نہ پتے — نہ پھل اس میں آئے

۴۔ چھوڑ مسافر مایا نگر — اب پریم نگر کو جانا ہے

۵۔ میں روتا ہوں، مت منع کرو — تم میرے آنسو گنا کرو
رونے میں میری دنیا ہے — آنکھوں میں میری بستی ہے
میں دکھ کا کالا بادل ہوں — بوندوں میں آگ برستی ہے
تم میرا رونا سنا کرو — میں روتا ہوں مت منع کرو

۶۔ یہ راتیں یہ موسم ہنسنا ہنسانا
مجھے بھول جانا انہیں نہ بھلانا

یہ بہکی نگاہیں یہ بہکی ادائیں
یہ آنکھوں کے کاجل میں ڈوبی گھٹائیں
فضا کے لبوں پر یہ چُپ کا فسانہ
مجھے بھول جانا انہیں نہ بھلانا
چمن میں جو مل کے بنی ہے کہانی
ہماری محبت تمہاری جوانی
یہ دو گرم سانسوں کا اک ساتھ آنا
یہ بدلی کا چلنا یہ بوندوں کی رم جھم
یہ مستی کا عالم یہ کھوئے سے ہم تم
تمہارا مرے ساتھ یہ گنگنانا
مجھے بھول جانا، انہیں نہ بھلانا

یہ آخری نغمہ صاف ظاہر ہے آرزو لکھنوی کا لکھا ہوا ہے۔ بنگال کے لہراتے ہوئے کھیتوں کے ماحول کو گومتی کے ساحل کے نازک احساسات میں گھول کر عشق کی تصویر میں بارش کی بوندوں کا رنگ بھرنا کسی دوسرے شاعر کا کام نہیں ہوسکتا۔

کلکتے کی موسیقی پر آرزو صاحب، فیاض ہاشمی اور کمل داس گپتا کا بڑا احسان ہے جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

جگ موہن

جنہیں سُر ساگر کا خطاب ملا تھا، سروں کی مٹھاس کا سمندر تھے۔ محبت کے نغمے گاتے تھے اور نوجوانوں میں اسی سبب سے بہت مقبول تھے۔ جگ موہن نے فلموں میں گانے سے گریز کیا البتہ فلمی موسیقی ترتیب دی۔ ان کے پرائیویٹ گانے آج تک سنے جاتے ہیں اور سراہے جاتے ہیں۔ چند مثالیں یوں ہیں:

۱۔ اک بار مُسکرا دو ہونٹوں کی اک ادا سے سو بجلیاں گرا دو

۲۔ الفت کی سزا دو مجھے   چاہو تو مٹا دو (فیاض ہاشمی)
۳۔ دیوانہ تمہارا کہتا ہے افسانہ   روتی ہیں جب آنکھیں، ہنستا ہے پیمانہ (فیاض ہاشمی)
۴۔ مجھے خاموش رہنے دو   گزرتی ہے جو اس دل پر   میرے اشکوں کو سہنے دو (راجندر کرشن)
۵۔ پریم کی رت چلی گئی پیار کے دن گزر گئے
جینے کی آرزو میں، ہم موت سے پہلے مر گئے
روٹھ کے نیند چل بسی آنسو میں بہہ گئی ہنسی
یاد میں ان کی آنکھ سے موتی گرے بکھر گئے (فیاض ہاشمی)
۶۔ دل دے کر درد لیا میں نے   تیرے نام کی خاطر سجنی اپنے کو بدنام کیا میں نے
۷۔ آنکھوں میں چھپا من مرا ہے، من میں چھپا کون
سپنوں میں مرے ہونٹوں پر آ کر کے ہنسا کون
کس سے یہ لگن لگ گئی ہے دل کے روبرو
آنکھوں کے راستہ کہیں نکلے نہ آرزو
ہم تم پہ مٹے اور کہو ہے ہم پہ مٹا کون
۸۔ یہ مانا کہ تم سے نہ مل پائیں گے ہم
مگر یاد رکھنا کہ یاد آئیں گے ہم
۹۔ جل رہے ارماں   دل پہ جگر پہ پیار کے گھر پہ
گر رہی ہیں بجلیاں   یہ جلن تو بڑی بری ہے
ساری دنیا جل رہی ہے   کون کہے کہ لگی ہے کہاں (فیاض ہاشمی)
۱۰۔ میری آنکھیں بنیں دیوانی   پہلے لائیں آگ ہردے میں   پھر بھر لائیں پانی
۱۱۔ پیاری تم کتنی سندر ہو
۱۲۔ تم مرے سامنے آیا نہ کرو   دل میں جو درد چھپائے ہوں میں   اس کو رہ رہ کے بڑھایا نہ کرو
۱۳۔ سپنوں میں مجھ کو پیار ملا   انکار ملا اقرار ملا
۱۴۔ مجھے نہ سپنوں سے بہلاؤ   دوری کا دکھ دل پہ سہوں میں

رہ کے پاس بھی دور رہوں میں چھونا چاہوں چھو نہ سکوں میں
کون یہ ریت بتاؤ

۱۵۔او ورشا کے پہلے بادل میرا سندیسہ لے جانا انسوون کی بوندن برسا کر
الکا نگری میں تم جا کر خبر مری پہچانا (فیاض ہاشمی)

۱۶۔ یہ چاند نہیں تری آرسی ہے

۱۷۔اک بار مسکرادو ہونٹوں کی اک ادا سے سو بجلیاں گرادو
اس دل کا حال سن کے میرا سوال سن کے آنچل سنبھال کے تم شرما کے سر جھکادو

۱۸۔دل کو ہے تم سے پیار کیوں یہ نہ بتا سکوں گا میں
پہلے ملن کی چھاؤں میں، تم سے تمہارے گاؤں میں
آنکھیں ہوئی تھیں چار کیوں یہ نہ بتا سکوں گا میں
تم کو نظر میں رکھ لیا دل میں جگر میں رکھ لیا
خود میں ہوا شکار کیوں یہ نہ بتا سکوں گا میں
روپ کی کچھ کمی نہیں دنیا میں اک تم ہی نہیں
پھر میں تمہاری یاد میں رہتا ہوں بے قرار کیوں
یہ نہ بتا سکوں گا میں دل کو ہے تم سے پیار کیوں

جگ موہن نے زندگی کا کچھ حصہ کلکتے میں اور زیادہ حصہ بمبئی میں گزارا اس لئے ان کے نغموں میں نیو تھیٹرز کی زبان کم اور غزل کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔

ضعیفی میں لندن آئے تھے اور بی بی سی پر اپنے کچھ گانے بھی پیش کئے تھے۔ بمبئی کی فلم 'سردار' کی موسیقی انہوں نے ترتیب دی تھی جس میں کیف عرفانی کا لکھا ہوا ایک نغمہ لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ کیسا پیارا نغمہ تھا جو وقت کی گرد تلے دب گیا:

ع پیار کی یہ تلخیاں جو نہ سہہ سکوں تو میں کیا کروں

جگ موہن نے ۸۵ سال کی عمر پائی اور مئی ۲۰۰۶ میں ممبئی میں انتقال کر گئے۔ تین بیٹے پیچھے چھوڑے اور دو بیٹیاں۔

ہیمنت کُمار

پنکج ملک اور جگ موہن کی طرح ہیمنت کمار بھی بنگال کی سرزمین سے اُٹھے اور ہندوستان پر چھاگئے۔ ان تینوں نے نوجوانوں کے لئے محبت کے ترانے گائے اور کالج کے لڑکوں لڑکیوں میں مقبول ہوئے۔ ہیمنت کمار کے غیر فلمی گانے زیادہ تر بنگلہ میں ہیں لیکن اردو ہندی میں بھی ان کے گانوں نے بہت شہرت پائی۔ ان کے یہ غیر فلمی گانے زیادہ تر فیاض ہاشمی نے لکھے جنہیں گیت اور غزل کی آمیزش میں کمال حاصل تھا۔ ان کی طرزیں بے حد ذہین موسیقار کمل داس گپتا نے بنائیں۔ یہ دونوں آگے چل کر لکھنؤ سے کلکتہ آئے ہوئے طلعت محمود کے لئے بھی نغمے سجاتے رہے۔

ہیمنت کمار نے فیاض ہاشمی کا پہلا نغمہ ۱۹۴۰ء میں ریکارڈ کرایا، وہی عشق کا نغمہ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

میرے زخمی دل پہ رکھ کر اپنا کومل ہاتھ کتنا دکھ بھلایا تم نے پیاری
سب درد مٹایا تم نے پیاری پریتم کیوں گھبرائے ہو بس پوچھ کے اتنی بات
اپنے گلابی ہونٹوں کو میرے ہونٹوں سے ملا کے اپنی بل کھائی زلفیں سینے پہ میرے بچھا کے
ہم تم چپ بیٹھے ہیں دل کہتا ہے قصے دل کے امرت رس پلایا تم نے پیاری
قسمت کو جگایا تم نے پیاری چرا لیا ہے ہوش ہمارا چار آنکھوں نے مل کے

اسی طرح ہیمنت کا ایک نغمہ اپنی سادگی کے باوجود بہت گنگنایا گیا اور آج تک دہرایا جاتا ہے:

بھلا تھا کتنا اپنا بچپن دن بھر تو پیڑوں کے تلے رہتی تھی پسارے آنچل
اور میں ڈالوں سے پھینکا کرتا تھا توڑ کے پھل مالی تھا بس ہمارا دشمن۔ اپنا بچپن
یاد بھی ہے وہ کھیل کی بات جب ہم نکالتے تھے برات
لڑکے مجھ کو دولہا بناتے سکھیاں تجھ کو بناتیں دلہن۔ اپنا بچپن
دن کو کھیل میں اور راتوں کو باتوں میں کھو جاتے تھے
راجا رانی کے قصے سنتے سنتے سو جاتے تھے

آنکھ میں نیند کا نام نہیں تھا   دل سے کوسوں دور تھی دھڑکن ۔ اپنا بچپن

ہیمنت کمار کا ایک اور گانا جو غالباً ان کی زندگی کا دوسرا اردو نغمہ تھا، اس کا آغاز ایک صدا اور ایک شعر سے ہوتا ہے اور یہاں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ زیادہ تر شعر فیاض ہاشمی کے اور طرزیں کمل داس گپتا کی ہیں:

او پریت نبھانے والی!!
مجھے خبر ہے تو بھولے گی اک دن میرا پیار
اپنے گلے سے میرے پریم کی مالا دے گی اُتار
میری آشاؤں کی بستی کو مٹائے گی تو
دل مرا لوٹ کے اک دن چلی جائے گی تو

اور پھر یہ نغمہ جس سے اردو غزل کا رس ٹپکتا ہے:

میرے اندھیرے گھر میں آکر   چادر اپنے سر سے گرا کر
دنیا کو جگمگا دیا   رات کو دن بنا دیا
موجوں میں ترنگیں سوئی تھیں   اور دل میں امنگیں سوئی تھیں
شاخوں میں سوئی تھیں کلیاں   چپ چاپ تھیں ہردے کی گلیاں
تم نے سب کو جگا دیا   رات کو دن بنا دیا

(گلوکار نے معلوم ہوتا ہے خود ہی "گلیاں" کو "دنیا" کہہ کر دودھ میں الا بلا ڈال دی)

اس کے علاوہ ہیمنت کمار کے چند اور غیر فلمی گانے قابل ذکر ہیں:

۱۔ میں ساز بجاؤں تم گاؤ
۲۔ تم نے مجھ کو سدا جلایا
۳۔ یاد ہمیں کیوں آتی ہو
۴۔ وہ آنکھ سے پلا گئے، مستیاں لٹا گئے
۵۔ آج شرابی آنکھوں سے پینے کی ہم نے ٹھانی
۶۔ آنچل سے کیوں باندھ لیا مجھ پردیسی کا پیار

۷۔اے شام کی ہواؤ اُن سے پیام کہنا، میرا سلام کہنا۔

ہیمنت کمار بعد میں اوروں کی طرح بمبئی چلے گئے اور گلوکاری کرنے کے علاوہ میوزک ڈائریکٹر بھی بن گئے اور غیر معمولی شہرت پائی۔ اپنی تقریباً ستر برس کی زندگی میں انہوں نے دو ہزار گانے گائے اور پچاس اردو ہندی فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ فلم ناگن میں سپیروں کی مخصوص طرز کو راگ میں ڈھال کر انہوں نے جو دھنیں بنائی تھیں وہ صرف ریڈیو ہی پر نہیں، دِلوں میں بھی گونجتی رہتی ہیں۔

کملا جھریا

غزل گانے والوں میں کملا جھریا کے نام کو بھی بہت مقبولیت حاصل تھی۔ کملا یوں تو بنگالی تھیں مگر دھنباد کی ریاست جھریا کے مہاراجا کے محل میں رہ کر انہوں نے نہ صرف کلاسیکی گائیکی بلکہ اردو، ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی اور کئی دوسری زبانیں سیکھیں۔ انہوں نے پہلے پہل ۱۹۳۰ء میں بنگالی گانے ریکارڈ کرائے اور ان کی زیادہ تر اردو غزلیں اور نعتیں ۳۲ء اور ۳۶ء کے درمیان ریکارڈ کی گئیں۔ سرکردہ موسیقار پروفیسر ضمیر الدین نے ان کی طرزیں تیار کیں اور جن شاعروں کا کلام انہوں نے گایا اُن میں آرزو لکھنوی اور نوعمر فیاض ہاشمی شامل تھے جن کا یہ شعر اُن کے سن وسال کا پتہ دیتا ہے:

فیاضؔ تو نیا ہے ابھی، بات مان لے　　　کڑوی بہت شراب ہے پانی ملا کے پی

کملا جھریا کی آواز میں کوئی درجن بھر اردو نغمے دستیاب ہیں:

۱۔ سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

۲۔ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

۳۔ کاش مری جبیں شوق سجدوں سے سرفراز ہو
یار کی خاک آستاں تاجِ سرِ نیاز ہو　　　(ریکارڈنگ: فروری ۳۲ء)

۴۔ موسمِ گل ہے اوراب جوش ہے دیوانوں میں
سر کو ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں میں

۵۔ اتنا تو محبت میں اپنے سے ہو بیگانہ — کل شمع نظر آئے جو یاد ہے پروانہ
گرتا نہ شب منزل تو حد سے گزر جاتا — کیا خوب سنبھالا ہے اے لغزشِ مستانہ
الفت بھی عجب شے ہے، جو درد وہی درماں — پانی پہ نہیں گرتا جلتا ہوا پروانہ
کل آرزو اک در پہ پر کھول کے روتا تھا — میں نے جو کہا کیا یہ، ہنسنے لگا دیوانہ
۶۔ کیوں بے قرار دل نہ ہو مضطر جگر نہ ہو — جلوہ نما وہ شوخ جو پیشِ نظر نہ ہو
ہر وقت آئینہ ہے، وہ ہیں، دیکھ بھال ہے — مغرور اس قدر بھی کوئی خود نظر نہ ہو (۱۹۳۲ء)
۷۔ کٹ گئے انجمنِ یار میں داخل ہو کر — ہائے دل وائے جگر کرتے ہیں بسمل ہو کر
آئینہ پھینک کے ہاتھوں سے وہ کہنا ان کا — منہ چڑاتا ہے کمبخت مقابل ہو کر
دے رہی تھی نگہِ یار مجھے دادِ وفا — شرم نے روک لیا بیچ میں حائل ہو کر (فروری ۳۴ء)
۸۔ میرے ارمان کہاں مجھ کو لئے جاتے ہیں — دل نگاہوں سے جہاں چھین لئے جاتے ہیں
اور مجروح ہوئے آ کے ترے کوچے میں — ہم تو سمجھے تھے یہاں زخم سئے جاتے ہیں
کس طرح کوئی کرے عرض تمنا ان سے — لب ہلانے پہ یہاں ہونٹ سئے جاتے ہیں
۹۔ مستوں کے جو اصول ہیں اُن کو نبھا کے پی — اک گھونٹ بھی نہ کل کے لئے تو بچا کے پی
کیوں کر رہا ہے کالی گھٹاؤں کا انتظار — اُن کی سیاہ زلفوں پہ نظریں جما کے پی
فیاضؔ تو نیا ہے ابھی بات مان لے — کڑوی بہت شراب ہے پانی ملا کے پی
۱۰۔ یا شاہِ عرب سیّد ابرارؐ تم ہی ہو — مکّی مدنی، ہاشمی سردارؐ تم ہی ہو (مارچ ۳۴ء)
۱۱۔ تُمرے دیا کی ہے آس محمدؐ — پاپی ہوں کچھ نہیں پاس محمدؐ
سیس دھرے ہوئے پاپ کی گٹھری — آیا ہوں تمرے پاس محمدؐ
تم ہو جگت کے پالن ہارے — میں ہوں تمہارا داس محمدؐ

کملا جھریا کی آواز میں یہ ہندی نعت بہت مقبول ہوئی تھی۔ اسی طرح اگلی دو غزلوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی تھی:

۱۲۔ اسیرِ غم کا بھلا پھر کہاں ٹھکانہ تھا — نصیب میں تو قفس ہی کا آب و دانہ تھا
کیا تھا اس لئے عذرِ گلہ شب وعدہ — کہ میری حسرت و ارماں کا وہ بہانہ تھا

قفس پہ برق گری آشیاں کے دھوکے میں　　فلک کے تیر کا کیا بے خطا نشانہ تھا

۱۳۔نہ تم میرے، نہ دل میرا، نہ جانِ ناتواں میری　　تصور میں بھی آ سکتی نہیں مجبوریاں میری
نہ تم آئے، نہ چین آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ　　دلِ مضطر تھا، میں تھا اور تھیں بیتابیاں میری
عبث نادانیوں پر آپ اپنی ناز کرتے ہیں　　ابھی دیکھی کہاں ہیں آپ نے نادانیاں میری

یہ آخری غزل فیاض ہاشمی کی ہے۔ ان کو آگے چل کر ۱۹۴۳ء میں طلعت محمود کے لئے 'تصویر تری دل میرا بہلا نہ سکے گی' لکھنی تھی۔ ان دونوں کا ذکر آگے آئے گا۔

کملا جھریا نے اردو فلم سلیمہ (۱۹۳۵ء) کے لئے بھی گانے گائے تھے۔ یہاں ان کی گائی ہوئی غزلوں کے منتخب اشعار درج کرنے کا مقصد قارئین کو نغموں کے اس سفر کے دوران یہ دکھانا ہے کہ اردو شاعری نے موسیقی کے ہنر کو کیسے کیسے سنوارا اور اس وسیلے سے سخن وری کہاں کہاں نہیں پہنچی۔

جوتیکا رائے

برصغیر کی موسیقی میں بنگال نے کتنا حصہ ڈالا ہے۔ اس کا تصور کرنا مشکل ہے۔ باقی برصغیر سے الگ تھلگ ایک خطّہ جس کی ثقافت بھی جدا اور زبان بھی الگ، اُس نے موسیقی کے رتھ پر بیٹھ کر برصغیر کے گوشے گوشے تک اُڑان بھری۔

جوتیکا رائے کو بنگالی کے سوا کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ عمر بھر انہوں نے بھجن کے علاوہ جو نعتیں اور غزلیں گائیں، وہ سب ان کے سامنے بنگلہ رسم الخط میں لکھی ہوتی تھیں مگر کیا مجال کہ ان کے شین قاف پر کوئی انگلی رکھ سکے:

اِدھر آرہے ہیں وہ نظریں جھکا کے　　وفا آ رہی ہے جفا کو منا کے
کوئی اب نظر میں ٹھہرتا نہیں ہے　　یہ کیا کر دیا تو نے نظریں ملا کے
محبت کی دنیا بسانے چلے ہیں　　محبت پہ ہم اپنی دنیا لٹا کے

کہتے ہیں کہ وہ صرف سات برس کی تھیں جب اپنے والد کے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے ماسٹر مدن کی گائی ہوئی غزلوں کا ریکارڈ سنا (ماسٹر مدن ۱۴ برس کی عمر پا کر جون ۱۹۴۲ء

میں چل بسے تھے) اُس وقت باپ اور بیٹی نے مل کر فیصلہ کیا کہ کمسن جوتیکا بھی اُسی انداز میں، اُسی سر اور اُسی لے میں گائے گی، اور یہی ہوا۔ گراموفون کمپنی والوں نے کہا یہ بہت سریلی مگر نہایت کمسن ہے، ریڈیو والوں نے اُسے جھٹ قبول کرلیا اور دیکھتے دیکھتے سرزمین بنگال میں جوتیکا رائے کی جے جے کار ہونے لگی۔ اس کا کچھ سبب یہ بھی تھا کہ وہ بھجن اور محبت کے گیت بڑی خوبی سے گاتی تھیں۔ جلد ہی وہ ہندی کی طرف آ گئیں کیونکہ میرا کے بھجن جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اُس وقت کی قدیم ہندی میں تھے جن کے درمیان کہیں کہیں اردو یا دوسرے لفظوں میں فارسی لفظ موتی کی طرح ٹنکا ہوتا تھا۔ آیئے جوتیکا رائے کے کچھ مقبول نغموں پر ایک نگاہ ڈالیں، کچھ نہ کچھ آپ نے کبھی نہ کبھی ضرور سنے ہوں گے:

۱۔ آج مرے گھر پریتم آئے
۲۔ بول رے مدھوبن میں مُرلیا
۳۔ چپکے چپکے بول مینا ساجن کب گھر آئیں گے
۴۔ گھونگھٹ کا پٹ کھول رے توہے پیا ملیں گے
۵۔ جوگی مت جا، پاؤں پڑوں میں تیری
۶۔ میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئی
۷۔ میری وینا رو رہی ہے، ساری دنیا سو رہی ہے، سکھ بگیا سونی بھئی ہے، کہاں ہو کہاں ہو کہاں ہو پیا
۸۔ پگ گھنگھرو باندھ میرا ناچی رے
۹۔ روتی انکھیاں نہ سمجھیں سمجھائے
۱۰۔ کل کے سپنے آج بھی آنا ساتھ میں ساجن کو بھی لانا۔ (یہی نغمہ نوشاد علی نے ۱۹۶۸ء میں فلم آدمی کے لئے لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کیا۔)
۱۱۔ میرا لاگو رنگ ہری

جوتیکا رائے نے میرا کے بھجن اس قدر جی لگا کے گائے کہ اہل ہند انہیں دور

حاضر کی میرابائی کہنے لگے لیکن پھر کیا ہوا؟

جوتیکا رائے نے عقیدت میں ڈوبی ہوئی نعت رسول مقبولؐ پڑھی جن میں اُن کے موسیقار اور بنگال کے عظیم میوزک ڈائریکٹر کمل داس گپتا اپنی آواز کے ساتھ شامل ہو گئے۔اس پر اُن کو میرابائی قرار دینے والے کچھ لوگ برہم بھی ہوئے لیکن نعت خوانی کرتے کرتے کمل داس گپتا نے اسلام قبول کرلیا۔

ان کی نعتوں کے چند نمونے یوں ہیں:

۱۔ بسو مورے نینن میں عربی
کالی کملی والے ساجن دو جگ کے پردھان
سپنے میں آ ؤ درس دکھاؤ پریم نگر سنسان

۲۔حاجی سفر کر کے چلے جاتے ہیں گھر کو — میں ختم کروں کیسے بھلا اپنے سفر کو
محبوبؐ کے گھر پہنچوں میں اللہ کے گھر سے
رستے میں اگر پانی نہ پاؤں بھی تو کیا ہے — حضرتؐ کی قدم بوسی میں زمزم کا مزا ہے
مل جائیں گے دو گھونٹ مجھے دیدۂ تر سے

۳۔محمدؐ نہ ہوتے تو آدمؑ نہ ہوتے — زمانے میں پھر ابن مریمؑ نہ ہوتے
وہ جلوہ نہ ہوتا تو پھر ہم نہ ہوتے — محمدؐ کے دم سے یہ دنیا بسی ہے
اگر پوچھ سکتے ہو نبیوں سے پوچھو — نہ ہو کوئی زحمت تو قرآن دیکھو
مری بات سمجھو تو یہ مجھ سے سن لو — محمدؐ کی خاطر نبوت بنی ہے
دو عالم دکھائے ہیں اُس نے زمیں پر — دو ٹکڑے ہوا چاند چرخِ بریں پر
بس اب شک نہ کرنا رسولِ امیںؐ پر — دو عالم کا مختار میرا نبیؐ ہے

تو یہ کیا ہوا کہ شری متی جوتیکا رائے بھجن گاتے گاتے نعت پڑھنے لگیں؟

اسی پر تو میر تقی میر نے کہا تھا:

وفاداری بشرطِ استواری نصف ایماں ہے — مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

کمل داس گپتا کا ذکر آ گیا تو اُن کی بے حد سریلی اہلیہ کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

فیروزہ بیگم اگر چہ بنگالی تھیں مگر عمر کا بڑا حصہ مغربی پاکستان میں گزارا اُن کی آواز میں یہ نغمہ ریڈیو سیلون سے بجا کرتا تھا اور لوگ فرمائش کر کے بار بار نشر کرواتے تھے:

تم بھلائے نہ گئے ہائے بھلائے نہ گئے
ساتھ آنکھوں نے ہمارا تو دیا
آنسوؤں نے بھی سہارا تو دیا
داغِ دل پھر بھی مٹائے نہ گئے
تم بھلائے نہ گئے
چاند نکلا تیری صورت لے کر
رات آئی تو مصیبت لے کر
غم کے بادل تو ہٹائے نہ گئے
تم بھلائے نہ گئے
آگ آہوں نے لگا کر چھوڑا
آرزوؤں کو جلا کر توڑا
ہم سے یہ دیپ بجھائے نہ گئے
تم بھلائے نہ گئے

فیروزہ بیگم نے پاکستان کی گراموفون کمپنی اور پاکستان ٹیلیویژن کے لئے کافی نغمے، غزلیں اور نعتیں ریکارڈ کرائیں۔ اُن کے تین گیت بڑے نازک احساس کی ترجمانی کرتے تھے۔

۱۔ آج بسنت کی پہلی رات
ہار بنے ہیں تُمرے گلے میں
میرے پھول سے کومل ہاتھ

۲۔ برہن کے گھر بدری برسے
گیت سنا جو پیا نگر سے بدری برسے

۳۔ چپکے چپکے رولوں میں چپکے چپکے رولوں
آنسو بن کر سب کچھ کہہ دوں منہ سے کچھ نہ بولوں

کلکتے کا جوذکر ہوا تو غالب کے سینے پر تیر لگا۔ میری اس تحریر میں کلکتے، فیاض ہاشمی اور کمل داس گپتا کی بات آئی تو دھیان سیدھا اُس نغمے کی طرف گیا جو ابھی برسہا برس جئے گا: تصویر تری دل میرا بہلا نہ سکے گی۔

طلعت محمود

ہمارے ایک دوست بمبئی میں طلعت محمود سے ملنے گئے۔ اُن پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور بولنے سے قاصر تھے۔ بہت پیار سے ملے۔ پرانے گانوں کی بات چلی تو بیٹے سے کہہ کر "تصویر تری دل میرا بہلا نہ سکے گی" کا ریکارڈ لگوایا اور بڑے ناز سے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر اشارے سے کہا کہ یہ میں گا رہا ہوں۔

اسی دوران ڈاک آئی جس میں ایک خاکی رنگ کا سرکاری لفافہ بھی تھا۔ اسے کھولا تو کسی دور دراز ریڈیو اسٹیشن کا چیک تھا جس میں 'تصویر تری' کی رائلٹی کی رقم تھی۔ بیٹے نے بتایا کہ ایسے لفافے ہر روز آتے ہیں۔

طلعت محمود لکھنؤ کی نفاست اور سلیقہ مندی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ بہت خوش اخلاق، نہایت ملنسار، ہمیشہ صاف ستھرا نفیس لباس پہنتے تھے۔ ان کے پاس سفید رنگ کی کار تھی۔ ایک بار اپنی کسی فلم کے افتتاحی شو میں اپنی وہی کار لے کر گئے۔ وہاں لڑکیوں نے گھیر لیا اور جب اُن پر بس نہ چلا تو ان کی سفید کار کو اتنا چوما کہ کہتے ہیں کہ لپ اسٹک کی وجہ سے کار سرخ ہو گئی۔

خوش شکل تھے اس لئے نوجوانی ہی سے فلموں میں کام کرنے لگے تھے۔ اس وقت کلکتے میں رہتے تھے جہاں تین فلموں میں اداکاری کی جن میں دو کی اداکارہ کانن دیوی تھیں۔ بعد میں جب بمبئی چلے گئے تو آٹھ دس فلموں میں ہیرو بنے لیکن پھر انہیں احساس ہو گیا کہ ہر شخص ہر کام نہیں کر سکتا چنانچہ اداکاری چھوڑی اور گلوکاری کو اپنے گلے کا ہار کر لیا۔

گلے کے ہار پر ان کی زندگی کا پہلا گراموفون ریکارڈ یاد آ گیا جو لکھنؤ سے کلکتہ جانے کے بعد ۱۹۴۱ء میں بنا تھا اور جس کے یہ بول نوعمر فیاض ہاشمی نے لکھے تھے اور طرز بے حد ذہین موسیقار کمل داس گپتا نے بنائی تھی:

سب دن ایک سمان نہیں تھا — سب دن ایک سمان نہیں تھا
بن جاؤں گا کیا سے کیا میں — اس کا تو کچھ دھیان نہیں تھا
اس نے مجھ کو تھا اپنایا — بنا میں اس کی جیون چھایا
میرا گلشن ہرا بھرا تھا — اجڑا یا سنسان نہیں تھا
اُس کے گلے کا ہار کبھی تھا — مجھ سے اس کو پیار کبھی تھا
بسا ہوا سنسار ہردے کا — سب دن تو شمشان نہیں تھا

فیاض ہاشمی گراموفون کمپنی کے ملازم تھے جہاں ہر مہینے پندرہ سولہ گانے ریکارڈ کئے جاتے تھے۔ یوں تو یہ گانے مختلف شاعر لکھتے ہوں گے لیکن کہتے ہیں کہ بعض مہینے ایسے بھی آئے جب سارے کے سارے نغمے فیاض ہاشمی نے لکھے۔ طلعت محمود ابھی غزل کی طرف نہیں آئے تھے۔ 'تصویر تری' دو سال بعد ریکارڈ ہونا تھا۔ اس دوران ریکارڈ ہونے والے ان کے کچھ گیت بہت پسند کئے گئے۔ ان سب میں غزل کی نفاست خوب خوب شامل تھی:

۱۔ تم لوک لاج سے ڈرتی تھیں میں اپنا ہی دیوانہ تھا
اور اسی دیوانے پن سے تو اپنا سا تمہیں بنانا تھا
تم دھیرے دھیرے نڈر بنیں، میں جان کے بھی انجانا بنا
اک کھیل انوکھا ہم دونوں کو آپس میں دکھلانا تھا

۲۔ میں تیری چھبی بناؤں گا تیری چھبی بناؤں گا
تیرے انگ کا رنگ ملانے کو میں چاند سے لوں گا چاندنی
ہونٹوں کی ہنسی بنانے کو پھولوں سے ہنسی چراؤں گا

۳۔ آج اُسے پھر دیکھا ہے، آج اُسے پھر دیکھا ہے

روز کیا کرتا تھا یاد لیکن آج بہت دن بعد
گاؤں کے چھوٹے پنگھٹ میں چاند سا چہرہ گھونگھٹ میں
میں نے چمکتے دیکھا ہے، آج اُسے پھر دیکھا ہے

۴۔ سوئے ہوئے ہیں چاند اور تارے آج کی رات اندھیاری
تم بیٹھی ہو پاس ہمارے سوئی ہے پھلواری
جن آنکھوں میں لاج بھری تھی وہ بھی ہیں متواری
اب تو اتنا کہہ دو پیاری میں ہوں تمہاری میں ہوں تمہاری

طلعت محمود کے کچھ اور مقبول گیتوں کے بول یوں ہیں۔ یہ گیت انہوں نے بمبئی منتقل ہونے کے بعد گائے۔ ان کے شاعر بھی جدا ہیں اور موسیقار بھی:

۱۔ رو رو بیتا جیون سارا، آیا نہ من کا میت ہمارا
۲۔ چپ چاپ اکیلے چھپ چھپ کے میں گیت کسی کے گاتا ہوں
۳۔ میں دکھ کی رات ہوں ایسی سویرا دور ہے جس کا
۴۔ مرا پیار مجھے لوٹا دو، میں جیون میں الجھ گیا ہوں، تم جینا سکھلا دو
۵۔ کیسا پیار کیا تھا تم نے، کیسا پیار کیا
۶۔ وِدا کی بیلا تم نے کہا تھا بھول نہ جانا لکھنا پاتی

طلعت محمود فروری ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ منظور محمود کی وہاں بجلی کے سامان کی دوکان تھی جس کا نام 'برقی عجائبات' تھا۔ وہ خود اور ان کے چھ بچے سب کے سب سریلے تھے۔ کلاسیکی موسیقی سے واقف تھے اور ساز بھی بجا لیتے تھے مگر یہ موسیقی گھر کی چار دیواری کے اندر محدود تھی۔ قدامت پسندی انہیں باہر جا کر گانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ طلعت محمود نے یہ بیڑی کھولی اور آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ سے گانے لگے۔ اُس وقت وہ صرف سولہ برس کے تھے۔

ہز ماسٹرز وائس والوں نے ان کا گانا سنا تو انہیں کلکتہ لے گئے جہاں انہوں نے گیتوں کی ریکارڈنگ شروع کی۔ کہتے ہیں کہ پنکج ملک نے انہیں بنگلہ نغمے گانے پر آمادہ کیا

اور وہ تپن کمار کے کمار سے بنگالی فلموں اور ریکارڈوں کے لئے گانے لگے۔

انہیں انیسواں برس لگا تھا (۱۹۴۳ء) جب اُن پر غزل کا دروازہ کھلا۔ فیاض ہاشمی بھی بلوغت کے مرحلوں میں آگے بڑھے اور انہوں نے 'تصویر تری' لکھی جو دو دو مصرعوں کی روایتی غزل نہیں بلکہ چار مصرعوں کی قطعہ بند غزل ہے۔ اس کے آس پاس فیاض اور کمل داس نے 'چودھویں منزل پہ ظالم آ گیا، چاند میرے چاند سے شرما گیا' ریکارڈ کرائی۔ اس کے بعد ایک اور غزل کو رمضان خان نے گائیکی کا لباس پہنایا 'یاد دلواتے ہیں کیوں وہ میرا افسانہ مجھے'

لوگوں نے طلعت محمود کو شہنشاہ غزل قرار دے دیا۔ لہٰذا وہ ۴۹ء میں بمبئی جانے کے بعد بھی غزلیں گاتے رہے۔ یہاں اُنہیں شکیل بدایوانی جیسا غزل گو ملا جس نے اپنے مخصوص کلاسیکی رنگ میں غزلیں لکھیں اور ایک دلچسپ انقلاب یہ آیا کہ ان کی طرزیں خود طلعت محمود نے تیار کیں۔

۱۔ تم نے یہ کیا ستم کیا ضبط سے کام لے لیا
ترکِ وفا کے بعد بھی میرا سلام لے لیا

۲۔ مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا

۳۔ کھو کے محفل میں تری صبر و قرار آیا ہوں
چند لمحے تری محفل میں گزار آیا ہوں

۴۔ غم عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت میرے نام تک نہ پہنچے (موسیقی: نصیر قادری)

ان غزلوں کے علاوہ دوسرے شاعروں کی غزلوں کو بھی شہرت ملی۔ عجب بات یہ ہے کہ یہ شروع شروع کی غزلیں گھر گھر پہنچیں اور انہیں عام لوگ بھی گنگناتے رہے۔

۱۔ غم زندگی کا یارب نہ ملا کوئی کنارا
مری فکر بے کراں نے دو جہاں کو چھان مارا
(کلام: آئی اے مینائی، موسیقی: چتّا رائے)

۲۔ اے عندلیب زار جانے کو ہے بہار
تو کیوں ہے بے قرار بتا کیوں ہے بے قرار
(کلام: راج میرٹھی، موسیقی: ِگرن چکرورتی)

۳۔ آ گئیں پھر سے بہاریں آ گئیں
دل پہ غم کی بدلیاں سی چھا گئیں (کلام: خاور زماں، موسیقی: خیام)

غرض یہ کہ طلعت محمود نے اپنے شہنشاہ غزل ہونے کا آخر عمر تک ثبوت دیا اور انتقال سے بارہ سال پہلے اپنی جدید غزلوں کا البم جاری کیا جس کا عنوان تھا: غزل کے ساز اٹھاؤ۔

آخر میں کچھ ذکر اُن کی آواز میں ریکارڈ ہونے والے ان نغموں، نعتوں، منقبت، نوحوں اور ترانوں کا جن کا تعلق ان کے دین اور عقیدے سے تھا۔ کچھ بول دلچسپ ہیں:

۱۔ آپ کی شان ہے کیا شان مدینے والے
۲۔ بہاروں میں محمدؐ ہیں، ستاروں میں محمدؐ ہیں
۳۔ دعا کر مسلماں خدا سے دعا کر
۴۔ نبیؐ اکرمؐ رسول داورؐ، درود تم پر سلام تم پر
۵۔ الوداع اے ماہ رمضاں الوداع
۶۔ اے حاجیو تم مدینے جا کر نبیؐ سے میرا سلام کہنا
۷۔ سچ بولنا بھی ایک عبادت خدا کی ہے
۸۔ تصویرِ نبیؐ خالق اکبر نے بنائی
۹۔ دینِ خدا کے پاسباں، آلِ نبیؐ کا قافلہ
راہِ وفا میں لٹ گیا، ابن علیؑ کا قافلہ

اور جو قابل ذکر ترانہ ہے وہ فوجی بینڈ کے انداز پر ہے۔ ۱۹۴۱ء میں کلکتے میں ریکارڈ ہوا تھا۔ اس میں کئی آوازیں شامل تھیں۔ مصرعے وہی فیاض ہاشمی نے لکھے تھے۔ اسے آپ مارچنگ سانگ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ سازینہ ستار، سارنگی والا نہیں بلکہ

کلکتے کے نیو مین آرکسٹرا نے بجایا تھا خالص مغربی انداز کی موسیقی ہے:

تقلیدِ محمدؐ بھول نہ جا   توحید کا ڈنکا آج بجا
تو مسلم ہے یہ یاد رہے   آزاد ہوا آزاد رہے
تیری دنیا آباد رہے   دنیا اک اپنی نئی بنا
اسلام سکوں کا سایہ ہے   انساں نے یہاں کچھ پایا ہے
فیاضؔ یہ جب سے آیا ہے   محتاج غنی کا فرق مٹا

اگر یہ درست ہے کہ یہ ترانہ ۱۹۴۱ء میں ریکارڈ ہوا تھا تو اُس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے عروج پر تھی اور ممکن ہے یہ ریکارڈ مختلف محاذوں پر گئے ہوئے مسلمان فوجیوں کے لئے تیار کرایا گیا ہو۔ اگر مل سکے تو سنئے ضرور۔

اخباروں نے لکھا، سونے جیسی آواز والے طلعت، مخمل جیسی آواز والے طلعت، ریشمی آواز والے شہنشاہ غزل طلعت محمود چل بسے۔ ایک انگریزی اخبار نے رومن حروف میں لکھا: خدا حافظ طلعت۔ ایک اور انگریزی اخبار نے ان ہی کے نغمے کو اپنی سرخی بنایا: میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا۔

سنہ ۱۹۹۸ء تھا اور مئی کی نو تاریخ، وہ سکون کے سائے کی تلاش میں وہاں چلے گئے جہاں لوٹ کر سب کو جانا ہے۔

اختری بائی فیض آبادی

غزل پر اختری بائی کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ کیفی اعظمی کہہ گئے ہیں کہ لفظ غزل کے دو معنی ہیں، ایک تو خود غزل، دوسرے اختری بائی۔

اب دنیا انہیں بیگم اختر کہتی ہے مگر میرا اختری بائی فیض آبادی پر اصرار یوں ہے کہ غزل گائیکی کی دنیا میں انہوں نے دھوم اسی نام سے مچائی۔ بیس برس کی تھیں جب انہوں نے کلکتے میں سرکردہ حاضرین کے جلسے میں اپنی گلوکاری کا مظاہرہ کیا اور چوبیس برس کی تھیں جب انہوں نے بہزاد لکھنوی کی شہرۂ آفاق غزل گائی:

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے

اس غزل میں تین خوبیاں ہیں، اوّل تو اختری بائی کی وہ نوعمری کی آواز جب ایک دنیا ان پر فدا تھی، دوسرے ان پر دل و جان سے مہربان شاعر کے جذبے میں ڈوبا ہوا کلام، تیسرے گلوکارہ سے ایک قدم پیچھے چلتی ہوئی نہایت ماہرانہ سارنگی۔ یوں سمجھئے کہ جب وہ کہہ چکتی ہیں "دیوانہ بنانا ہے تو" اس کے ایک لمحے بعد سارنگی آہستہ سے کہتی سنائی دیتی ہے "ہے تو۔"

سوا تین منٹ کے گانے میں جب صرف تین شعر گانے کا چلن تھا، اختری نے اس مختصر دورانیے میں اپنے محبوب شاعر کے پانچ شعر سمو دیئے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انہوں نے پوری غزل تیزی سے گا دی لیکن سمجھنے والے جانتے ہیں کہ پے در پے شعر پر شعر آنے میں جو لطف تھا، وہ بعد کی نجی محفلوں میں فرصت سے گائی جانے والی غزل میں نہ تھا۔

اگر دنیا میں ہر گانے والے کے کسی ایک نغمے کو اس کی بہترین تخلیق قرار دینا پڑے تو اختری بائی کی یہی غزل سب سے عمدہ قرار پائے گی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ گانوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں تو دیکھئے گا کہ یہ غزل بڑی عمر پائے گی۔

اختری بائی ابھی بیس برس کی بھی نہیں تھیں کہ انہیں موسیقی کے فرنگی دارالحکومت کلکتے جانے کا اتفاق ہوا۔ ظاہر ہے اُس وقت تک وہاں گوہر جان، ملکہ جان اور جانکی بائی کے نغمے گونج رہے ہوں گے۔ اختری نے کچھ تو ان کا اثر قبول کیا۔ اوپر سے انہیں استاد جھنڈے خان کی شاگردی کا شرف ملا۔ یہی سبب تھا کہ شروع میں انہوں نے بائیوں کے انداز میں ٹھمری اور دادرے گائے۔ استاد جھنڈے خان خالص کلاسیکی طرز کے موسیقار تھے، ان کی رفاقت میں اختری نے بھی کلاسیکی رنگ اختیار کیا اور پھر آخر عمر تک جو غزل بھی گائی کلاسیکی ڈھنگ سے گائی۔

ایک بار میں نے استاد روی شنکر سے نہایت اناڑیوں جیسا سوال کیا اور پوچھا کہ "کیا کلاسیکی موسیقی کو گاؤں گاؤں پہنچایا جا رہا ہے؟" انہوں نے کہا: "جی نہیں۔ کلاسیکی

موسیقی، جیسا کہ اس لفظ سے ظاہر ہے، ایک خاص کلاس کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔"

یہی سبب ہے کہ اختری بائی عرف بیگم اختر کے گانے کے انداز کو سراہا تو بہت گیا لیکن گھر گھر گایا نہیں گیا۔ سہگل کی تقلید میں اس دور کے بہت سے گانے والوں نے اساتذہ اور خصوصاً غالب کا کلام بہت گایا لیکن یہ بات کہتے ہوئے عجب سا احساس ہوتا ہے کہ جب تک یہ کلام فلم میں نہیں گایا گیا، عوام اسے نہیں گنگنا سکے۔

اس لئے میں کہوں گا کہ بیگم اختر کی گائی ہوئی عمدہ غزلیں ایک خاص کلاس تک مقبول ہوئیں۔ ہر چند کہ انہیں حکومت کے اعلیٰ ایوارڈ دیئے گئے مگر ان کی گائی ہوئی وہی غزلیں مشہور ہوئیں جو جدید شاعروں نے لکھیں اور نسبتاً جدید انداز میں گائی گئیں۔ ان شاعروں میں فیض احمد فیض (شام فراق اب نہ پوچھ) اور شکیل بدایونی (اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا) سرفہرست ہیں، اور شکیل نے کیسے کیسے شعر نکالے:

مرے ہم سفر، مرے ہم نشیں، مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں دردِ عشق سے جاں بہ لب، مجھے زندگی کی دعا نہ دے
مجھے چھوڑ دے مرے حال پر، ترا کیا بھروسہ ہے چارہ گر
یہ تری نوازشِ مختصر میرا درد اور بڑھا نہ دے
وہ اٹھے ہیں لے کے خُم و سُبو ارے او شکیلؔ کہاں ہے تو
ترا جام لینے کو بزم میں کوئی اور ہاتھ بڑھا نہ دے

ملکہ پکھراج

ان دنوں پیدا ہوئیں جب ہر طرف گوہر جان، ملکہ جان اور جانکی بائی کا شہرہ تھا۔ جموں کے علاقے میر پور میں پیدا ہوئیں جہاں دریائے توی لہریں لیتا نظر آتا تھا۔ علاقے میں مہاراجا ہری سنگھ کی حکمرانی تھی جنہیں خود بھی موسیقی سے لگاؤ تھا۔ ایسے میں گھر والے انہیں جموں لے گئے جہاں مہاراجا کا جشن تاج پوشی تھا۔ خدا جانے کیسے مہاراجا کو رضامند کر لیا گیا کہ وہ اس نو برس کی لڑکی کا گانا سنیں۔ ملکہ پکھراج نے دربار میں گا کر کچھ ایسا جادو ڈالا

کہ وہیں بسیرا کر لیا اور بھری جوانی تک شاہی گلوکارہ بن کر رہیں۔

ان کی وہ فلم اب تک بحفاظت محفوظ ہے جو مہاراجا نے یورپ سے آئی ہوئی فلم سازوں کی ایک ٹیم سے بنوائی اور جس میں ملکہ پکھراج نے محل کے کسی آراستہ کمرے میں سیاہ ساڑھی پہن کر اور ٹہل ٹہل کر گانا گایا۔ برطانوی ٹیلیویژن پر وہ فلم دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ملکہ پکھراج مہاراجا کشمیر کی منظور نظریوں ہی تو نہیں تھیں۔

محل چھوڑ کر وہ عوام میں آ گئیں اور پھر اُن کی خاطر جو نغمے گائے وہ آج بھی کانوں میں گونجتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے رسالے 'آواز' میں جس روز بھی ملکہ پکھراج کے گانے کا اعلان ہوتا تھا، لوگ ریڈیو سے کان لگا کر سنتے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں جب آل انڈیا ریڈیو کی گولڈن جوبلی کا جشن ہوا تو اُس وقت زندہ اور موجود پرانے ریڈیو آرٹسٹوں کو دلّی بلایا گیا۔ ملکہ پکھراج پاکستان سے گئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ وہاں انہیں Legend of Voice کا اعزاز دیا گیا۔

میں ان کے مقبول نغموں کی فہرست ترتیب دینے لگا تو وہ طویل سے طویل تر ہوتی گئی مگر حفیظ جالندھری کی 'ابھی تو میں جوان ہوں' سرفہرست رہی۔ سنہ ۷۰ء کے عشرے کے شروع میں وہ اپنی بیٹی طاہرہ سیّد کے ساتھ برطانیہ آئیں اور ٹیلیویژن پر دونوں نے مل کر 'ابھی تو میں جوان ہوں' کے بول گائے۔ ملکہ پکھراج کے منہ سے ان الفاظ پر لوگوں کو لطف آیا لیکن جب نوعمر طاہرہ نے کہا کہ 'ابھی تو میں جوان ہوں' تو لوگوں کو پیار آیا۔ آیئے ان کے چند نغموں پر ایک نظر ڈالیں۔ ایسے نغمے جنہوں نے اعلیٰ شاعری کو کانوں کے راستے دل میں اتارا:

۱۔ بے زبانی زباں نہ ہو جائے　　راز الفت عیاں نہ ہو جائے

۲۔ زاہد نہ کہہ بُری کہ یہ مستانے آدمی ہیں　　تجھ سے لپٹ پڑیں گے یہ دیوانے آدمی ہیں

۳۔ وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں

۴۔ ہم بھی پیئیں تمہیں بھی پلائیں تمام رات　　جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات

۵۔ تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے　　حورانِ خُلد میں تری صورت مگر ملے

۶۔ جاگ سوزِ عشق جاگ

۷۔ لو پھر بسنت آئی

۸۔ وہ باتیں تری وہ فسانے ترے

۹۔ پیا باج پیالہ پیا جائے نا

۱۰۔ اور دوسری عالمی جنگ کے دوران بننے والا مشہور و معروف ریکارڈ:

'میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے   اب اڑوسن پڑوسن چاہے جو کہیں'

ملکہ پکھراج نے نوّے سال سے زیادہ عمر پائی۔ لاہور میں انتقال کیا۔ دو بیٹے اور چار بیٹیاں چھوڑیں۔ ان کے شوہر سرکاری افسر سیّد شبیر حسین شاہ تھے۔ لاہور کے ایک فلم اسٹوڈیو کی مالکہ تھیں۔ دو تین فلموں میں گانے بھی گائے اور بس۔

مجدد نیازی

طلعت محمود کے شروع کے برسوں میں، ان ہی کے شہر لکھنؤ میں اور اُسی آل انڈیا ریڈیو سے مجدد نیازی کی آواز اُبھری۔ انہوں نے بھی اپنی غزل گائیکی کی وجہ سے شہرت پائی اور وہ جو اکثر گانے والوں کا ایک گانا ضرور ایسا ہوتا ہے جو عرصے تک زندہ رہتا ہے۔ مجدّد نیازی کی آواز میں حسرت موہانی کی غزل نے بے پناہ شہرت پائی:

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں   الٰہی ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی   مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی   تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کے یاد آتے ہیں

اس کے علاوہ مجدد نیازی کی گائی ہوئی کچھ اور غزلیں جب تک تازہ رہیں، مقبول رہیں مگر جلد ہی بھلادی گئیں خصوصاً تقسیم ہند کے ہنگاموں کی وجہ سے بہت سے نوادر رُل گئے:

قصہ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں   دل ہو قابو میں تو اُس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

چاہتے ہیں وہ کہ اظہارِ شکایت چھوڑ دوں   یعنی الفت چھوڑ دوں اُس کی حکایت چھوڑ دوں

۔ آ کہ تجھ بن اِس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں   جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

جانا یہ کس طرح کہ محبت نہیں مجھے ہاں تجھ سے عرضِ حال کی جرأت نہیں مجھے

اس کے علاوہ مجد دنیازی کے دو گیت بھی شوق سے سنے گئے:

۱۔ جن باندھو زنجیرا کے پار نجر کہیں لگ جئی ہے

۲۔ بھلا بتاؤ اپنے من کی پیر مٹاؤں کیسے

ماسٹر مدن

پندرہ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے دنیا کو چھوڑ جانے والے اس نوعمر موسیقار نے بیک وقت موسیقی اور عبادت کا دامن یوں پکڑے رکھا کہ وہ گاتا تھا اس کے ساتھ فضا بھی گاتی تھی اور ماحول بھی سرشار ہو جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ ایک محفل میں ماسٹر مدن راگ جونپوری گا رہے تھے اور ایسا سماں بندھا تھا کہ لوگوں کو فضا میں خوش لباس راگنی کی شبیہ نظر آنے لگی اور جب تک انہوں نے گانا ترک نہیں کیا۔ راگنی کی شبیہ سے نور پھوٹتا رہا۔

ماسٹر مدن کمسنی ہی سے ریڈیو پر گانے لگے تھے۔ اس مختصر سی عمر میں انہوں نے اپنے آٹھ نغمے ریکارڈ کرائے۔ یہ بات سنہ چالیس کے آس پاس کی ہے۔ یوں تو یہ سارے ریکارڈ دستیاب ہیں اور انٹرنیٹ پر با آسانی مل جاتے ہیں لیکن ان میں جوامر ہو گئے وہ ساغر نظامی کی دو غزلیں ہیں جن میں آج ستّر برس بعد بھی تازگی بھری ہے اور جنہیں یاد دلانے کی اگر چہ ضرورت نہیں پھر بھی:

۱۔ یوں نہ رہ رہ کر ہمیں ترپایئے آیئے آجایئے آجایئے

۲۔ حیرت سے تک رہا ہے جہانِ وفا مجھے تم نے بنا دیا ہے محبت میں کیا مجھے

ان غزلوں کی طرزیں مشہور میوزک ڈائریکٹر حُسن لال بھگت رام کے بڑے بھائی امرناتھ نے بنائی تھیں اور ماسٹر مدن کے بڑے بھائی ماسٹر موہن نے وائلن بجایا تھا۔ کہتے ہیں کہ ماسٹر مدن گانے کے لئے آل انڈیا ریڈیو کے دلّی اسٹیشن جایا کرتے تھے اور وہاں کینٹین میں دودھ بڑے شوق سے پیا کرتے تھے۔ ایک روز کسی حسد کے مارے گویّے نے اُس دودھ میں پارا گھول دیا۔ اس کے بعد ماسٹر مدن بیمار رہنے لگے۔ ان کا بدن بخار

سے تپنے لگا آخر ان کے جوڑ اور ماتھا چاندی کی طرح چمکنے لگا اور کوئی دوا دارو کام نہ آئی۔ مرنے سے پہلے انہیں بھگت کبیر کے بچپن کے موضوع پر ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی لیکن ماں یا باپ دونوں نے صاف انکار کر دیا۔ کچھ عرصے بعد بیٹا چل بسا اور والدین ہاتھ ملتے رہ گئے کہ فلم میں کام کر لیا ہوتا تو اس کی چلتی پھرتی شبیہہ دیکھ لیا کرتے مگر اس کے بعد نہ اُس کی شبیہہ رہی نہ اس کی راگنی کی۔

ماسٹر مدن کے باقی تین ریکارڈوں کا بھی ایک چھوٹا سا قصہ ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ماسٹر مدن کی دو غزلوں کے ریکارڈ کے سوا ان کا کوئی نغمہ دستیاب نہ تھا۔ اُن ہی دنوں رام پور کے ایک نوجوان کو کہیں پرانے ریکارڈوں کے ذخیرے سے مدن کے تین ریکارڈ مل گئے۔ جامع مسجد کے نیچے مینا بازار میں پرانے ریکارڈ بیچنے والے ایک تاجر کو اس کی خبر ہوئی۔ وہ سیدھا رام پور پہنچا اور نوجوان کو بہلا پھسلا کر اسے بارہ جدید ایل پی پیش کئے اور ان کے بدلے ماسٹر مدن کے تینوں ریکارڈ لے گیا۔

عین ان ہی دنوں میرا رام پور جانے کا اتفاق ہوا اور اس نوجوان سے ملاقات ہوئی جو پرانے ریکارڈوں کا دیوانہ تھا۔ اُس نے مجھے ماسٹر مدن کے ریکارڈ ہاتھ سے چلے جانے کا قصہ سنایا اور بتایا کہ بعد میں جس نے بھی سُنا اُسے بیوقوف اور احمق ٹھہرایا۔ میں نے بھی اظہار افسوس کیا اور دو روز بعد دلّی میں جامع مسجد کے نیچے ریکارڈوں کے اُسی تاجر کے پاس جا پہنچا۔ میں نے اُسے عمدہ قسم کا سادہ کیسٹ دیا اور کہا کہ اس پر ماسٹر مدن کے سارے گانے ریکارڈ کر دیجئے۔ اُس نے ذرا اتراتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ اس ریکارڈنگ کا معاوضہ کیا ہوگا؟ اور خود اُس نے جھٹ بتا دیا "ایک ہزار روپے ہر گانے کے۔" میں نے کہا کہ مجھے پرانے گانے حاصل کرنے کا شوق ضرور ہے مگر اتنا بھی نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا کیسٹ واپس لے لیا اور چلا آیا۔ یہ خیال تھا کہ وہ آواز دے کر دام کچھ کم کر دے گا مگر توبہ کیجئے۔

واپس لندن آ کر مجھے اپنے دوستوں سے مدن کے وہ سارے گانے مل گئے جو میں نے انٹرنیٹ پر ڈال دیئے۔ ان میں تین بھجن ہیں، ایک گیت ہے اور دو پنجابی گانے

ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ انٹرنیٹ سے کوئی گانا جب کوئی دوسرا شخص لیتا رہتا ہے تو آپ کو علم ہو جاتا ہے۔ میرے ذخیرے سے بمشکل چار پانچ افراد نے وہ گانے اتارے اس کے بعد کسی نے ان کی طرف نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھا۔ اب تو انٹرنیٹ پر ماسٹر مدن کے سارے گانے با آسانی دستیاب ہیں۔ ان دو غزلوں کے بعد باقی گانے سن کر یہی احساس ہوتا ہے

مگر وہ بات کہاں ماسٹر مدن کی سی

کچھ اور گلوکار

غیر فلمی گانے گا کر شہرت پانے والے پرانے گلوکاروں میں ایک اہم نام وڈیا ناتھ سیٹھ کا ہے جو اپنے نام کے ساتھ ریڈیو سنگر بھی لکھتے تھے۔ بہت سریلے تھے اور آواز میں گداز تھا۔ ان کی گائی ہوئی چند غزلیں پسند کی گئی تھیں اور ریڈیو پر عرصے تک دہرائی گئی تھیں۔ میری نسل کے قارئین کے ذہنوں میں شاید وہ غزلیں اب بھی محفوظ ہوں یا نیچے دیئے ہوئے ان کے بول پڑھ کر یاد آ جائیں:

۱۔ میں لگی دل کی بجھالوں تو چلے جایئے گا
راز دل اپنا سنالوں تو چلے جایئے گا

۲۔ آنکھوں کو اشک بار کئے جا رہا ہوں میں
راز اُن پہ آشکار کئے جا رہا ہوں میں

۳۔ ہو چکا وعدہ کہ کل آیئے گا
دیکھئے اب نہ بدل جایئے گا

میں نے اُنہیں سنہ ۵۰ء سے ذرا پہلے زندہ ناچ گانے والی کسی ٹیم کے ساتھ دیکھا تھا۔

زندہ ناچ گانے والے طائفے شہر شہر گھوما کرتے تھے اور سینما گھروں میں اپنے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ ان فن کاروں میں جو شخصیت مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ تھیں زہرہ بائی انبالے والی۔ فلموں میں آنے سے پہلے انہوں نے غیر فلمی گانے گا کر ایک خاص وجہ سے

شہرت حاصل کی۔ وہ وجہ یہ تھی زہرہ بائی کے گانوں میں شوخی اور شرارت ہوتی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ان کے گانے اخلاق سے گرے ہوئے ہوتے تھے لیکن بلند اخلاق بھی نہیں ہوتے تھے۔ فلموں میں دھوم مچانے سے پہلے ان کا جو گانا گلی گلی (خصوصاً مردانے میں) گایا جاتا تھا، اس کے چند بول یوں ہیں:

چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلّی کھیلیں
پنیا بھرن گئی یوں کہے گودی میں لے لے
ماروں گی رسین کی چوٹ وہ تو ہنستا ہی ڈولے
اپنی سجریا (سیج) گئی یوں کہے گودی میں لے لے
ماروں گی جوبنا کی مار وہ تو ہنستا ہی ڈولے

جوبنا پر یاد آیا کہ فلم ساز ڈبلیو زیڈ احمد اپنی فلم من کی جیت (۱۹۴۴ء) میں جوش صاحب کا لکھا ہوا گانا ریکارڈ کرانا چاہتے تھے "میرے جوبنا کا دیکھو ابھار" اس کے بول بے حساب بے حجاب تھے اور سوال یہ تھا کہ کون سی گلوکارہ اسے گانے کے لئے تیار ہوگی۔ کہتے ہیں کہ شمشاد بیگم کو گانے کے مصرعے سنائے گئے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب زہرہ بائی انبالے والی کو یہ گانا گانے کی پیشکش کی گئی تو وہ جھٹ تیار ہو گئیں۔ یہ گانا بھی (مردانے میں) بہت مقبول ہوا۔

پرائیویٹ گانے گانے والوں میں ایک بڑا نام ایس ڈی برمن کا ہے جنہیں آگے چل کر عظیم میوزک ڈائریکٹر بننا تھا اور ساحر لدھیانوی کی بڑی بڑی نظموں کو موسیقی کا جامہ پہنانا تھا۔ ایس ڈی برمن زیادہ تر بنگالی گلوکاروں کی طرح بنگلہ گانے گاتے تھے مگر ان کے جس نغمے نے پورے برصغیر میں شہرت پائی وہ تھا:

دھیرے سے جانا بگین میں بھنورا

گیت اگرچہ ہندی میں بلکہ لوک گیتوں کی زبان میں ہے مگر اس میں غزل کی ساری نزاکتیں موجود ہیں۔

صورتحال یہ ہے کہ محبوب سو رہا ہے اور ڈر ہے کہ بھنورا باغ میں جائے گا تو محبوب

کی نیند میں خلل پڑے گا۔

آج ہے چاندنی راتی — میرے جیون کا ساتھی ہے جو
سووت ہے نیند مگن میں — بھنورا دھیرے سے جانا بگین میں
توری گن گن گنگار — توری جھن جھن جھنکار
بیدھا نہ ڈالے سپن میں — بھنورا دھیرے سے جانا بگین میں
کہیں پات نہ گر جائے کوئی — کہیں پھول نہ مرجھائے کوئی
ٹھیس لگے نا کلین میں — بھنورا دھیرے سے جانا بگین میں
اے ری کویلیا کو کو نہ بول — او پپیہے نہ کر تو کلول
پیا آ گئے ہمارے بھون میں — بھنورا دھیرے سے جانا بگین میں

ایس ڈی برمن بعد میں جب ہندوستانی فلموں کی موسیقی ترتیب دینے لگے تو اپنے ہی گائے ہوئے کئی بنگالی گانوں کی طرزوں پر اردو گانے لکھوائے جن میں ایک غزل بھی تھی: ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے (مجروح سلطان پوری۔ محمد رفیع، فلم: کالا پانی ۱۹۵۸ء) اور:

جانے کیا تو نے کہی، جانے کیا میں نے سُنی، بات کچھ بن ہی گئی (ساحر لدھیانوی۔ گیتا دت، فلم: پیاسا ۱۹۵۷ء)

بہت سے گانے والے ایسے ہیں جو اپنے گائے ہوئے کسی ایک گانے کے نام پر زندہ رہیں گے۔ ان میں سی ایچ آتما سرفہرست ہیں جو اگرچہ سہگل جیسی آواز کے مالک تھے اور فلم کے اندر اور باہر بہت سے گانے گاتے رہے لیکن ان کی آواز میں جو نغمہ بڑی عمر پائے گا وہ ہے:

پریتم آن ملو، دکھیا جیا بلائے، پریتم آن ملو

کہتے ہیں کہ یہ گیت مشہور موسیقار او پی نیّر نے فلموں میں آنے سے پہلے تیار کیا تھا۔ اس کے بول ان کی بیوی موہنی نیّر نے لکھے تھے۔ اُس وقت تک یہ دونوں اور سی ایچ آتما نسبتاً گمنام تھے۔ گراموفون کمپنی نے ستّر یا پچھتّر روپے دے کر ریکارڈ تیار کیا بعد میں

پتہ چلا کہ سُپر ہٹ ہونا اس گانے کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔ کچھ عرصے بعد او پی نیّر نے آسماں کو چھو لیا اور ایک وقت تھا جب بمبئی کے سب سے زیادہ اجرت لینے والے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ مجروح سلطان پوری کے تذکرے میں ان کا ذکر بھی بار بار آئے گا۔

'پریتم آن ملو' کے ذکر پر یہ دلچسپ بات ذہن میں آئی کہ سی ایچ آتما کے بعد یہی گانا گیتا دت نے فلم مسٹر اینڈ مسز 55 (۱۹۵۵ء) کے لئے بھی گایا۔ اگر چہ اس بار بھی میوزک ڈائریکٹر او پی نیّر ہی تھے لیکن اس میں وہ آتما والی بات نہ آسکی۔ اس بار وہی نغمہ کمزور ثابت ہوا۔ جو بات یہاں قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ فلموں میں جب بھی کوئی گانا مردانہ آواز میں اور الگ سے وہی گانا نسوانی آواز میں ریکارڈ ہوتا ہے تو بیشتر یہ ہوا کہ نسوانی آواز میں وہی گانا مقبول نہ ہو سکا۔ دو مثالیں:

مجاؔز کی مشہور نظم 'اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں'، فلم ٹھوکر (۱۹۵۳ء) میں سردار ملک کی موسیقی میں طلعت محمود نے بھی گائی اور آشا بھوسلے کی آواز میں بھی ریکارڈ ہوئی۔ طلعت محمود بازی لے گئے۔

مثال کے طور پر ایک اور گانا فلم ٹیکسی ڈرائیور (۱۹۵۴ء) میں طلعت محمود نے گایا اور یہی گانا لتا منگیشکر جیسی منجھی ہوئی گلوکارہ کی آواز میں بھی پیش کیا گیا۔ ساحر کے لکھے ہوئے بول تھے: "جائیں تو جائیں کہاں، سمجھے گا کون یہاں، درد بھرے دل کی زباں۔" لتا گانے کو سنبھالنے میں ناکام رہیں۔ انہوں نے یہ گانا نہ گایا ہوتا تو اچھا تھا۔

غیر فلمی گانوں اور غزلوں کی اس گفتگو کے خاتمے پر میں غزل کے محاذ کے ایک گمنام سپاہی کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جسے زمانے نے بھلا دیا۔ وہ تھے آر ایل بھٹناگر جن کی گائی ہوئی دو غزلیں میرے ذخیرے میں ہیں۔ اوّل حفیظ ہوشیار پوری کا کلام:

رنگ بدلا یار کا وہ پیار کی باتیں گئیں وہ ملاقاتیں گئیں وہ چاندنی راتیں گئیں

راہ و رسمِ دوستی قائم تو ہے لیکن حفیظ ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

اور دوسری غزل داغؔ دہلوی کی ہے:

لگ چلی باد صبا کیا کسی مستانے سے
جھومتی آج چلی آتی ہے میخانے سے
روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے
ایک چلّو میں بہت داغ بہک اٹھتے ہیں
آج سنتے ہیں نکالے گئے میخانے سے

اور آخر میں فیاض ہاشمی کا لکھا ہوا نغمہ جو ۱۹۴۱ء کے لگ بھگ طلعت محمود نے گایا تھا اور جس میں گیت کے آنگن پر غزل کے صحن کا اور ان دونوں پر نغمے کے دالان کا گمان گزرتا ہے اور یہی کلکتے کے جواں سال شاعر کی ایجاد تھی:

کیسا پیار کیا تھا تم نے
آج گھراہوں میں کانٹوں میں دامن آج چھڑاتی ہو تم
کل تھے پھول مرے ہاتھوں میں آنچل بچھا دیا تھا تم نے
آج مرا پیالہ ہے خالی تم ہو توڑ کے جانے والی
کل امرت سے بھرا یہ پیالہ میرے ساتھ پیا تھا تم نے
چلا گیا سکھ میرے گھر سے آج چلے تم جگ کے ڈر سے
کل میرے دل کی خوشیوں سے اپنا دل بھر لیا تھا تم نے
کیسا پیار کیا تھا تم نے

اے چاند چھپ نہ جانا

اب یوں کریں کہ سنہ ۴۰ء کے عشرے کے دوران جاری ہونے والی فلموں کا ایک جائزہ لیں کیونکہ وہ جو برصغیر کی فلموں کا سنہری دور کہلاتا ہے، یہی ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء شروع ہوا تو موسیقی کی دنیا پر تین بہت بڑے موسیقار چھائے ہوئے تھے، انل بسواس، گیان دت اور کھیم چند پرکاش۔ ان کے علاوہ افق پر ایک نیا ستارا چمکنے لگا تھا، نوشاد علی۔

سنہ ۱۴۱ء میں ہندوستان کی فلمی صنعت کا سب سے خوبصورت گانا تیار ہوا۔ فلم کا نام تھا بیٹی، موسیقار تھے گیان دَت اور نغمے لکھنے والوں میں ایک بڑا نام دینا ناتھ مدھوک کا تھا جو آگے چل کر مہا کوی ڈی این مدھوک کہلائے۔ بیٹی کا یہ گانا اُس دور کی سب سے سریلی آواز کی مالک خورشید نے گایا تھا اور اس کے بول تھے:

نینوں سے نینا ملا کے، نیاری چھب دکھلا کے
اب بولو کاہے بھاگے

جس نے خورشید کی آواز میں یہ بنگلہ طرز نہیں سنی وہ موسیقی کی حقیقی مٹھاس سے محروم ہے۔

اسی برس اشوک کمار اور دیویکا رانی کی میوزیکل فلم انجان آئی اور محبوب نے فلم بہن بنائی۔ اُسی زمانے میں کیدار شرما کی کلاسیکی فلم چترلیکھا پیش کی گئی جس کی موسیقی استاد

جھنڈے خاں نے ترتیب دی تھی اور سارے گانے صبح کے مقبول راگ بھیرویں میں کمپوز کیے گئے۔ چتر لیکھا کے دو گانے بہت مقبول ہوئے۔ پہلا رام دلاری کی آواز میں تھا: نیل کمل مُسکائے بھنورا جھوٹی قسمیں کھائے۔ اور دوسرا مشہور نغمہ بھی رام دلاری نے گایا تھا: تم جاؤ بڑے بھگوان بنے۔ انسان بنو تو جانیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کیدار شرما نے ۲۳ برس بعد فلم چتر لیکھا دوبارہ بنائی۔ اس بار موسیقی روشن لال نے ترتیب دی۔ گانے ساحر لدھیانوی نے لکھے جو محمد رفیع اور لتا منگیشکر کی آواز میں تھے۔ پرانی چتر لیکھا کے گانے "رُت آئے رُت جائے پنچھی" کے انداز میں ساحر نے جدید گانا لکھا: من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے۔ وہ نرموہی موہ نہ جانے، جن کا موہ کرے۔" اور پرانے گانے "تم آئے بڑے بھگوان بنے، انسان بنو تو جانیں" کے جواب میں ساحر نے لکھا: "سنسار سے بھاگے پھرتے ہو، بھگوان کو تم کیا پاؤ گے۔" یہ بات ۱۹۶۴ء کی ہے۔

اس سال نوشاد علی کی دو فلمیں 'درشن' اور 'مالا' آئیں اور آ کر چلی گئیں۔

مگر جو تماشا قابل ذکر ہے وہ نیو تھیٹرز، کلکتہ کی فلم ڈاکٹر ہے جس کے نغمے آرزو صاحب نے لکھے اور اس بار اردو غزل کی بولی بے تکان استعمال کی۔ فلم ڈاکٹر میں پنکج ملک کے یہ گانے بہت سے لوگوں کو یاد ہوں گے:

۱۔ چلے پون کی چال جگ میں

۲۔ کب تک نراش کی اندھیاری

۳۔ مہک رہی پھلواری ہمری ___ اور دو یادگار نغمے:

۴۔ گزر گیا وہ زمانہ کیسا

۵۔ آج اپنی محنتوں کا مجھ کو ثمرہ مل گیا

جس میں خود کھویا ہوا تھا میں وہ صحرا مل گیا

رہ گیا ملنے سے کیا جب چین دل کا مل گیا

پھول یہ ہاتھ آ گیا تو باغ سارا مل گیا

سوکھے پتّے جھاڑ کر سرسبز ہوتے ہیں شجر
جتنا کچھ لٹتا رہا اس سے زیادہ مل گیا
آرزو تسکینِ دل کو آرزوئیں بے شمار
یہ نہ سوچو کیا نہ پایا یہ کہو کیا مل گیا

"نہ جانے کدھر آج میری ناؤ چلی" جیسا مقبول عام گانا لئے اشوک کمار اور لیلا چٹنس کی فلم جھولا جاری ہوئی تو عام لوگوں میں دو اور ہی گانے مشہور ہوئے: چنا جور گرم بابو میں لایا مجے دار چنا جور گرم ___ اور: میں تو دلّی سے دلہن لایا رے او بابو جی۔ فلم جھولا میں ناؤ کے گانے کا دوسرا حصّہ مجھے عمر بھر یاد رہے گا:

ہم نے کسی سے سُنی کہانی ایک سفر ہے یہ زندگانی
جس کو پگلے تو کہتا ہے اپنا پریت کی دنیا کا جھوٹا ہے سپنا
ان کا پھولوں سے رشتہ ہی کیا جن کی قسمت ہو کانٹوں کے بیچ پلی رے
چلی رے چلی رے مری ناؤ چلی رے

پھر پنچولی آرٹ پکچرز، لاہور کی فلم خزانچی میں غلام حیدر کی موسیقی اور ولی صاحب کے نغمے نے شہرت پائی۔ مجھے یاد ہے کالج کے لڑکے لڑکیاں سائیکلوں پر گاتے چلے جا رہے تھے:

ساون کے نظارے ہیں آہا آہا کلیوں کی آنکھوں میں مستانہ اشارے ہیں
لڑکے: جوبن ہے فضاؤں میں کھو جائیں گلے مل کر مخمور گھٹاؤں میں
لڑکیاں: اُس دیس چلیں سجنی پھولوں کے جوبن پر بھنورے نہ مریں سجنی
لڑکے: اُس دیس میں کیا جانا پیار کے راگوں سے جو دیس ہو بیگانہ
لڑکیاں: تم پریت کو کیا جانو آگ سے مت کھیلو اے حسن کے دیوانو

کلکتے کے فلم ساز ادارے نیو تھیٹرز میں ابھی دم خم باقی تھا جسے رائے چند بورال کی موسیقی، آرزو لکھنوی کے نغموں اور کندن لال سہگل اور کانن دیوی کی آواز جیسے چار ستونوں نے اٹھا رکھا تھا۔ ۱۹۴۱ء ہی میں ان کی فلم لگن جاری ہوئی جس میں سہگل کے یہ گانے

شامل تھے:

۱۔ کاہے کو راڑ مچائی، چھوڑو جی یہ چتورائی

۲۔ یہ کیسا انیائے داتا

۳۔ ہٹ گئی لو کالی گھٹا چٹک رہے تارے

۴۔ میں سوتے بھاگ جگا دوں گا۔

ان ہی دنوں بامبے ٹاکیز کی فلم نیا سنسار میں اشوک کمار کے ساتھ رینوکا دیوی نمودار ہوئیں۔ اور ان دونوں نے یادگار گانا گایا: ایک نیا سنسار بسالیں، ایک نیا سنسار۔ آج ہم انہیں بیگم خورشید مرزا کے نام سے جانتے ہیں کیونکہ ۱۹۸۹ء میں اپنے آخری دنوں تک انہوں نے پاکستان ٹیلیویژن پر نہایت عمدہ اداکاری کی۔ وہ علی گڑھ کے خواتین کے کالج کے بانی شیخ عبداللہ اور وحید جہاں بیگم کی بیٹی تھیں اور اعلیٰ مسلم خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کے باوجود انہوں نے فلم کی دنیا میں قدم رکھا اور نام پایا۔

چونیاں، قصور سے کلکتہ آئی ہوئی نوعمر لڑکی ارشاد بیگم، جو شہلا کے نام سے فلموں میں چھوٹے موٹے رول کیا کرتی تھی۔ اب جونکھر کر خورشید بانو بنی تو پوری صنعت پر چھا گئی۔ اس کا نازک ناک نقشہ، گھنگھریالے بال اور سریلی آواز نے اپنا سکّہ منوالیا یہاں تک کہ جب تان سین کی محبوبہ بنانے کے لئے اداکاراؤں کی تلاش شروع ہوئی تو ہر ایک کی نگاہِ انتخاب خورشید پر پڑی۔

۱۹۴۱ء میں ان کی فلم پردیسی تیار ہوئی جوان کی کمپنی رنجیت مووی ٹون نے بنائی تھی۔ اس کے موسیقار وہی تان سین اور محل والے کھیم چند پرکاش تھے۔ گانے مہا کوی ڈی این مدھوک نے لکھے تھے اور ان کی فہرست کچھ یوں ہے:

۱۔ میری اٹریا ہے سونی موہن نہیں آئے

۲۔ دو نین تمہارے، دو نین ہمارے

۳۔ ٹوٹ گئی ڈالی، بکھر گئے تنکے، اب کہاں بسیرا اپنا ——— اور یہ یادگار گانا

۴۔ پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا   یوں ہم کو نہ دنیا سے بیزار کیا ہوتا

اب تیرے سوا کوئی آنکھوں میں نہیں جچتا ۔ دوروز تو پردوں میں گلزار کیا ہوتا
معلوم اگر ہوتا انجام محبت کا ۔ نہ دل ہی دیا ہوتا نہ پیار کیا ہوتا

صاف ظاہر ہے کہ مدھوک صاحب غزل کے شاعر نہیں تھے مگر کبھی کبھی اس کی بھی مشق کرلیا کرتے تھے۔ رینوکا دیوی کی طرح خورشید بھی بعد میں پاکستان چلی گئیں اور وہاں کامیاب نہ ہوسکیں۔ ان کے ساتھ رفیق غزنوی بھی تھے۔ ان کی باقی عمر بھی ریڈیو پاکستان کی نذر ہوئی۔

یہیں ان کے مشہور گانے کا ذکر آ گیا جو انہوں نے خان مستانہ کے ساتھ مل کر سہراب مودی کی فلم سکندر میں گایا تھا:

زندگی ہے پیار سے پیار میں بِتائے جا
حُسن کے حضور میں اپنا سر جھکائے جا

پھر اے آر کاردار کی فلم سوامی آئی۔ رفیق غزنوی نے طرزیں بنائیں۔ شاطر غزنوی نے بول لکھے۔ راج کماری نے گانے گائے۔ سارے کے سارے ۱۹۴۱ء کی طرح ختم ہوگئے۔

اور اب ذکر ہے ایک اور دل کش اور باکمال اداکارہ ممتاز شانتی کا۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی دھومیں مچانے والی فلم بسنت نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ بامبے ٹاکیز کی اس فلم کے گانے گلی گلی گنگنائے گئے۔ اس کا کچھ سبب تو یہ تھا کہ اسکرین پر حرکت کرنے والے خوبصورت ہونٹ ممتاز شانتی کے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ پس پردہ آواز پارول گھوش کی تھی جو نہ صرف انل بسواس جیسے میوزک ڈائریکٹر کی بہن بلکہ اپنے وقت کے سب سے بڑے بانسری نواز پنّا لال گھوش کی بیوی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم بسنت کی موسیقی پنّا لال ہی نے ترتیب دی تھی لہٰذا فلم کے اکثر گانوں میں نہایت سریلی بانسری کی تانیں سنائی دیتی ہیں۔

فلم بسنت کی ایک اور خوبی اس کے نوعمر اداکار تھے۔ شاید اُن دنوں ہالی ووڈ میں چائلڈ اسٹار شرلے ٹیمپل کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی اس لئے بامبے ٹاکیز نے بھی دو کمسن

اداکار ڈھونڈ نکالے جن میں ایک سریش تھے جو غضب کے سریلے تھے اور پارول گھوش کی آواز میں آواز ملا کر گاتے تھے۔ دوسری نوعمر اداکارہ بے بی ممتاز تھیں جن کا ناک نقشہ صاف گواہی دیتا تھا کہ آگے چل کر فلم مغل اعظم (۱۹۶۰ء) میں اگر کسی کو انارکلی کا روپ دیا گیا تو یہی لڑکی ہوگی، جو مدھو بالا کے نام سے حسن پرستوں کے دل شاد کرے گی۔

فلم بسنت کے اداکاروں میں مشہور رقاص ممتاز علی بھی تھے اور چونکہ فلم کی کہانی ایک تھیٹر کے گرد گھومتی تھی اس لئے ممتاز علی کچھ ایسے گانوں پر رقص کرتے نظر آتے ہیں:

۱۔ گوری مو سے گنگا کے پار ملنا

۲۔ کانٹا لاگو رے سا جنوا مو سے راہ چلی نہ جائے

مگر جس گانے نے فلم کو چار چاند لگائے وہ اُس وقت گایا گیا جب ممتاز شانتی اور کمسن سریش مفلسی سے تنگ آکر ملازمت کی تلاش میں تھیٹر کے مالک کے پاس گئے جس نے انہیں دھتکار کر نکال دیا۔ اب دونوں نے باہر کھڑے ہو کر یہ گانا گایا:

تم کو مبارک ہوں اونچے محل یہ

ہم کو ہیں پیاری ہماری گلیاں

ظاہر ہے کہ پھر کیا ہوا۔ تھیٹر کے مالک نے جو یہ آواز سنی تو دوڑا ہوا آیا اور دونوں کو جھٹ ملازمت دے دی۔ اس کے بعد تھیٹر کا کاروبار خوب چمکا۔ بسنت کی ایک غزل بھی مشہور ہوئی:

امید اُن سے کیا تھی اور کر وہ کیا رہے ہیں

خود ہی بنا رہے تھے، خود ہی مٹا رہے ہیں

کئی دوسرے اداکاروں کی طرح ممتاز شانتی بھی بعد میں پاکستان چلی گئیں اور ناقدری کا شکار ہو کر کچھ ویسی ہی مفلسی کے عالم میں مریں جس سے تنگ آکر وہ تھیٹر کی ملازمت کرنے گئی تھیں۔ سریش کو حاسدوں نے کوئی ایسی چیز پلا دی کہ اُس کی آواز ختم ہو گئی۔ بڑا ہو کر وہ اداکار تو بنا مگر پھر گا نہ سکا۔ بے بی ممتاز کے دل میں سوراخ تھا جس کا اُس زمانے میں کوئی علاج نہ تھا۔ مدھو بالا بننے کے باوجود وہ اس تکلیف سے نجات نہ پا سکی۔

کہتے ہیں کہ باپ ظلم کی حد تک سختی کرتے تھے۔ "شہزادہ سلیم" شادی کے لئے تیار تھے مگر ابّا جان اڑ گئے۔ غرض یہ کہ اپنے وقت کی سب سے خوبصورت اداکارہ صدمے اور بیماری سہتے سہتے ظلم کی دیوار میں زندہ چُنی گئی۔

سریش کو سیندور پلانے کی بات پر ماسٹر مدن یاد آتے ہیں جنہیں حاسدوں نے دودھ میں پارا پلا دیا تھا۔ ان کی آواز تو کیا مرتی' وہ خود ہی چل بسے۔

اُن ہی دنوں فلم بھگت سورداس دکھائی گئی۔ ایک ہی فلم میں مقبول موسیقی کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو، اُس کی بھگت سورداس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی۔ موسیقار گیان دت، نغمہ نگار ڈی این مدھوک اور گلوکار کے ایل سہگل اور خورشید بانو اُس وقت اپنے عروج کو چھو رہے تھے چنانچہ رنجیت مووی ٹون نے سہگل کو کلکتے سے بمبئی بلایا اور پندرہ دلکش نغموں کا ہار بنا کر فلمی صنعت کے گلے میں ڈال دیا۔ آیئے کچھ نغموں کی فہرست پڑھیں:

۱۔ مدھوکر شیام ہمارے چور (سہگل)
۲۔ جس جوگی کا جوگ لیا وہ جوگی بسیں بدیس۔ (خورشید اور سہگل)
۳۔ چاندنی رات اور تارے کھلے ہوں (خورشید اور سہگل)
۴۔ مدھر مدھر گا رے منوا (خورشید)
۵۔ پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے (خورشید)
۶۔ جھولی بھر تارے لادے رے، میں آنکھ مچولی کھیلوں گی (خورشید)
۷۔ رین بھئی اب ہوا سویرا (سہگل)
۸۔ سر پہ کدم کی چھیّا مرلیا باج رہی (راج کماری اور سہگل)
۹۔ قدم چلے آگے من پاچھے بھاگے (سہگل)
۱۰۔ نین ہین کو راہ دکھا پربھو (سہگل)
۱۱۔ نِس دن برست نین ہمارے (سہگل وغیرہ)
۱۲۔ نینا رے دیکھیں ان کے نین (خورشید)
۱۳۔ دن سے دوگنی ہو جائیں رتیاں (سہگل)

۱۴۔ میّا موری میں نہیں ماکھن کھایو (سہگل)

اِس پر یاد آیا کہ پاکستان ٹیلیویژن کے ایک پروگرام میں خورشید کی موجودگی میں بنجمن سسٹرز نے اس فلم کے دوگانے گائے تھے: مدھر مدھر گارے منوا اور پنچھی باورا۔ اس وقت خورشید کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے قابل تھے۔ اسی طرح لتا منگیشکر نے گزرے ہوئے گلوکاروں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے "شردھانجلی" کے نام سے جو البم بنایا اُس میں کندن لال سہگل کا بھگت سورداس کا گانا "نین ہین کو راہ دکھا پربھو" ڈوب کر گایا۔

۴۲ء میں کلکتے سے ایک اور موسیقی سے آراستہ فلم جواب آئی جس کی طرزیں کمل داس گپتا نے ترتیب دی تھیں اور کانن دیوی نے اپنی زندگی کے سب سے مقبول گانے گائے تھے خصوصاً 'دنیا یہ دنیا طوفان میل' اور دوسرا گانا 'اے چاند چُھپ نہ جانا، جب تک میں گیت گاؤں، یہ ساز زندگی کا جی بھر کے میں بجاؤں۔' اسی طرح 'کچھ یاد رہے تو سن کر جا، تو ہاں کر جا یا نہ کر جا۔'

یہاں کلکتے کی فلموں کا مزاج بدل رہا تھا۔ اس کے نغموں میں کڑے ہندی الفاظ کی جگہ عام فہم لفظ رواج پا رہے تھے۔ جواب کے نغمہ نگاروں میں ایک نام بیکل نظر آتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کون تھے؟

۴۲ء میں نور جہاں کا آفتاب طلوع ہونا تھا اور افق پر ثریا کا ستارا جگمگانے لگا تھا۔ پنچولی پکچرز کی فلم خاندان دھوم مچاتی ہوئی آئی۔ خاندان کی کہانی سید امتیاز علی تاج نے لکھی۔ یہ کہانی انگلستان کی مصنفہ ہنری ووڈ کے مشہور ناول East Lynne سے لی گئی تھی۔ اس کے گانے ڈی این مدھوک اور شوکت تھانوی نے لکھے تھے۔ ہیروئن نور جہاں تھیں جن کے نام سے لفظ بے بی نکال دیا گیا تھا حالانکہ فلم کے بیشتر گانوں میں ان کی آواز میں 'بے بی پنا' صاف جھلکتا ہے۔ بے حد دلکش تھیں، نہایت سریلی تھیں اور دل کو لبھانے والی باتیں، جو وہ تمام عمر کرتی رہیں، اُس وقت بھی کرتی تھیں چنانچہ خاندان کے ڈائریکٹر شوکت حسین رضوی کے دل پر جو بھی گزری ہوگی اسے تصوّر کرنا مشکل نہیں۔ خاندان کے ہیرو پران کرشنا تھے۔

اُن کے نام سے بھی لفظ کرشنا نکال دیا گیا۔ پھر ہوا یہ کہ نام کی تاثیر بدل گئی اور پران اتنے سنگ دل ولن بن گئے کہ فلم بین اُن سے نفرت کرنے لگے اور خود ان کے بقول، ماؤں نے اپنے بیٹوں کے نام پران رکھنا چھوڑ دیا۔

فلم خاندان ۱۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور کے ریگل سینما میں لگی اور ہر طرف اس کا ذکر شروع ہو گیا۔ اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی اور اس کے گانوں کی دھوم سن کر آر سی بورال جیسے بڑے موسیقار فلم دیکھنے آئے اور دنگ رہ گئے۔ اگر چہ قارئین کو خاندان کے چند گانوں کے بول ضرور یاد ہوں گے لیکن یہاں ان کی فہرست درج کرنا ضروری ہے:

۱۔ہم آنکھ مچولی کھیلیں گے،شوخ ستاروں سے ہل مِل کے،آنکھ مچولی کھیلیں گے

۲۔ میرے لئے جہان میں چین ہے نہ قرار ہے، دل میں ہیں بے قراریاں آنکھوں میں انتظار ہے

۳۔تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا،تارے ہیں مرے زخم جگر ان میں سما جا

۴۔میری امی کا راج بھلا

اس آخری گانے میں تو مدھوک صاحب کا انداز ہے، پہلے تین نغموں میں شوکت تھانوی کا دخل صاف نظر آتا ہے جنہیں ان کے دوست امتیاز علی تاج فلم میں لے گئے تھے۔ فلمی گانوں میں معیاری شاعری کا یہ انداز سیٹھ دل سکھ پنچولی کو اتنا ہی پسند آیا ہو گا کہ اپنی اگلی فلم پونجی کے گانے انہوں نے مدھوک، شوکت تھانوی اور بہزاد لکھنوی سے لکھوائے۔ پونجی کا ذکر تو آگے آئے گا، بہزاد صاحب کا ذکر یہاں یوں بھی آنا ہے کہ اسی برس محبوب کی فلم روٹی جاری ہوئی جس میں لکھنؤ کے اس شاعر کی پسندیدہ گلوکارہ اختری بائی فیض آبادی شریک تھیں۔ روٹی کے نغمے لکھنے والوں کے نام ملاحظہ ہوں: ڈاکٹر صفدر آہؔ، آرزو لکھنوی، وجاہت مرزا اور حضرت بہزاد لکھنوی۔ ریکارڈوں پر ڈاکٹر صاحب کا نام صفدر شاہ سیتاپوری لکھا گیا ہے۔

غضب یہ ہوا کہ محبوب صاحب نے فلم روٹی کے لئے اختری بائی کی آواز میں کم سے کم چھ نغمے ریکارڈ کرائے جو سب کے سب بے مثال تھے کیونکہ اُس بھری جوانی میں

اختری کی گلوکاری اپنے عروج پر تھی لیکن پھر یہ ہوا کہ فلم سے غالباً چار نغمے کسی وجہ سے نکال دیئے گئے۔ غنیمت یہ ہوا کہ اُن سب کے ریکارڈ محفوظ رہ گئے اور ڈھونڈنے والوں کو اب بھی مل جاتے ہیں۔

روٹی کی موسیقی انل بسواس جیسے نامور میوزک ڈائریکٹر نے ترتیب دی تھی اور اختری کی آواز میں یہ غزلیں اور گیت ریکارڈ کئے گئے تھے:

١۔ پھر فصل بہار آئی (صفدر)
٢۔ رہنے لگا ہے دلِ مین اندھیرا ترے بغیر (بہزاد)
٣۔ الجھ گئے نینوا، چھوٹے نہیں چھڑائے (آرزو)
٤۔ وہ ہنس رہے ہیں آہ کئے جا رہا ہوں میں (آرزو)
٥۔ اے پریم تری بلہاری ہو، ہم نیا قرینہ سیکھ گئے (صفدر)
٦۔ چار دنوں کی جوانی، متوالے پی لے پی لے (صفدر)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اختری بائی کا تنازعہ ہو گیا اور انہوں نے چھ کے چھ نغمے فلم سے نکال دیئے۔

ان ہی دنوں اے آر کاردار اپنی فلم نئی دنیا بنا رہے تھے جس کے میوزک ڈائریکٹر نوشاد علی تھے۔ فلم میں بوٹ پالش کرنے والے لڑکے کے گانے کے لئے آواز کی تلاش تھی۔ خدا جانے کہاں سے گھومتی گھامتی بے بی ثریا ان کے پاس پہنچی۔ نوشاد صاحب، اسے کاردار کے پاس لے گئے اور کہا کہ نوعمری میں لڑکوں لڑکیوں کی آوازیں ملتی جلتی ہوتی ہیں، کیوں نہ بوٹ پالش کا گانا اس بچی کی آواز میں بھر لیا جائے چنانچہ تنویر نقوی کا لکھا ہوا گیت آگے چل کر بڑی اداکارہ اور گلوکارہ بننے والی بے بی ثریا نے گایا:

بوٹ کروں میں پالش بابو بوٹ کروں میں پالش
گر جوتے پر چمک نہ آئے کر دو مجھ پر نالش

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ثریا کا بچپن پیچھے رہ گیا اور اُن ہی کاردار کی فلم شاردا میں

نوشاد کی موسیقی پر ثریا نے مدھوک کا یہ گانا گایا:

پنچھی جا، پیچھے رہا ہے بچپن میرا، اُس کو جا کے لا

شاید ابھی ثریا اتنی جوان نہیں ہوئیں کہ اسکرین پر یہ گانا خود گاتیں۔ یہ ان کا دوسرا پلے بیک گانا تھا۔ شاردا کا ایک اور گانا جو اُس وقت مقبول ہوا، جی ایم درّانی نے گایا تھا:

دنیا میں سب جوڑے جوڑے، عاشق پھریں نگوڑے

لیکن شاردا کا سب سے خوبصورت نغمہ گلوکارہ نرملا دیوی کے حصّے میں آیا:

تم نہیں آتے تو نہیں آؤ یاد سے کہہ دو وہ بھی نہ آئے

سنہ ۴۲ء خاتمے پر تھا جب پنچولی آرٹ پکچرز، لاہور کی فلم زمیندار نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس فلم کی کہانی برطانیہ کی ناول اور سوانح نگار Elizabeth Gaskell کے کسی ناول سے لی گئی۔ وہ غریبوں کی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی سے کرتی تھیں اور وہ خوبی فلم زمیندار میں خوب خوب نظر آتی ہے۔ اس کی موسیقی ماسٹر غلام حیدر نے ترتیب دی تھی اور نغمے لکھنے کا کام چار شاعروں کو سونپا گیا تھا: قمر جلال آبادی، بہزاد لکھنوی، ناظم پانی پتی اور دینا ناتھ مدھوک۔ فلم کے سب سے مقبول گانے پر اک ذرا سا تنازعہ ہے۔ گانا شمشاد بیگم کی آواز میں تھا:

دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا روتے ہیں تو ہنسنے کا پیغام نہیں ملتا

فلم کے کتابچے میں لکھا ہے کہ یہ نغمہ بہزاد صاحب نے لکھا تھا لیکن قمر جلال آبادی کا کہنا تھا کہ یہ ان کی زندگی کا پہلا فلمی نغمہ ہے، اس کے آخری چند مصرعے بہزاد صاحب نے لکھے تھے۔ قمر جلال آبادی آگے چل کر بڑے نغمہ نگار بننے والے تھے۔

فلم زمیندار کے مرکزی کردار کے لئے شانتا آپٹے کو بمبئی سے بلایا گیا تھا۔ ان کے گائے ہوئے کئی گانے مقبول ہوئے:

۱۔ چھوٹا سا سنسار ہمارا، چھوٹا سا سنسار

۲۔ ارمان تڑپتے ہیں پہلو میں مرے آکے
برباد ہو گئے ہیں اس گھر کو ہم بسا کے

۳۔ بوجھ سکو تو بوجھو ایک پہیلی بوجھو

۴۔ موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے۔اے گردھر گوپال

غلام حیدر کی پنچولی کے ساتھ یہ آخری فلم تھی۔اسٹوڈیو کی ملازمت کے عوض انہیں ہر مہینے ایک ہزار روپئے ملتے تھے۔اُسی دوران بمبئی سے بُلاوا آ گیا۔محبوب خان بہت بڑی فلم ہمایوں بنا رہے تھے۔ ماسٹر غلام حیدر کو اس فلم کی موسیقی ترتیب دینے کے ایک لاکھ روپئے ادا کئے گئے۔یہ اُس وقت کا سب سے بڑا معاوضہ تھا۔سچ تو یہ ہے کہ غلام حیدر اس سے بھی زیادہ کے مستحق تھے۔وہ مقبول موسیقی کو ایک تاریخی موڑ پر لے جا رہے تھے۔میرا خیال ہے لاہور میں وہ خوش نہیں تھے۔زمیندار میں ایک گانا انہوں نے اپنی آواز میں گایا:

لوگ مجھ کو خوش سمجھتے ہیں مگر میں غم میں ہوں (بہزاد)

اب فلم والے ہر طرف سے بمبئی پہنچنے لگے۔شوکت حسین رضوی اپنی ہونے والی دلہن نور جہاں کو لے کر لاہور سے بمبئی جا پہنچے۔ہمارے آرزو صاحب نے کلکتے کو خیر باد کہا اور بمبئی میں نیا نگر بسایا۔سہگل کی بہت بڑی فلم تان سین بن رہی تھی،انہیں بمبئی راس آ گیا۔خورشید بھی بمبئی کی ہو رہیں اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

۱۹۴۳ء میں انل بسواس کی موسیقی پر نکھار آیا اور ان کی فلمیں ہماری بات اور قسمت جاری ہوئیں۔ہماری بات میں ثریا کو اداکاری کا موقع بھی دیا گیا البتہ پارول گھوش کے گائے ہوئے نغمے مقبولیت پا گئے:

۱۔ میں ان کی بن جاؤں رے، میں ان کی بن جاؤں
پل چھن اُن کا پنتھ نہاروں نینن دیپ جلاؤں

۲۔ انسان کیا جو ٹھوکریں نصیب کی نہ سہہ سکے
انسان کیا جو گردشوں کے بیچ خوش نہ رہ سکے

۳۔ اے بادِ صبا اٹھلاتی نہ آ، میرا غنچۂ دل تو سوکھ گیا

اور وہ جو اکثر فلموں کا ایک عامیانہ سا گانا مقبول ہوتا ہے وہ ہماری بات میں بھی تھا:

۴۔بستر بچھا دیا ہے ترے در کے سامنے گھر ہم نے لے لیا ہے ترے گھر کے سامنے

ادھر کلکتے، کمل داس گپتا اور کانن دیوی میں ابھی دم خم باقی تھا چنانچہ ان کی فلم ہاسپٹل ریلیز ہوئی۔ کانن کی آواز میں تین گانے بہت پسند کئے گئے:

۱۔ پربھو جی تم راکھو لاج ہماری

۲۔ ذرا نینوں سے نیناں ملائے جاؤ رے مورے بانکے رسیلے سنوریا

۳۔ میری مجبوریوں نے میرا دامن چاک کر ڈالا

یہ آخری غزل پنڈت بھوشن نے لکھی تھی۔ آرزو لکھنوی نہ ہوئے۔

ان ہی دنوں سورن لتا کی فلم اشارہ پیش کی گئی جس کی موسیقی خورشید انور نے ترتیب دی تھی۔ بعد میں یہ دونوں پاکستان چلے گئے اور وہاں بھی نام پایا۔ فلم اشارہ کا ایک یادگار گانا گوہر سلطانہ نے گایا تھا:

شبنم کیوں نیر بہائے دنیا سوئے اور یہ روئے جائے شبنم کیوں نیر بہائے
جیسے برہن کے رونے پر ہنستے ہیں دھنوان
ویسے شبنم کے رونے پر کلیوں کی مُسکان
شبنم روئے کلیوں کا منہ دھوئے اپنی جان گنوا کر پگلی
جگ میں پھول کھلائے شبنم کیوں نیر بہائے
مورکھ ہیں جو چار گھڑی کے جیون پر اتراتے ہیں
ہنستے پھولوں کو دیکھو جو کھلتے ہی مرجھاتے ہیں
شبنم روئے مورکھ غافل سوئے رو رو کے شبنم اس جھوٹے جگ کا بھید بتائے
شبنم کیوں نیر بہائے

مدھوک کو مہا کوی قرار دینے کے لئے یہ ایک گانا کافی تھا۔

اشوک کمار اور ممتاز شانتی کے نغموں سے بھری فلم قسمت اُس دور کی نہایت کامیاب فلموں میں شمار ہوئی۔ اس کی موسیقی انل بسواس نے ترتیب دی اور اس کے زیادہ تر گانے امیر بائی کرناٹکی نے گائے خصوصاً دھیرے دھیرے آرے بادل دھیرے دھیرے جا۔ اس فلم میں مردانہ آواز ارون کمار کی تھی جو نہ صرف اشوک کمار کے کزن تھے بلکہ دونوں

کی آوازیں بھی ملتی تھیں۔ قسمت کے گانے پردیپ نے لکھے تھے جو ہندی کے مقبول شاعر تھے مگر قافئے کا خیال اس طرح رکھتے تھے جیسے غزل میں رکھا جاتا ہے چنانچہ دھیرے دھیرے آرے بادل میں ایک جگہ مشکل میں پڑ گئے۔ دوسرا مصرعہ تھا:

پھر یہ کس کی یاد آئی

اب آئی کا قافیہ نہیں مل رہا ہوگا تو انہوں نے لکھا:

کون گاتا ہے رباعی

قسمت کے مقبول گانوں کی فہرست طویل مگر ضروری ہے:

۱۔ دور ہٹو اے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے

۲۔ اب تیرے سوا کون میرا کرشن کنہیا
بھگوان کنارے سے لگا دے میری نیّا

۳۔ ہم ایسی قسمت کو کیا کریں ہائے
جو اک دن ہنسائے اک دن رُلائے

۴۔ تیرے دکھ کے دن پھریں گے لے دعا میری لئے جا

۵۔ اے دنیا بتا ہم نے بگاڑا ہے کیا ترا
گھر گھر میں دیوالی ہے مرے گھر میں اندھیرا

۶۔ پپیہارے میرے پیا سے کہوٴ جائے
سانوریا تری رادھا روئے رو رو عمر گنوائے
میں ہوں کتنی پاس پیا کے پھر بھی کتنی دور
ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور
پلک جھرو کے انکھیاں بیٹھیں نس دن آس لگائے
پپیہارے میرے پیا سے کہوٴ جائے
آج کدھر میں چلی اکیلی کانپ رہی میری جیون بیلی
اگر میرا دیپک بجھ جائے کسی پیڑ کے نیچے

پیارے پپیہا سجن سے کہنا اُن کا دامن کھینچے

تیری یاد میں رادھا مر گئی دل کا درد چھپائے

نوشاد علی کی فلم نمستے کے ایک نغمے کا پہلا بول ضرب المثل بن گیا، بالکل ویسے ہی جیسے پکار کے نغمے "زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے، بج رہا ہے اور بے آواز ہے" کہاوت بن گیا، گانا تھا "آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا" غزل کے انداز میں یہ گانا مدھوک صاحب نے لکھا تھا مگر پھر وہی بات کہ وہ غزل کے شاعر نہیں تھے۔

اس کے برعکس لاہور اور بمبئی میں تکمیل پانے والی فلم پگلی میں قمر جلال آبادی نے نہایت مرصع غزل لکھی:

امید تڑپتی ہے روتی ہیں تمنائیں دنیا کا اشارہ ہے دنیا سے چلے جائیں

اس حسن کی محفل میں ہم آئے تو کیوں آئے یا وہ ہی نہیں اپنے یا ہم ہی چلے جائیں

منزل پہ جنہیں آ کر منزل نہ نظر آئے وہ بھولے ہوئے راہی جائیں تو کدھر جائیں

جب اشک مچلتا ہے اک درد سا اٹھتا ہے تم آنکھ کو سمجھاؤ ہم درد کو سمجھائیں

قمر جلال آبادی اور مدھوک پرانی فلموں میں نغمے لکھتے لکھتے ہمارے زمانے تک چلے آئیں گے اور آگے چل کر ہم تفصیل سے ان کی بات کریں گے۔ فلم پگلی میں چار میوزک ڈائریکٹر تھے: جھنڈے خاں، گوبند رام، امیر علی اور رشید عطرےؒ جن کی زندگی کی یہ پہلی فلم تھی۔ آگے چل کر اور پاکستان جا کر وہ بڑی شہرت پائیں گے۔

لاہور کی ایک اور فلم پونجی کا ایک نغمہ بعض قارئین کو یاد ہوگا:

جھلک دکھا کر چھپی چاندنی سپنا چاند ہوا

پونجی کے نغمے مدھوک اور بہزاد لکھنوی کے ساتھ ساتھ شوکت تھانوی نے بھی لکھے تھے۔ شوکت صاحب اپنے وقت کے سب سے بڑے اور مقبول مزاح نگار تھے۔ ان کی کہانی سودیشی ریل آج تک ہنساتی ہے۔ جس میں انہوں نے تصور کیا تھا کہ آزادی کے بعد ریلوے کے نظام کا کیا حال ہوگا۔ بات اب ان کے تصور سے بھی آگے نکل چکی ہے۔ شوکت تھانوی تین سال تک روزنامہ جنگ میں میرے ایڈیٹر رہے۔ انہوں نے فلم سے اپنے تعلق کا کبھی

ذکر تک نہیں کیا۔ عملے کے نوجوان ان کے ساتھ کبھی کبھی بے تکلف ہو جاتے تھے اور ایک بار ان سے پوچھ لیا تھا کہ کیا وہی واہانوی کے نام سے کھلے کھلے ناول آپ ہی لکھتے تھے؟ بہت ناراض ہوئے۔ جتنے اچھے صداکار تھے اتنے ہی اچھے اداکار بھی تھے۔

۱۹۴۳ء ہی میں فلم رام راج کے دوگانے شوق سے سنے گئے۔ "بینا مدھر مدھر کچھ بول" اور دونو جوانوں کی آواز میں "بھارت کی ایک ستاری کی ہم کتھا سناتے ہیں۔"

سنہ ۴۳ء کی سب سے بڑی فلم تان سین تھی جس کے گانے مدھوک اور پنڈت اندر نے لکھے تھے اور طرزیں عظیم موسیقار کھیم چند پرکاش نے ترتیب دی تھیں۔ تان سین کی گائیکی کو نئی روح عطا کرنے کے لئے ان جیسا موسیقار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ فلم تان سین کے گانوں پر ایک نگاہ ڈالئے:

۱۔ گھٹا گھنگھور گھور، مور مچاوے شور مورے سجن آجا (خورشید)
۲۔ کاہے گمان کرے ری گوری (سہگل)
۳۔ رم جھم رم جھم چال تہاری (سہگل)
۴۔ مورے بالا پن کے ساتھی چھیلا بھول جائیونا (خورشید اور سہگل)
۵۔ سپت سُر ان تین گرام گاؤ سب گُنی جن (سہگل)
۶۔ دکھیا جیارا روتے نیناں (خورشید)
۷۔ اب راجا بھئے مورے بالم وہ دن بھول گئے (خورشید)
۸۔ بِنا پنکھ پنچھی ہوں میں (سہگل)
۹۔ دیا جلاؤ
۱۰۔ برسورے

تان سین کے بعض گانوں کے ساتھ وہی ساز بجائے گئے جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں رائج تھے۔

کلکتے سے رونق رخصت ہونے لگی تو فلموں میں بھی پہلی جیسی بات نہ رہی۔ زیادہ تر شاعر بمبئی چلے گئے البتہ رائے چند بورال جیسا میوزک ڈائریکٹر وہیں موجود رہا۔ انہوں

نے فلم واپس بنائی جس کے کچھ گانے قابل ذکر ہیں:

۱۔ جیون ہے بیکار بن تُمرے

۲۔ بھول نہ جانا آج کی باتیں

۳۔ ہم کو چوان پیارے

۴۔ تم نے مجھ سے پریم جتا کر دنیا سے بیگانہ کیا
دل تھا اک سکھ دکھ کا ساتھی اس کو بھی دیوانہ کیا
دل کا شیشہ نازک شیشہ ٹھیس لگی بس چور ہوا
بیتی جو کچھ مجھ پر بیتی لوگوں نے افسانہ کیا

رائے چند بورال کے ذکر پر یاد آیا کہ فلمی دنیا کو خیر باد کہہ کر انہوں نے کلکتہ چھوڑ دیا اور باقی عمر گزارنے کے لئے ذرا سوچیے کس شہر کو چنا۔ وہ خاموشی سے جا کر لکھنؤ میں بس گئے۔ آرزو صاحب کی صحبت کا کچھ تو اثر ہونا تھا۔ شہر میں وہ اتنی خاموشی سے وارد ہوئے کہ لکھنؤ والوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ پھر اچانک کسی کو پتہ چلا تو ہر ایک ان کی پذیرائی کو دوڑا اور مقامی ریڈیو اسٹیشن نے اُن کو بُلا کر ان کا انٹرویو نشر کیا۔ کچھ عرصے بعد وہ چل بسے۔

اس پر یہ بھی یاد آیا کہ سنہ ۹۶ء میں جب میں رام پور گیا اور ایک نوجوان سے ملا جسے پرانے گراموفون ریکارڈ جمع کرنے کا شوق ہے تو اُس نے اپنا واقعہ سنایا۔ وہ خود اور اس کے کچھ ساتھی موسیقار انل بسواس سے ملنے دہلی پہنچے۔ اس وقت وہ اسّی سے اوپر ہو چکے تھے اور تیس سال تک فلموں کی موسیقی ترتیب دینے کے بعد تقریباً تیس سال سے کنارہ کش تھے۔ لڑکوں نے ان کا گھر ڈھونڈ نکالا اور اندر پیغام بھجوایا کہ آپ سے نوجوان قدر دان ملنے آئے ہیں۔ انل بسواس نے جنہیں لوگ پیار سے انل دا کہتے تھے انہیں اندر بلا لیا۔ بات کر کے لڑکوں کا اندازہ ہوا کہ ان کی یادداشت ان کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ نوجوانوں نے ان سے کہا کہ موسیقی کے میدان میں آپ نے کارنامے کئے ہیں۔ کہنے لگے کہ مجھے یاد دلاؤ کہ میں نے کیا کیا ہے۔ لڑکوں کے گلے رندھ گئے اور وہ دیر تک انل دا کو یاد دلاتے رہے کہ انہوں نے فلم روٹی، قسمت، انوکھا پیار، ترانہ، وارث اور پردیس جیسی درجنوں فلموں میں

کیسی کیسی دل کو لبھانے والی طرزیں بنائیں۔

خاموشی سے سنتے رہے اور خلاؤں میں ماضی کی شبیہہ دیکھتے رہے۔

اور وہ جو ہر سال کم سے کم ایک عامیانہ سا گانا غیر معمولی شہرت پاتا تھا اور جسے لوگ سڑکوں پر گاتے پھرتے تھے، ۱۹۴۳ء میں وہ گانا نوشاد صاحب کی فلم سنجوگ میں نور محمد چارلی نے گایا تھا جس میں غالباً وہ بار بار کہتے تھے "پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے بھائی۔"

اسی سال محبوب کی فلم نجمہ میں یعقوب کا تکیہ کلام بہت مشہور ہوا تھا جس میں وہ ہیرو اشوک کمار سے کہا کرتے تھے "ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا۔"

یعقوب اپنی فلموں میں جا بجا شعر پڑھا کرتے تھے۔ لوگ یہ کہتے ہوئے ان کی فلم دیکھنے جاتے تھے کہ یعقوب شعر بہت اچھے پڑھتے ہیں۔ نجمہ کے گانے انجم پیلی بھیتی اور آرزو صاحب نے لکھے تھے۔ طرزیں رفیق غزنوی نے بنائی تھیں اور ایک روایت کے مطابق یہ محبوب پروڈکشنز کی پہلی پیشکش تھی۔

اسی سال کے ایک بہت دلکش نغمے کے بول مدھوک نے لکھے تھے اور طرز سی رامچندر نے بنائی تھی۔ فلم کا نام تھا زبان:

کاغذ کی تھی وہ ناؤ جس میں ہم جا رہے تھے — وہ ریت تھی جہاں پر ہم گھر بنا رہے تھے
جھوٹی تسلّیوں میں ہم دن گزارتے تھے — گانا تھا وہ کسی کا، ہم گنگنا رہے تھے

یہ سی رامچندر کا پہلا مقبول نغمہ تھا۔ ۱۹۸۰ء کے قریب لندن آئے تو ایک نجی محفل میں خود گا کر سنایا۔ اس پر لندن کی ایک اور محفل یاد آ گئی۔ اُن ہی دنوں دیوالی کا جشن تھا اور لندن میں ایک بڑا میلہ تھا۔ میلے والے کہیں سے سی رامچندر کو پکڑ لائے اور سینکڑوں عورتوں مردوں کے مجمع کے سامنے انہیں گانے کے لئے کھڑا کر دیا۔ وہ چتلکر کے نام سے خود بھی گاتے تھے اور کئی مقبول نغمے گا چکے تھے۔ اُس روز وہ گا رہے تھے اور مجمع میں بیٹھی ہوئی سینکڑوں ہندوستانی خواتین آپس میں باتیں کئے جا رہی تھیں۔ سی رامچندر بار بار کہتے کہ بہنوں سن لو، ارے سن لو، مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میں ان کے قریب گیا اور کہا کہ بھول جایئے ان خواتین کو اور آپ میری خاطر اپنا کمپوز کیا ہوا وہ گانا سنا دیجئے: "تم کیا

جانو تمہاری یاد میں ہم کتنا روئے۔" خالص بمبئی کے لہجے میں بولے کہ چل تیری خاطر سنا دیتا ہوں ورنہ یہ مجمع ایسے گانے سننے والا نہیں۔ فلم شِن شنا کی بوبلا بو (۱۹۵۲ء) میں لتا منگیشکر کا گایا ہوا یہ نغمہ روح میں اتر جاتا ہے۔ وہ گاتے رہے۔ عورتیں باتیں کرتی رہیں۔ آخر میں اپنا ہارمونیم بند کرنے سے پہلے بولے "اچھا لو، اب یہ گانا سنو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فلم شہنائی (۱۹۴۷ء) کا اپنا ہی گایا ہوا گانا شروع کیا" آنا میری جان میری جان سنڈے کے سنڈے" عورتیں باتیں واتیں بھول کر اس گانے میں شریک ہو گئیں اور سارا مجمع دیر تک سنڈے کے سنڈے گاتا رہا اور دیوالی کی خوشی میں اپنے اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ کرتا رہا۔

بعد میں برمنگھم کی ایک نجی محفل میں انہوں نے 'تم کیا جانو' گا کر سنایا اور فلم کے نام کی مزے لے لے کر تشریح کی تو مجمع ہنستے ہنستے نڈھال ہو گیا۔ کہنے لگے کہ پیارے لال سنتوشی 'شِن شِنا کی بوبلا بو' کے نام سے یہ فلم بنا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا الا بلا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ انڈونیشیا کی ایک پریم کہانی ہے جس میں لڑکی کا نام شِن شنا کی اور لڑکے کا نام بوبلا بو ہے اور فلم میں یہ گیت شن شنا کی گا رہی ہے۔

بہت پر لطف باتیں کرتے تھے مگر وہی خالص بمبئی کے انداز میں۔ چند ماہ بعد (۱۹۸۲ء) میں انتقال کر گئے۔

انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے

سن ۱۹۴۴ء موسیقار اعظم نوشاد علی اور مہا کوی ڈی این مدھوک کی زندگی میں انقلاب لے کر آیا۔ اُس برس ان کی فلم رتن دھوم مچاتی ہوئی آئی۔ زہرہ بائی انبالے والی جو شوخ گانے گاتی ہوئی فلمی دنیا میں آئی تھیں، رتن کے گانے گا کر اس دنیا پر چھا گئیں۔ یہاں تک کہ اداکار کرن دیوان کہ گانا جن کے بس کا روگ نہیں تھا، رتن میں 'ساون کے بادلو' گا کر گلوکار بن گئے (یاد رہے کہ اس فلم کے مالک کرن دیوان کے بڑے بھائی تھے)

رتن کے گانوں کی شاعری غیر معمولی نہیں تھی۔ اُس میں غزل کی نزاکتیں نہیں تھیں، ویسے بھی یہ مدھوک صاحب کا میدان نہیں تھا لیکن انہوں نے عوامی انداز کے نغمے لکھے اور نوشاد نے روایتی انداز کی طرزیں بنائیں جنہیں لوک دھنیں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک نظر گانوں کے بول پر:

۱۔ رم جھم برسے بادروا مست ہوائیں آئیں (زہرہ)
۲۔ انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا (زہرہ)
۳۔ پردیسی بالما بادل آئے آ، تیرے بنا کچھو نہ بھائے آ (زہرہ)
۴۔ جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس (کرن دیوان)
۵۔ ساون کے بادلو اُن سے یہ جا کہو (کرن دیوان اور زہرہ)
۶۔ آئی دیوالی، دیپک سنگ ناچے پتنگا (امیر بائی کرناٹکی)

۷۔ او جانے والے بالموا لوٹ کے آ (امیر بائی۔شام کمار)
۸۔ مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں (امیر بائی)
۹۔ جھوٹے ہیں سب سپن سہانے، انگڑائی تیری ہے بہانا (منجو)

اُس سال اپنے دامن میں نہایت عمدہ موسیقی لئے فلم من کی جیت آئی۔رتن میں شاعری کی جو کمی رہ گئی تھی، من کی جیت میں وہ اتنی ہی آن بان سے نمودار ہوئی کیونکہ اُس کے ایک نغمہ نگار جوش ملیح آبادی تھے۔فلم کے پروڈیوسر ڈبلیو زیڈ احمد تھے جو اپنی فلموں میں نئے نئے گلوکار شریک کرنے کے قائل تھے چنانچہ ستارا کانپور والی کی آواز میں انہوں نے شاہکار گانے ریکارڈ کرائے:

۱۔ پردیسی کیوں یاد آتا ہے
۲۔ اے چاند نہ اِترانا
۳۔ نگری مری کب تک یوں ہی برباد رہے گی

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
آکاش پہ نکھرا ہوا ہے چاند سا مکھڑا
بستی میں غریبوں کی اندھیرے کا ہے دکھڑا
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
کب ہوگا سویرا کوئی اے کاش بتادے
کس وقت تک اے گھومتے آکاش بتادے
انسان پر انسان کی بیداد رہے گی
نگری مری کب تک یوں ہی برباد رہے گی
چہکار سے چڑیوں کی چمن گونج رہا ہے
جھرنوں کے مدھر راگ سے بن گونج رہا ہے
پر میرا تو فریاد سے من گونج رہا ہے
کب تک مرے ہونٹوں پہ یہ فریاد رہے گی

نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی

جوش لکھے جا رہے تھے، لفظ کے بعد لفظ قطار باندھے چلے آ رہے تھے، شعر نغمے میں ڈھل رہا تھا اور غریبوں کی بستی میں اندھیرے کا دکھڑا مسلسل بیان ہوئے جا رہا تھا:

اے چاند امیدوں کو میری شمع دکھا دے
ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے سورج کا پتہ دے
روتے ہوئے جگ بیت گیا اب تو ہنسا دے
اے میرے ہمالہ مجھے یہ بات بتا دے
ہوگی میری بستی بھی کبھی خیر سے آباد
نگری میری برباد ہے برباد ہے برباد
جو آنکھ کا آنسو ہے جو آہوں کا دھواں ہے
واری میرا دل اُس پہ نچھاور مری جاں ہے
مجرم ہوں گنہ گار ہوں اُس کو یہ گماں ہے
آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے
مجھ بے کس و مجبور پہ یہ ظلم یہ بیداد
نگری میری برباد ہے برباد
نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی

من کی جیت کا وہ شوخ گانا بھی جوش صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا جسے کہتے ہیں کہ شمشاد بیگم نے گانے سے انکار کر دیا تھا البتہ زہرہ بائی جھٹ تیار ہو گئیں کیونکہ فلم میں آنے سے پہلے بھی ان کے پرائیویٹ گانوں میں جوبن کا ذکر بار بار آتا تھا۔ اس گانے کے بول یوں تھے:

میرے جوبنا کا دیکھو ابھار، پاپی جوبنا کا دیکھو ابھار

اس کے بعد جوش صاحب نے جوبن کی تشبیہیں باندھی ہیں مثال کے طور پر:

جیسے بھنوروں کی گونج جیسے ساون کی دھوم جیسے گاتی پھوہار

جیسے ساگر پہ بھور جیسے اڑتے چکور جیسے کوئل پکار

یہ محض چند اور منتخب تشبیہیں ہیں۔ باقی میں نے حذف کر دیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنہ ۷۰ء کے قریب جوش صاحب اپنی یادداشتیں لکھ رہے تھے۔ میں کراچی کے ایک روزنامے کا نیوز ایڈیٹر تھا جس میں یہ یادوں کی برات قسط وار چھپ رہی تھی۔ جب جوش صاحب کا قلم آزادانہ روی کی طرف مائل ہونے لگا تو اخبار نے وہ پیراگراف حذف کر دیئے۔ جوش صاحب برہم ہو گئے اور اخبار کے لئے مزید لکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اخبار کے قارئین کے نام ایک خط لکھا جو اخبار نے دیانت داری سے شائع کر دیا۔ خط اِن الفاظ سے شروع ہوتا تھا۔

"اے میری شرمیلی قوم"

آج اُن کے نغمے کے بول حذف کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ جنّت الفردوس کو ایک خط لکھوں کہ اے شاعر انقلاب، اِس شرمیلے مصنّف کی معذرت قبول کیجئے۔

آج کے نغمہ نگار جاوید اختر خفا نہ ہوں مگر من کی جیت کا یہ نغمہ سن کر ذرا دیر کے لئے دھیان ان کے لکھے ہوئے گانے کی طرف جاتا ہے: "اک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لکھا" (۱۹۴۲ء اے لَو اسٹوری) نہایت شائستہ شاعری ہے۔

اُسی سال موسیقار حسن لال بھگت رام کی پہلی فلم چاند جاری ہوئی جس میں نوعمر گلوکار منجو کا گانا بہت مقبول ہوا: "دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی، آشاؤں کی کلیوں کو کھلنے ہی نہیں دیتی" یہ نغمہ قمر جلال آبادی نے لکھا تھا جن کا ان دونوں میوزک ڈائریکٹر بھائیوں سے بہت عرصے ساتھ رہے گا۔

زہرہ بائی نے بہت سے مہذب گانے گائے۔ فلم کاروان میں منشی عزیز کی غزل "آنکھوں میں انتظار کی دنیا لئے ہوئے" پسند کی گئی۔ فلم بھرتھری میں امیر بائی نے مقبول گانا گایا۔ "چندا دیس پیا کے جا، ساجن ہمرے بھولے ہم کو، انہیں منا کے لا۔"

شمس لکھنوی کے نغمے موسیقار سجاد حسین کی کلاسیکی طرزیں لے کر نور جہاں کی فلم دوست نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس کے فلم ساز سیّد شوکت حسین رضوی تھے اور اُس

وقت نور جہاں ان کی دلہن بن چکی تھیں۔ دوست میں ان کا نغمہ کچھ ایسا بے جانہ تھا: "بدنام محبت کون کرے اور عشق کو رسوا کون کرے۔ جب دے دیا دل ہی ہاتھوں سے پھر آپ سے شکوہ کون کرے۔"

سجاد حسین نہایت ذہین میوزک ڈائریکٹر تھے۔ ذرا مشکل مگر دل نواز طرزیں بناتے تھے اور گلوکاروں سے بہت مشق اور مشقت کراتے تھے۔ ساتھ ہی کہتے جاتے تھے کہ محنت کرو محنت، یہ نوشاد میاں کی طرزیں نہیں ہیں۔ نور جہاں آخر عمر تک ان کی بڑی مدّاح رہیں۔ ایک بار کسی نے اُن سے کہا کہ سنا ہے سجاد حسین بہت بد دماغ تھے۔ بولیں کہ وہ بہت عظیم فنکار تھا۔ بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے دوست کا یہ گانا بہت جی لگا کر گایا: "کوئی پریم کا دے کے سندیسہ ہائے لوٹ گیا، تھا جو نازک میرے دل کا شیشہ، ہائے ٹوٹ گیا۔"

مگر اس فلم کا جو گانا صرف نور جہاں گا سکتی تھیں وہ یادگار رہے گا۔ میرا وہ لڑکپن تھا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے نہایت پسندیدہ دس گانوں کی فہرست بنائی تھی۔ باقی نو تو اب یاد نہیں لیکن یہ نغمہ ہمیشہ یاد رہے گا:

الم پہ الم، ستم پر ستم ہم اٹھائے ہوئے ہیں

میرے دوست فردوس علی بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے وقت کی بڑی گلوکارہ راج کماری سے کہا کہ یہ گانا لتا منگیشکر نہیں گا سکتیں۔ راجکماری بولیں کہ لتا تو لتا، یہ گانا میں بھی نہیں گا سکتی۔

عجیب گانا ہے سائے کی طرح ساتھ لگ جاتا ہے۔

شمس لکھنوی نے اُس برس مشہور مسلم سوشل فلم عصمت کے نغمے بھی لکھے۔

دو جہاں کے علیم رب کریم — جو مرض لا دوا ہے اس کے حکیم
کس کو در سے ترے دوا نہ ملی — مجھ ہی کم بخت کو شفا نہ ملی
تو نے اوروں کو پھول و پھل بانٹے — میری جھولی میں بھر دیئے کانٹے

کچھ اس طرح کے بول تھے جو میں نے اپنی یادداشت سے لکھ دیئے ہیں۔

سنہ ۴۴ء کا پہلا تاریخی واقعہ فلم کی دنیا میں دلیپ کمار کا قدم رکھنا ہے۔ اُس سال ان کی پہلی فلم جوار بھاٹا دکھائی گئی اور اس کے بعد تو فلم اور فلمسازی کا مزاج ہی بدل گیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ جوار بھاٹا کا سب سے مقبول نغمہ ارون کمار نے گایا تھا: سانجھ کی بیلا پنچھی اکیلا۔ اس کے علاوہ پارول گھوش اور چتلکر کا دوگانا: "بھول جانا چاہتی ہوں، بھول پاتی ہی نہیں۔" بڑا اسریلا نغمہ تھا۔ طرز پارول کے بھائی انل بسواس نے بنائی تھی۔

سنہ ۴۴ء کا دوسرا بڑا واقعہ فلم کی دنیا میں محمد رفیع کا قدم رکھنا تھا۔ لاہور میں کچھ تربیت پا کر اور پنجابی فلموں میں دوایک گانے گا کر اپنے شہر کے بہت سے دوسرے فنکاروں کی طرح وہ بھی بمبئی پہنچ گئے جہاں نہیں معلوم کیسے مقبول شاعر تنویر نقوی ان کی خوبیوں کو بھانپ گئے اور چند بڑے فلم سازوں مثلاً اے آر کاردار، محبوب خاں اور نذیر سے ملوایا۔

نوشاد صاحب رفیع سے اپنی پہلی ملاقات بہت دلچسپ پیرائے میں سناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک روز ان کے ایک واقف کار (ظاہر ہے تنویر نقوی) رفیع صاحب کو لے کر ان کے پاس آئے۔ رفیع اپنے ساتھ لکھنؤ سے نوشاد کے والد صاحب کی ایک چٹھی بھی لائے جس میں لکھا تھا یہ نوجوان گانے کا بہت شوقین ہے۔ ممکن ہو تو اپنی کسی فلم میں اسے بھی چانس دے دو (فلمی دنیا میں لفظ چانس کا کوئی اردو ترجمہ نہیں ہے۔) نوشاد صاحب نے کہا کہ وہ اپنی فلم پہلے آپ میں فوجی انداز کا ایک گانا بنا رہے ہیں، آپ چاہیں تو اُس میں شریک ہو جائیں۔ رفیع صاحب جھٹ مان گئے۔ اس دوران پاکستان کے مشہور کریکٹر ایکٹر علاء الدین بھی بمبئی میں چانس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ نوشاد صاحب نے اس فوجی گانے میں انہیں بھی شامل کر لیا۔ گانے میں تیسری آواز شیام کمار کی تھی جو کہتے ہیں کہ فلم اسٹوڈیو کے معمولی ملازم تھے اور چھوٹے موٹے کام کرتے اور بلند آواز میں گاتے پھرتے تھے۔ وہ بھی پریڈ میں شریک کر لئے گئے۔ اب پرانے فوجی سامان کی دکان سے تینوں کے لئے فوجی بوٹ منگائے گئے جنہیں پہن کر یہ تینوں حضرات لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتے تھے اور گاتے تھے۔ تین روز تک مشق کی گئی۔ چوتھے روز گانا ریکارڈ ہوا اور نوشاد صاحب کے بقول تینوں کو دس دس روپے ملے۔ وہ گانا آج بھی آل انڈیا

ریڈیو سے ہر سال پندرہ اگست کو ضرور نشر ہوتا ہے۔ گانا مدھوک صاحب نے لکھا تھا اور اس کے بول تھے: "ہندوستان کے ہم ہیں، ہندوستان ہے ہمارا، ہندو مسلم دونوں کی آنکھوں کا تارا۔"

کلکتے میں ابھی دم خم تھا۔ وہاں فلم میری بہن تیار ہوئی۔ اُس زمانے میں بعض فلموں کا ایک انگریزی نام بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مائی سسٹر کے نام سے شہرت پانے والی اس فلم کے نغمے پنڈت بھوشن نے بڑی خوبی سے لکھے۔ پنکج ملک نے اتنی ہی چابک دستی سے طرزیں بنائیں اور بمبئی سے لوٹ آنے والے کے ایل سہگل نے ان گانوں کو لازوال بنا دیا:

۱۔ دو نیناں متوارے تہارے ہم پر ظلم کریں

۲۔ چھپونا چھپونا او پیاری سجنیا ہم سے چھپونا چھپونا

۳۔ ہائے کس بُت کی محبت میں گرفتار ہوئے
زندگی تلخ ہوئی جینے سے بیزار ہوئے
ہم نے پایا تو یہ پایا ہے وفاؤں کا صلہ
مفت بدنام ہوئے بے بس ولاچار ہوئے
گھٹ کے مرجائیں یہی دل میں حسرت باقی
مدتیں گزری ہیں بے یارو مددگار ہوئے

۴۔ اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتادے — کیوں مجھ سے خفا ہے تو کیا میں نے کیا ہے
اوروں کو خوشی مجھ کو فقط درد و رنج و غم — دنیا کو ہنسی اور مجھے رونے دیا ہے
حصے میں سب کے آئی ہیں رنگین بہاریں — بدبختیاں لیکن مجھے شیشے میں اتاریں
پیتے ہیں، لوگ روز و شب مسرتوں کی مے — میں ہوں کہ سدا خونِ جگر میں نے پیا ہے
تھا جن کے دم قدم سے یہ آباد آشیاں — وہ چہچہاتی بلبلیں جانے گئیں کہاں
جگنو کی چمک ہے نہ ستاروں کی روشنی — اس گھپ اندھیرے میں ہے میری جان پر بنی
کیا تھی خطا کہ جس کی سزا تو نے مجھ کو دی — کیا تھا گناہ کہ جس کا بدلہ مجھ سے لیا ہے

فلم میں یہ نغمہ مشاعرے کے ماحول میں گایا گیا جس میں خوش لباس حاضرین کا بڑا مجمع ہے جس کی داد بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سہگل صاحب نے نغمہ پہلے سے ریکارڈ نہیں کرایا بلکہ وہیں اسٹوڈیو میں سازوں کے ساتھ ریکارڈ کرایا۔

ایسا کارنامہ کندن لال سہگل ہی انجام دے سکتے تھے۔

خورشید اب اپنے عروج پر تھیں۔ ان کی فلم ممتاز محل کے لئے ولی صاحب نے ایسے ایسے نغمے لکھے: جلا پتنگ تو اس میں قصور کس کا ہے، اداس شام کی آہیں سلام کہتی ہیں، اور جو ہم پہ گزرتی ہے ستاروں سے پوچھئے۔ اسی طرح وجاہت مرزا چنگیزی کی فلم شہنشاہ بابر میں خورشید نے پھر رنگ جمایا: بلبل آ تو بھی گا پیار کے گانے میں بھی گاؤں تو بھی گا۔ محبت میں سارا جہاں جل رہا ہے، زمیں تو زمیں آسماں جل رہا ہے۔ دل لگانے میں کچھ مزا ہی نہیں۔ اور نہ بھولیں گے تجھ کو بھلا دینے والے، میری حسرتوں کو مٹا دینے والے۔

فلمی نغموں میں غزل کی نفاستیں بے تکان جگہ پانے لگیں۔

اس ساری عمدہ شاعری کو موسیقی میں ڈھالنے والے کھیم چند پرکاش تھے۔ ان کی ایک اور فلم بھنورا میں سہگل نے بعض کمال کے گانے گائے:

۱۔ کیا ہم نے بگاڑا ہے کیوں ہم کو ستاتے ہو
۲۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں گھر لٹائے جاتے ہیں
۳۔ دیا جس نے دل لٹ گیا وہ بچارا
۴۔ مسکراتے ہوئے یوں آنکھ چرایا نہ کرو
۵۔ ہم اپنا انہیں بنا نہ سکے
۶۔ ٹھکرا رہی ہے دنیا ہم ہیں کہ سو رہے ہیں

ہماری فلم کی موسیقی میں ماں کا موضوع ہمیشہ بہت جذباتی رہا ہے۔ ہمارے معاشرے کی طرح ہماری شاعری میں بھی ماں کی باتوں نے ہمیشہ دلوں کو چھوا ہے۔ ابھی ۲۰۰۸ء میں عامر خان کی فلم 'تارے زمیں پر' میں ماں کے موضوع پر گانا ہے جس کے دوران سینما ہال میں لوگوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں ایسا ہی ایک نغمہ ملتا ہے جو

پنڈت فانی نے لکھا تھا اور جس کی طرز فتح علی خاں نے بنائی تھی۔ فتح علی خاں نے چند فلموں میں میوزک ڈائریکٹر کا فرض انجام دیا تھا۔ اِس وقت جس گانے کا ذکر ہے یہ بھی دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اسے اداکارہ گلوکارہ کوشلیا نے گایا تھا۔ بول یوں ہیں:

ماں پیاری ماں، گود میں تیری کھیلا بچپن میرا آج دُکھی ہے یاد میں تیری پھول سا جیون میرا
تھپک تھپک کر لوریاں گا کر تو نے مجھے سلایا آنکھ میں کاٹیں تو نے راتیں جھولا میرا جھلایا
ماں پیاری ماں، گود میں تیری کھیلا بچپن میرا
من میں میرے یاد ہے تیری تو نے مجھے بھلایا ممتا نے تیری ماتا پیاری آج مجھے رلایا
ماں پیاری ماں، گود میں تیری کھیلا بچپن میرا

ان نغموں میں، چاہے ان کا انداز غزل کا ہو یا نہ ہو، ردیف اور خصوصاً قافیے کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گانے کا معیار چاہے جیسا ہو، قافئے کا اہتمام آج بھی خوب ہوتا ہے مثلاً ایک جدید فلم میں جاں نثار اختر کے صاحبزادے لکھتے ہیں:

دل میں میرے ہے دردِ ڈسکو

اور اگلے مصرعوں میں ڈسکو کا قافیہ تنگ نہیں ہے۔ اس کے وزن پر لکھتے ہیں:

سان فرانسسکو یا پچھلے مہینے کی چھبیس کو۔

آخر میں ہر برس کی طرح سنہ ۴۴ء کا ایک عامیانہ گانا جو لاہور کی فلم شکریہ میں اور پھر گلی کوچوں میں گایا گیا: نینوں کے تیر چلا گئی ایک شہر کی لونڈیا۔ یہ اُن تین چار گانوں میں ایک ہے جسے اُس وقت کی حکومت نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔

دل جلتا ہے تو جلنے دے

۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی البتہ دنیا کی فضا میں بارود کی بو بھری ہوئی تھی۔ فلم سازی کو اس سے متاثر ہونا ہی تھا اس لئے اس سال کوئی بڑی فلم نہیں بنی البتہ بڑے واقعات کئی ہوئے جن میں ایک لتا منگیشکر نامی ایک لڑکی کی دریافت تھی۔

فلم ساز ونایک سے حکومت نے کہا کہ جنگ کے موضوع پر کوئی فلم بنائیں چنانچہ انہوں نے نور جہاں اور شاعر اور مصنف ضیا سرحدی کو ساتھ لیا۔ موسیقی کی ذمّے داری ایک نئے میوزک ڈائریکٹر دتّہ کورگاؤں کر کو سونپی گئی اور بمبئی سے کچھ دور کولہاپور کے ایک اسٹوڈیو میں فلم بندی شروع ہوئی۔

باقی کہانی کے راوی ضیا سرحدی ہیں جنہوں نے میرے ساتھی عارف وقار کو اپنے ایک طویل انٹرویو میں بتایا کہ وہ خود اور نور جہاں شوٹنگ کے لئے کولہاپور جایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ اسٹوڈیو میں بیٹھے تھے کہ ایک قریب کے کمرے سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آئی جو اتنی سریلی تھی کہ دونوں چونکے اور ونایک سے کہا کہ یہ کون گا رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مرہٹی فلموں کے ایک اداکار اور گلوکار مسٹر منگیشکر ہوا کرتے تھے، وہ مر گئے تو گھر میں حالات دشوار ہو گئے۔ اب ان کی بیٹی لتا نے یہاں ملازمت کر لی ہے۔ وہ کورس میں گاتی ہے اور تیس روپے ماہانہ تنخواہ لیتی ہے۔ نور جہاں نے لتا کو بلوا کر اپنے پاس بٹھایا اور فرمائش کر کے اس کا گانا سنا اور کہا کہ یہ لڑکی آگے چل کر بہت بڑی گلوکارہ بنے گی۔ بہتر ہے اسے

بمبئی بھیجا جائے۔ لتا منگیشکر نور جہاں سے اپنی اس ملاقات کو کبھی نہیں بھلا پائیں۔ انہوں نے نور جہاں کو استاد کا درجہ دیا اور بعض اوقات گانے میں ٹیلیفون کر کے ان سے مشورہ بھی لیا۔

پھر جب نور جہاں پاکستان چلی گئیں تو ایک مرتبہ لتا نے واہگہ کی سرحد پر ان سے ملاقات کا انتظام کیا۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں لاہور سے سرحد پر گئیں۔ دوسری طرف سے لتا منگیشکر کھانے پینے کا سامان لے کر آئیں۔ دونوں نے سرحد پر بیٹھ کر کھانا کھایا جس کے بعد لتا نے نور جہاں کے ہاتھ دھلوائے۔ اسی دوران نور جہاں نے اپنے منہ میں پانی بھر کر کچی زمین پر کلّی کی، لتا نے اُس جگہ پر اشارہ کر کے کہا کہ اب یہاں سے سُر اُگیں گے۔

بہر حال ۴۵ء میں فلم بڑی ماں جاری ہوئی جس کے دو گانوں میں لتا کی ذرا ذرا سی آواز سننے کو آتی ہے۔ سنا ہے لتا نے چھوٹا سا پارٹ بھی ادا کیا۔

اور جو کچھ ہوا سو ہوا، فلم بڑی ماں میں موسیقار دتّہ کورگاؤں کر نے نور جہاں کے لئے کچھ ایسی طرزیں بنائیں جنہیں دنیا نے آج تک یاد رکھا ہے۔ یہ گانے ضیا سرحدی اور انجم پیلی بھیتی نے لکھے تھے:

۱۔ آ انتظار ہے تیرا، دل بے قرار ہے میرا

۲۔ دیا جلا کر آپ بجھایا، تیرے کام نرالے، او چھوڑ کے جانے والے

۳۔ تم ہم کو بھلا بیٹھے ہو، ہم تم کو بھلائیں کیسے

۴۔ کسی طرح سے محبت میں چین پا نہ سکے، لگی جو آگ ہے سینے میں وہ بجھا نہ سکے

اسی طرح سنہ ۴۵ء میں نور جہاں کی ایک اور مقبول فلم گاؤں کی گوری تیار ہوئی۔ جس کے نغمے ولی صاحب نے لکھے اور خالص یوپی کے محاورے میں لکھا: "بیٹھی ہوں تیری یاد کا لے کر کے سہارا۔" شیام سندر نے ویسی ہی سندر طرزیں بنائیں

۱۔ یہ کون ہنسا کس نے ستاروں کو ہنسایا

۲۔ سجن پردیسی، بلم پردیسی، من کو ستائے

۳۔ کس طرح بھولے گا دل ان کا خیال آیا ہوا

دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم گاؤں کی گوری کے ایک گانے میں محمد رفیع کی آواز بھی شامل ہے۔ گانے کے بول یوں تھے: دل ہو قابو میں تو دلدار کی ایسی تیسی۔ معلوم نہیں کہ اسٹوڈیو کی راہ داری میں رفیع اور نور جہاں کی کبھی مڈ بھیڑ ہوئی یا نہیں۔ اس وقت یہ بات دونوں کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگی کہ دو برس بعد وہ فلم جگنو کے لئے یادگار گانا گا رہے ہوں گے: یہاں بدلا وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے۔

ان ہی دنوں محبوب اپنی بڑی فلم ہمایوں بنا رہے تھے۔ موسیقی غلام حیدر ترتیب دے رہے تھے۔ ان ہی کی طرح لاہور سے آئے ہوئے غزل کے شاعر وقار انبالوی محبوب صاحب سے ملنے گئے۔ محبوب نے ان سے کہا کہ میری فلم کے لئے کوئی گانا لکھ دیجئے۔ وقار انبالوی کے بیٹے عارف وقار بتاتے ہیں کہ والد صاحب نے وہیں کاغذ لے کر گانا لکھ دیا جو فلم ہمایوں کا نہایت کامیاب اور مقبول نغمہ ثابت ہوا:

حسن کہتا جا رہا ہے بادشاہی کچھ نہیں ۔۔۔ عشق یوں خاموش ہے جیسے سُنا ہی کچھ نہیں
اے محبت کی نظر تیری عطاؤں کے نثار ۔۔۔ درد وہ بخشا گیا جس کی دوا ہی کچھ نہیں
لو خدا حافظ سدھارو یاد کر لینا کبھی ۔۔۔ ہے یہ قسمت کی خطا مجھ کو گلہ ہی کچھ نہیں

اُن ہی دنوں کلکتے میں فلم کروکشیتر بن رہی تھی اور اردو کے نامور شاعر جمیل مظہری اس کے گانے لکھ رہے تھے۔ اس فلم میں سہگل نے ان کی ایک غزل گائی:

کدھر ہے تو اے مری تمنا ۔۔۔ چراغ دل کا میرے جلا جا
مرے اندھیرے کی روشنی بن ۔۔۔ اس اجڑی منزل میں میری آجا
مرے گلستاں کے لالہ و گل ۔۔۔ گئے ہیں مدت سے بھول ہنسنا
تو میرے گلشن میں میری دیوی ۔۔۔ پھر آ کے اک بار مسکرا جا
ہوا رکی ہے اسے کھنک دے ۔۔۔ بجھے ہیں شعلے انہیں لپک دے
فضا پہ بے چینیاں چھڑک دے ۔۔۔ اک آگ سی ہر طرف لگا جا

جمیل مظہری کلکتے ہی میں رہتے تھے اور صحافی تھے۔ وحشت کلکتوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۸۰ء میں بہار میں انتقال کیا مگر اُن کا یہ شعر آج بھی زندہ ہے:

بہ قدر پیمانۂ تخیّل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

۴۵ء میں دو یادگار گانے وجود میں آئے۔ پہلا نغمہ فلم مورتی میں تھا جس میں آوازیں خورشید اور حمیدہ کے علاوہ جواں سال مکیش کی بھی تھیں۔ بول پنڈت اندر نے لکھے تھے:

بدریا برس گئی اُس پار   لئے کھڑی ہے پریت گگریا   جو گنیا اِس پار

دوسرا یادگار نغمہ مظہر خاں کی فلم پہلی نظر میں مکیش نے گایا تھا جسے دنیا سہگل کی آواز سمجھی تھی۔ یہ ڈاکٹر صفدر آہ کی لکھی ہوئی غزل تھی۔

دل جلتا ہے تو جلنے دے آنسو نہ بہا فریاد نہ کر   تو پردہ نشیں کا عاشق ہے یوں نام وفا برباد نہ کر

مجھے یاد ہے جب پہلی بار اس گانے کا ریکارڈ آیا تو اس پر گانے والے کا نام درج نہیں تھا اور گاہک سہگل صاحب کا ریکارڈ مانگتے تھے۔ اسی فلم کی ایک اور غزل وقت کے دھندلکے میں گم ہوگئی ورنہ وہ بھی شاہکار تھی۔ آواز نسیم اختر کی تھی اور موسیقی اپنے وقت کے عظیم موسیقار انل بسواس نے ترتیب دی تھی:

اُن کا اشارہ جان سے پیارا   دے گیا دل کو میرے سہارا

بعد میں یہ گانا نیّرہ نور نے گا کر اسے نئی زندگی دی۔

اس سال کی آخری قابل ذکر فلم زینت ہے جس میں نخشب جارچوی کی لکھی ہوئی خواتین کی قوّالی کا ریکارڈ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوا تھا۔ اس میں آوازیں کلیانی، زہرہ بائی اور نور جہاں کی تھیں جو خود پردے پر نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے موسیقار استاد حفیظ خاں تھے۔ بول سب ہی کو یاد ہوں گے:

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے   کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

زینت کے کچھ اور قابل ذکر گانے یوں ہیں:

۱۔ ناچو ستارو ناچو اب چاند نکلنے والا ہے (نور جہاں)

۲۔ بلبلو مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع (نور جہاں)

۳۔ آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا (نور جہاں)

۴۔ آجاری نندیا تو آ کیوں نہ جا (نور جہاں)

۵۔ ہائے رے دنیا جھوٹوں کا دربار (محمد رفیع)

ابھی دنیا پر محمد رفیع کے بھید نہیں کھلے تھے۔ صرف ایک فیروز نظامی تھے جنہوں نے اپنی فلم شربتی آنکھیں میں تین گانے رفیع کی آواز میں ریکارڈ کئے مگر رفیع کی شہرت کو ابھی دو سال اور انتظار کرنا تھا۔ پھر یہی نور جہاں ہوں گی، یہی فیروز نظامی ہوں گے اور یہی محمد رفیع دلیپ کمار کے لئے گا رہے ہوں گے: یہاں بدلا وفا کا بیوفائی کے سوا کیا ہے۔

افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا

۱۹۴۶ء ایک نوید لے کر آ پہنچا۔ دو سال پہلے فلم رتن کے اجرا کے ساتھ جس ڈنکے پر پہلی چوٹ پڑی تھی اب موسیقی کی دنیا میں اس کی دھوم مچ گئی اور ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہاں سے نوشاد علی کا عہد شروع ہوا۔ برصغیر کے ایک کنارے سے دوسرے سرے تک محبوب کی فلم انمول گھڑی اور اے آر کاردار کے شاہکار شاہ جہاں نے موسیقی کو وہ روپ اور وہ نکھار عطا کیا کہ راگ اور سُر اور تھاپ کے عالم پر بہار چھا گئی۔

اس انقلاب کے اندر چھپا ہوا ایک اور انقلاب آیا۔ نغمہ نگاروں کو تلاش کرنے والے بمبئی کے کسی مشاعرے سے ایک نوجوان شاعر مجروح سلطان پوری کو ڈھونڈ لائے۔ اس کے بعد برصغیر کی فلم گائیکی نے جو اڑان بھری تو آسمان کی خبر لائی — نغموں کو پنکھ لگے اور ان کی پرواز نے موسیقی کی فضاؤں میں ایسے ایسے رنگ بکھیرے کہ ایک بار تو دھنک بھی ماند پڑ گئی ہو گی۔

نوشاد کی تخلیق کا عمل کچھ یوں بیدار ہوا کہ ملک کے گلی کوچے تک اس کے ساتھ سر ملا کر گنگنانے لگے۔ دنیا نے ان کا موسیقار اعظم ہونا تسلیم کر لیا۔

فلم انمول گھڑی کے زیادہ تر گانے تنویر نقوی نے لکھے جو سننے والوں پر اثر کر گئے۔ ایک گانا انجم پیلی بھیتی نے لکھا اور ایک گانا نئے گلوکار محمد رفیع نے گایا۔ باقی تمام گانوں میں نور جہاں اور ثریا کی موجودگی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن نوشاد علی نے بوڑھے ہوتے ہوئے

سریندر کی آواز میں بھی یادگار گانے ریکارڈ کر لئے۔ گانوں کی فہرست یوں ہے:

۱۔ اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں تیرے ہاتھ نہ آؤں (زہرہ بائی اور شمشاد بیگم)
۲۔ تیرا کھلونا ٹوٹا بالک تیرا کھلونا ٹوٹا (محمد رفیع)
۳۔ کیوں یاد آ رہے ہیں گزرے ہوئے زمانے (سریندر)
۴۔ آ جا میری برباد محبت کے سہارے (نور جہاں)
۵۔ آواز دے کہاں ہے، دنیا میری جواں ہے (نور جہاں اور سریندر)
۶۔ میں دل میں درد بسا لائی (ثریا)
۷۔ میرے بچپن کے ساتھی مجھے بھول نہ جانا (نور جہاں)
۸۔ من لیتا ہے انگڑائی جیون پہ جوانی چھائی (نور جہاں)
۹۔ جواں ہے محبت، حسین ہے زمانہ (نور جہاں)
۱۰۔ سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا (ثریا)
۱۱۔ کیا مل گیا بھگوان تمہیں دل کو دکھا کے (نور جہاں، تحریر: انجم)
۱۲۔ اب کون ہے میرا کہو اب کون ہے میرا (سریندر)

کئی سال بعد نور جہاں بمبئی گئیں۔ ایک یادگار محفل ہوئی۔ سریندر زندہ تھے اور زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ سنا ہے نور جہاں اور سریندر نے مل کر "آواز دے کہاں ہے" گایا اور سماں باندھ دیا۔

اُس برس نوشاد کا دوسرا شاہکار فلم شاہ جہاں تھی جس کی سب سے بڑی خوبی سہگل کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔ یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے اور انجکشن لگا لگا کر انہیں توانا رکھا جا رہا تھا۔ فلم کے پروڈیوسر اے آر کاردار کو ایک اچھے نغمہ نگار کی تلاش تھی۔ ان ہی دنوں انہوں نے بمبئی کے ایک مشاعرے میں مجروح سلطان پوری کو اپنا کلام پڑھتے سنا۔ مجروح صاحب اُس وقت کوئی چھبیس برس کے تھے۔ انہیں نوشاد علی سے ملوایا گیا اور طے پایا کہ اُنہیں آزمایا جائے۔ مجروح نے وہیں بیٹھ کر ایک چلتا ہوا نغمہ لکھا: جب اُس نے گیسو بکھرائے بادل آیا جھوم کے۔" بس پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور فلم کے دس میں سے سات گانے

مجروح صاحب نے لکھے۔

مجروح سلطان پوری کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ مقبول گیتوں میں اعلیٰ شاعری کی جیسی آمیزش انہوں نے کی، کسی اور نے نہیں کی۔ اس کتاب میں جہاں نغمہ نگاروں پر تفصیل سے بات ہوگی، میں اپنی رائے کے حق میں شہادتیں دوں گا۔ شاہ جہاں کے نغموں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالئے:

۱۔ روحی روحی میرے سپنوں کی رانی (سہگل، رفیع اور کورس)
۲۔ جب اس نے گیسو بکھرائے بادل آیا جھوم کے (شمشاد)
۳۔ غم دیئے مستقل، کتنا نازک ہے دل، یہ نا جانا (سہگل)
۴۔ آگ لگی دل میں وہ پیاری، گانے لگیں امنگیں ساری (نسیم اختر)
۵۔ کر لیجئے چل کر میری جنت کے نظارے (سہگل)
۶۔ جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے (سہگل)
۷۔ اے دلِ بے قرار جھوم (سہگل، تحریر: خمار)
۸۔ چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا (سہگل، تحریر: خمار)

شاہ جہاں کا مشہور گانا "جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے" آنجہانی سہگل کی وصیت کے مطابق ان کے جنازے پر بجایا گیا تھا۔ اس کی تفصیل آگے کہیں آئے گی۔

یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اُسی سال نذیر اجمیری نے فلم قیمت بنائی جس کی موسیقی نوشاد نے ترتیب دی اور تقریباً سارے گانے مجروح نے لکھے۔ گانے اچھے تھے مگر ایسے نہ تھے کہ یہاں ان کی تفصیل بیان کی جائے۔ مطلب یہ کہ کامیابی کا کوئی کلیہ نہیں۔

۱۹۴۶ء میں نور جہاں کی فلم دل دیکھنے میں آئی۔ ہماری ہالیووڈ جیسی حسینہ پیشنس کوپر Patience کی آخری فلم خاں صاحب پیش کی گئی۔ بعد میں وہ اُس وقت کے مشرقی پاکستان چلی گئیں اور باقی عمر اصفہانی گھرانے میں گزاری۔ وہ خاموش فلموں کے وقت سے

اداکاری کررہی تھیں مگراب فلموں کی تاریخ ان کے بارے میں خاموش ہے۔

پھر دلیپ کمار کی فلم ملن آئی اور مشہور مسلم سوشل فلم نیک پروین چلی جس میں حمیدہ بانو نے وہ مشہور حمد گائی: تیری ذات پاک ہے اے خدا، تیری شان جل جلالہٗ۔ان ہی دنوں کلکتے کی فلم پہچان میں فیاض ہاشمی نے نغمے لکھے اور فلم پجاری میں نوعمر لڑکی بے بی ممتاز نے گانا گایا۔ یہی ممتاز آگے چل کر حسین اداکارہ مدھوبالا بننے والی تھی۔ فلم راجپوتانی میں حمیدہ بانو اور مکیش نے ایک دلکش گانا گایا: جا پروانے جا، کہیں شمع جل رہی ہے۔

رفیع نے پہلی کامیاب غزل فلم سفر میں گائی۔" کہہ کے بھی نہ آئے تم،اب چھپنے لگے تارے، دل لے کے تمہیں جیتے، دل دے کے ہمیں ہارے۔"اور اسی فلم میں میوزک ڈائریکٹر سی رامچندر نے مشہور گانا گایا:" کبھی یاد کر کے گلی پار کر کے چلی آنا ہمارے انگنا۔" اس میں نسوانی آواز بینا پانی مکھر جی کی تھی جو پھر گمنام ہو گئیں۔

۱۹۴۷ء برصغیر کی تاریخ میں عجیب دھج سے آیا۔ ملک کو آزادی ملی جس کے آنچل تلے بربادی کا چراغ جل رہا تھا۔آبادی اِدھر سے اُدھر منتقل ہوئی اور اس سارے عمل میں یہ آنچل تار تار ہوا۔

ادھر بمبئی میں فلم سازی کی دنیا میں ہلچل بپا تھی۔ نذیر اپنی فلم عابدہ میں علامہ اقبال کا کلام شامل کررہے تھے اور نوشاد علی اپنی فلم درد میں اعلان کررہے تھے کہ "اسلام کی کشتی کو ہم پار لگا دیں گے۔"

تاریخ پر ایسی افتاد پہلی بار نہیں پڑی۔ نذیر کو اپنی اہلیہ سورن لتا کے ہمراہ پاکستان جانا پڑا۔ نور جہاں بھی رخت سفر باندھ رہی تھیں اور اپنی فلمیں جلدی جلدی مکمل کر رہی تھیں۔ البتہ نوشاد علی آخر دم تک بمبئی کے محاذ پر ڈٹے رہے اور خود کو سنگیت سمراٹ منوا کر چھوڑا۔ مگر اس محاذ پر وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ہمراہ بڑے پختہ کار اور منجھے ہوئے نغمہ نگار شکیل بدایونی بھی تھے۔ ان کی صف میں محمد رفیع اور یوسف خان عرف دلیپ کمار بھی شریک ہو گئے اور یہ قافلہ جب تک تھکا نہیں، رکا بھی نہیں۔

مجھے وہ گانا یاد آرہا ہے: گلفام کو مل گئی سبز پری۔ ہوا یہ کہ نوشاد کو شکیل بدایونی مل

گئے۔ مجروح کے بعد فلمی صفت میں قدم رکھنے والے یہ دوسرے بڑے شاعر تھے۔ ان پر تفصیل سے گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ فلم درد میں شمشاد اور ثریا اپنی سریلی آواز سمیت موجود تھیں لیکن جس نئی آواز نے درد کو چار چاند لگائے وہ اوما دیوی تھیں۔ ان کے گانے 'افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بے قرار کا' کا ریکارڈ اپنے وقت کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ریکارڈ ٹھہرا۔

اوما دیوی اچانک کہاں سے آ گئیں اس کا قصہ ہمارے بی بی سی کے ساتھی راشد الغفور مرحوم سنایا کرتے تھے۔ ان کا تعلق دلّی کے معروف خیری گھرانے سے تھا۔ کہتے تھے کہ جو عورت ان کے گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے آیا کرتی تھی، اوما دیوی اس کی بیٹی تھی۔ ماں کے ساتھ وہ بھی آتی تھی اور ایک دیوار پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلا ہلا کر گایا کرتی تھی۔ بتاتے ہیں کہ اچھی خاصی سریلی تھی اور کہا کرتی تھی کہ میں بمبئی جا کر نوشاد صاحب کی فلموں میں گاؤں گی۔

پھر خدا جانے کب وہ بمبئی چلی گئی اور سیدھی نوشاد صاحب کے پاس جا پہنچی۔ نوشاد علی لکھنؤ کی مروّت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انہوں نے اوما دیوی کا گانا سنا ہوگا جو اُس نے (ٹانگیں ہلائے بغیر) لہک لہک کر سنا دیا ہوگا۔ پھر ریہرسلیں کرائی گئی ہوں گی، ریکارڈنگ ہوئی ہوگی۔ اداکارہ منوّر سلطانہ پر یہ گانے فلمائے گئے ہوں گے مگر اس دوران ریڈیو پر اور گراموفون ریکارڈوں کے ذریعے اوما دیوی کے نام کا ڈنکا بج چکا ہوگا۔ درد کے گانوں کے بول یوں تھے۔

۱۔ ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے (شمشاد اور ساتھی)

۲۔ آج مچی ہے دھوم، جھوم خوشی میں جھوم (اوما دیوی)

۳۔ یہ کون چلا میری آنکھوں میں سما کر (اوما دیوی)

۴۔ بیتاب ہے دل درد محبت کے اثر سے (اوما دیوی اور ثریا)

۵۔ دل دھڑکے آنکھ موری پھڑکے (ثریا)

۶۔ افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا
آنکھوں میں رنگ بھر کے تیرے انتظار کا (اوما دیوی)

۷۔ چلے دل کی دنیا جو برباد کر کے
بہت روئیں گے ہم انہیں یاد کر کے (ثریا)

۸۔ ہم تھے تمہارے، تم تھے ہمارے ہائے وہ بھی زمانہ یاد کرو (ثریا)

۹۔ یہ افسانہ نہیں ظالم میرے دل کی حقیقت ہے
تمہیں کیسے میں سمجھاؤں مجھے تم سے محبت ہے (شمشاد بیگم)

۱۰۔ بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ، شاہ مدینہ (ثریا)

اس فلم کے بعد اوما دیوی نے کئی فلموں میں گانے گائے پھر خدا جانے نوشاد صاحب کو کیا سوجھی کہ اپنی فلم بابل میں اوما دیوی کو ٹن ٹن کے نام سے مسخری اداکارہ بنا دیا اور وہ اپنے موٹاپے کا خود مذاق اڑانے لگیں۔ اس کے بعد انہوں نے گانا چھوڑ دیا اور اداکاری کرنے لگیں۔ ایک بار لندن آئیں تو میں نے انہیں انٹرویو کے لئے ریڈیو پر بلایا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ وہ اپنی گلوکاری کی بات کریں مگر وہ اپنے مزاحیہ کردار پر اڑی رہیں اور کہتی رہیں کہ دیکھئے میں چلتی ہوں تو آپ کی عمارت ہلتی ہے۔ آخر میں انہیں انٹرویو کی فیس دی گئی تو یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ نرگس نے نادار بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے لئے کوئی فنڈ قائم کیا ہے، یہ ساری رقم اُس میں بھیج دیجئے۔ باہر سے کامیڈین ہو گئی تھیں مگر اندر سے حساس فنکار تھیں۔ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہیں، نہ اوما دیوی اور نہ نرگس۔

فلمی دنیا میں شکیل بدایونی کا آنا وقت کا تنہا اعجاز نہ تھا۔ اسی برس اردو کے نامور شاعر راجا مہدی علی خاں نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور یہ قدم بہت مبارک ثابت ہوئے۔ فلمستان اسٹوڈیوز کے حصے دار ایس مکرجی نے ان سے اپنی فلم دو بھائی کے گانے لکھنے کی فرمائش کی اور اس فرمائش کی تکمیل میں راجا مہدی علی خاں نے ایسے ایسے گانے لکھے:

۱۔ میرا سندر سپنا بیت گیا   میں پریم میں سب کچھ ہار گئی

بے درد زمانہ جیت گیا میرا اسندر سپنا بیت گیا
ہر رات میری دیوالی تھی میں پیا کی ہونے والی تھی
اس جیون کو اب آگ لگے مجھے چھوڑ ئے جیون میت گیا (گیتارائے)

۲۔ ہمیں چھوڑ پیا کس دیس گئے پیا لوٹ کے آنا بھول گئے
مرجھا گئیں ہونٹوں کی کلیاں ہم ہنسنا ہنسانا بھول گئے (گیتارائے)

۳۔ یاد کروگے، یاد کروگے، اک دن ہم کو یاد کروگے (گیتارائے)

۴۔ دنیا میں میری آج اندھیرا ہی اندھیرا (محمد رفیع)

ان گانوں کی طرزیں بڑے موسیقار ایس ڈی برمن نے بنائی تھیں۔ آگے چل کر اتنے ہی عظیم موسیقار مدن موہن اور راجا مہدی علی خاں کا طویل ساتھ رہا۔ راجا مہدی علی خاں رسالے کھلونا میں بچّوں کے لئے باقاعدگی سے نظمیں لکھا کرتے تھے (بہت کم شاعر یہ زحمت اٹھاتے ہیں)۔ غالباً ۴۸ء میں لکھی ہوئی ایک نظم مجھے آج ساٹھ سال بعد بھی یاد ہے جس میں کھلونا کے مصور صدیقی نے تصویر بنائی تھی کہ کچھ بچے ندی میں کشتی کھیتے جا رہے ہیں اور گاتے جا رہے ہیں:

ہم ننھے ملاّحوں کی گاؤں نظر وہ آئے ہے
دُور دُور کشتی بڑھتی جائے ہے

اُسی برس فلم جگنو جاری ہوئی۔ اس کی موسیقی فیروز نظامی نے ترتیب دی تھی اور اس کے نغموں کو شہرت کی بلندی تک پہنچنا تھا۔ نغموں کی تحریر میں کئی شاعروں نے ہاتھ بٹایا تھا۔ کم سے کم ایک نغمہ ادیب سہارنپوری نے اور ایک غزل شعری بھوپالی نے لکھی تھی یا یوں کہئے کہ لکھی ہوئی موجود تھی اور میرٹھ کے کلن خاں قوال گا چکے تھے۔

جگنو میں کہنہ مشق نور جہاں اور نو وارد محمد رفیع نے یادگار گانا گایا:

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے
محبت کر کے بھی دیکھا، محبت میں بھی دھوکا ہے

اس فلم میں فیض احمد فیض کی ایک نظم بھی شامل ہوئی تھی۔ نور جہاں بتاتی ہیں کہ

فیض صاحب کی نظم ریکارڈ کرتے ہوئے یہ الجھن پیدا ہوئی کہ اس میں کاپی رائٹ اور رائلٹی کا مسئلہ ہے اور اگر فیض صاحب نے دعویٰ دائر کر دیا تو کیا ہوگا لہٰذا نظم کے بول ذرا سے بدلے گئے۔

فیض صاحب کی نظم کا پہلا مصرعہ تھا: آج کی رات ساز دردنہ چھیڑ۔ اسے تبدیل کر کے کچھ ایسی شکل دی گئی: آج کی رات سازِ دلِ پُر درد نہ چھیڑ۔ بعد میں نور جہاں نے فیض صاحب کو جانا تو بولیں کہ وہ تو اتنے شریف اور نفیس انسان تھے کہ ذرا بھی بُرا نہ مانتے۔

جگنو فلم میں کالج کے لڑکوں کا ایک گانا ہے: وہ اپنی یاد دلانے کو اک عشق کی دنیا چھوڑ گئے، جلدی میں لپ اسٹک بھول گئے، رومال پرانا چھوڑ گئے۔ اس منظر میں جو لڑکے گاتے نظر آتے ہیں اُن میں خود نغمے کے گلوکار محمد رفیع بھی ہیں۔ بعد میں ایک گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ فلم کے لڑکے اپنے چہرے پر "چونا شونا" مل رہے تھے۔ میں نے بھی ملوا لیا۔ رفیع اس سے زیادہ طویل جملہ نہیں بولتے تھے بلکہ کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو بات ہی نہ کریں۔ گاتے ہوئے اُن کے اندر سے کوئی دوسرا محمد رفیع نکل کر آتا تھا۔

آیئے فلم جگنو کے گیتوں کی یاد تازہ کریں:

۱۔ امنگیں دل کی مچلیں مسکرائی زندگی اپنی (نور جہاں)

۲۔ دیش کی پرکیف رنگیں سی فضاؤں میں کہیں (روشن آرا بیگم، تحریر: ادیب)

۳۔ تم بھی بھلا دو میں بھی بھلا دوں، پیار پرانے گزرے زمانے (نور جہاں)

۴۔ ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی (نور جہاں، تحریر: شعری بھوپالی)

قمر جلال آبادی اور عزیز کشمیری نے فلم مرزا صاحبان کے گانے لکھے۔ اس بار بھی نور جہاں کی سریلی آواز نے اپنا سحر جگایا اور کچھ ایسے گانے وجود میں آئے:

۱۔ تم آنکھوں سے دور ہو ہوئی نیند آنکھوں سے دور

۲۔ کیا یہی تیرا پیار تھا مجھ کو تو انتظار تھا

۳۔ آجا تجھے افسانہ جدائی کا سنائیں

۴۔ ہاتھ سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آجائے (جی ایم درّانی اور نور جہاں)

اس فلم میں نور جہاں کی آواز میں بلا کا گداز تھا۔ ایک بار فلم کا ویڈیو دیکھا تو اس گداز کا راز کھلا۔ وہ امیّد سے تھیں۔ نور جہاں خود کہا کرتی تھیں کہ جب وہ امید سے ہوتی تھیں اُن کی آواز نکھر جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے جس انٹرویو میں انہوں نے یہ بات کہی، یہ لطیفہ بھی سنایا کہ اُن کے سازندے کہا کرتے تھے:

'باجی آپ ہمیشہ ایسی ہی رہا کیجئے'

یہ کہہ کر خود بھی ہنسیں۔

ثریا کی فلم ناٹک کے میوزک ڈائریکٹر نوشاد علی تھے اور غلام محمد ان کے مددگار تھے۔ اس فلم میں خمار بارہ بنکوں نے ثریا کے لئے غزل لکھی:

جب سے چلے گئے ہیں وہ زندگی زندگی نہیں
ساز ہے اور صدا نہیں، شمع ہے روشنی نہیں
چھوڑ کے مجھ کو چل دیئے یہ بھی نہیں کیا خیال
اُن کے سوا جہان میں اور میرا کوئی نہیں
سارے جہاں کی رونقیں جیسے کسی نے لوٹ لیں
پھول ہے تازگی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں
جینے کو جی رہی ہوں میں ان کے بغیر بھی مگر
زندگی کہہ سکوں جسے ایسی تو زندگی نہیں

ثریا کی اس سے بھی بڑی فلم پروانہ تھی جس کے گانے یوں بھی مقبول ہونے لگے کہ ثریا کے مقابل اداکار کے ایل سہگل تھے۔ موسیقی ترتیب دینے کا فرض خورشید انور کو سونپا گیا جنہیں آگے چل کر بڑے کارنامے انجام دینے تھے۔ پروانہ کے گیت مدھوک صاحب نے لکھے تھے جنہیں فلمی گیت لکھنے کا خاص ڈھب تھا۔ غزل کے شاعر نہیں تھے مگر اُس کے قریب پہنچ جاتے تھے کہ کوشش کر کے ثریا کے لئے یہ بول لکھے:

جب تم ہی نہیں اپنے دنیا ہی بیگانی ہے
الفت جسے کہتے ہیں اک جھوٹی کہانی ہے
جاتے ہوئے کیوں تم کو اس دل کا خیال آتا
تڑپا کے چلے جانا اک ریت پرانی ہے
پروانے کے جلنے پہ ہنسنا نہ تماشائی
ہنستی ہوئی شمع بھی اک رات کی رانی ہے

خورشید انور نے جس راگ میں یہ گانا کمپوز کیا، غالباً ان کا پسندیدہ راگ تھا۔ پاکستان جانے کے بعد اُن کے فن کو اور جلا ملی اور ایسی طرزوں میں انہوں نے کچھ ایسی گونج شامل کی کہ محسوس ہوتا تھا نغمہ کان کے قریب شروع ہوتا ہے اور اڑتا ہوا دور چلا جاتا ہے۔

"جب تم ہی نہیں اپنے" کی طرز سے ملتی جلتی دھن استعمال کر کے انہوں نے گانا بنایا:

میں تو کر کر بنتی ہار گئی　　　پیا ہاتھ چھڑا کر چلے گئے

پاکستان میں انہیں نور جہاں جیسی آواز ملی جس کی خوبیوں اور اپنی صلاحیتوں کو یکجا کر کے خورشید انور نے گلوکاری اور موسیقی کی دنیا میں معجزے دکھائے۔

۴۷ء کی فلم پروانہ کے کچھ قابل ذکر نغمے یوں تھے:

۱۔ ٹوٹ گئے سب سپنے میرے یہ دو نیناں ساون بھادوں برسیں سانجھ سویرے (سہگل)
۲۔ پاپی پپیہارے پی پی نہ بول، بیری پی پی نہ بول (ثریا)
۳۔ محبت میں کبھی ایسی بھی حالت پائی جاتی ہے (سہگل)
۴۔ آجا بالمارین اندھیری ڈرلاگے (ثریا)
۵۔ میرے منڈیرے نہ بول، جا کا گا، کا گا جا

کہتے ہیں کہ پروانہ کندن لال سہگل کی زندگی کی آخری فلم تھی۔

ان ہی دنوں کشور ساہو کی فلم سیندور نمائش کے لئے پیش کی گئی جس میں امیر بائی نے قمر جلال آبادی کا لکھا ہوا یادگار گانا گایا:

اور روٹھے ہوئے بھگوان تم کو کیسے مناؤں

اسی طرح اُن کا ایک اور نغمہ تھا: کوئی روکے اسے اور یہ کہہ دے کچھ اپنی نشانی دیتا جا۔

ادھر سی رامچندر کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی فلم شہنائی میں مشہور گانے سنڈے کے سنڈے کا قصہ پچھلے صفحوں میں بیان ہو چکا۔ شہنائی میں امیر بائی اور شمشاد کی آوازوں میں یہ گانا بھلا لگا: ہمارے انگنا آج باجے شہنائی۔ لیکن فلم کا دلکش گانا امیر بائی کرناٹکی نے گایا تھا:

ہمیں کیا پتہ تھا کہ دل کی کلی کو مسل دیں گے وہ
ہمیں کیا پتہ تھا کہ راحت کو غم میں بدل دیں گے وہ
محبت کے وعدے اور جھوٹی کھا قسمیں
کسی اور کے ہو کے چل دیں گے وہ

مار کٹاری مر جانا کہ انکھیاں کسی سے ملانا نہ
کھا کے زہر مر جانا کہ من میں کسی کو بسانا نہ

آخر میں ایک یادگار غزل جو آغا جانی کاشمیری کی فلم تحفہ میں مکیش نے گائی، جو تحریر تھی ثاقب لکھنوی کی اور جس کی طرز ایم اے رؤف (عثمانیہ) نے بنائی:

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے　　جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی　　ہمارا تھا کیا ٹھیک، رہتے نہ رہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا　　زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے
زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا　　ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ثاقب صاحب نے اس میں اعلیٰ غزل کے سارے تقاضے پورے کئے۔ لکھنؤ کا محاورہ 'ہمارا تھا کیا ٹھیک' بمبئی پہنچ کر لطف دے گیا۔ ایم اے رؤف حیدر آبادی تھے اور موسیقی سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اس غزل میں باقی خوبی مکیش نے ڈالی جن کی آواز میں قدرتی سوز تھا اور اگر مصرعوں میں احساس محرومی جھلکتا ہو تو مکیش کی ادائیگی اس میں بلا کی تاثیر بھر دیتی تھی، سامنے کی مثال:

دل جلتا ہے تو جلنے دے　　آنسو نہ بہا فریاد نہ کر
تو پردہ نشیں کا عاشق ہے　　یوں نام وفا برباد نہ کر

آئے گا آنے والا

۱۹۴۸ء نے بھی کئی تاریخی واقعات دیکھے جن میں سب سے بڑھ کر لتا منگیشکر کا پوری آب وتاب سے فلمی دنیا میں قدم رکھنا تھا۔ لتا کو نور جہاں نے کولہاپور میں دریافت کیا تھا اور بمبئی جانے کا مشورہ دیا تھا۔ بمبئی میں لتا کی خوبیوں کو پرکھنے والا ایسا موسیقار موجود تھا جس کا پھر کوئی نعم البدل نہ ہوا اور وہ تھے ماسٹر غلام حیدر۔ ان سے یقیناً نور جہاں نے بھی بات کی ہوگی۔ اُس وقت بمبے ٹاکیز والے فلم مجبور بنا رہے تھے جس کے میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر تھے۔ انہوں نے ناظم پانی پتی سے نغمے لکھوائے اور آٹھ میں سے سات گانے لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کیے۔ ساتھ میں گیتا رائے اور مکیش بھی تھے۔

دوسرا اہم واقعہ بمبے ٹاکیز ہی کی فلم ضدّی میں ہوا جسے عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف بنا رہے تھے۔ فلم میں کھیم چند پرکاش نے ایسا سلونا گانا بنایا: چندا رے جا رے جا رے، پیا سے سندیسہ مورا کہیوٴ جا۔ فلم میں معین احسن جذبی جیسے بڑے شاعر کی غزل "مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے" کے لئے ایک مردانہ آواز کی تلاش تھی چنانچہ کشور کمار نامی ایک نوجوان دریافت ہوا۔ یہی وہ اہم واقعہ تھا۔

اسی برس راج کپور کی فلم آگ میں مکیش کی آواز میں بہزاد لکھنوی کا لکھا ہوا نغمہ گایا گیا:

زندہ ہوں اس طرح کہ غمِ زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

اُس سال دلیپ کمار کی تین بڑی فلمیں جاری ہوئیں: انوکھا پیار، میلہ اور شہید۔ پہلی فلم کے موسیقار انل بسواس تھے جنہوں نے فلم کو ایسے ایسے نغموں سے سجا دیا:

۱۔ یاد رکھنا چاند تارو اس سہانی رات کو (لتا)
۲۔ میرے لئے وہ غمِ انتظار چھوڑ گئے (لتا)
۳۔ جیون سپنا ٹوٹ گیا (لتا اور مکیش)
۴۔ اک دل کا لگانا باقی تھا سو دل بھی لگا کے دیکھ لیا (لتا)
۵۔ اے دل میری وفا میں کوئی اثر نہیں ہے (لتا اور مینا کپور)
۶۔ اب یاد نہ کر بھول جا اے دل وہ فسانہ (لتا اور مکیش)

دلیپ کمار کی دوسری فلم شہید تھی جس نے محمد رفیع کو کچھ اور شہرت عطا کی کیونکہ غلام حیدر کی بنائی ہوئی طرز میں ان کا گانا "وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو" بڑے موقع کی چیز تھا اور بہت مقبول ہوا تھا۔

گانوں سے آراستہ ایک اور فلم انوکھی ادا تھی جس کے میوزک ڈائریکٹر نوشاد تھے اور نغمے سارے کے سارے شکیل بدایونی نے لکھے تھے جو اب نوشاد کے دستِ راست بنتے جا رہے تھے۔ فلم کے ایک مشہور گانے کا لطیفہ ذرا دیر بعد پہلے چند مقبول نغموں پر ایک نگاہ:

۱۔ منزل کی دھن میں جھومتے گاتے چلے چلو (مکیش)
۲۔ نظر مل گئی جانے کس کی نظر سے (شمشاد)
۳۔ یہ پیار کی باتیں یہ سفر بھول نہ جانا (مکیش)
۴۔ بھول گئے کیوں دے کے سہارا لوٹنے والے چین ہمارا (شمشاد، مکیش)
۵۔ کیوں انہیں دل دیا ہائے یہ کیا کیا (شمشاد، سریندر)
۶۔ کاہے جیا ڈولے، کہا نہیں جائے (اوما دیوی)
۷۔ جلے نہ کیوں پروانہ (سریندر، تحریر: انجم پیلی بھیتی)
۸۔ آج کہاں جا کے نظر ٹکرائی (شمشاد)
۹۔ دل کو لگا کے ہم نے کچھ بھی نہ پایا (اوما دیوی)

۱۰۔ بڑے بھولے بھالے ہیں دل لینے والے (سریندر، تحریر: انجم پیلی بھیتی)
۱۱۔ کبھی دل دل سے ٹکراتا تو ہوگا، انہیں میرا خیال آتا تو ہوگا (مکیش)

اس آخری گانے کا قصہ شکیل بدایونی کے نوجوانی کے دوست رسال الدین صاحب مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ دونوں علی گڑھ میں اکٹھے پڑھتے تھے اور ان کا دن رات کا ساتھ ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ رسال الدین صاحب خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ لندن میں رہتے ہیں اور اتنی عمر کے باوجود ان کی یادداشت حیرت انگیز ہے۔

بتا رہے تھے کہ فلم انوکھی ادا کے لئے شکیل نے گانا لکھا جس کا پہلا شعر تھا:

جفاؤں پر ملال آتا تو ہو گا　　انہیں میرا خیال آتا تو ہو گا

پروڈیوسر محبوب تھے جو نہ صرف خود بمبئی کے لہجے میں بات کرتے تھے بلکہ شاعروں سے بھی چاہتے تھے کہ عوامی زبان میں گانے لکھیں۔ یہ مصرعہ سن کر بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ یہ جب میرے پلّے نہیں پڑ رہا ہے تو عام لوگ اسے کیسے سمجھیں گے۔ اس پر شکیل نے نسبتاً آسان زبان میں کوئی مصرعہ لکھا۔ محبوب صاحب کے دل کو وہ بھی نہیں بھایا۔ رسال الدین صاحب کہتے ہیں کہ تنگ آ کر شکیل نے یہ بے تکا سا مصرعہ لکھا: کبھی دل دل سے ٹکراتا تو ہوگا، انہیں میرا خیال آتا تو ہوگا۔

کہتے ہیں کہ محبوب کو یہ مصرعہ اتنا پسند آیا کہ جیب سے نکال کر شکیل کو پانچ سو روپے دیئے۔ یہاں تک پہنچ کر رسال الدین صاحب نے اپنا تبصرہ کیا اور بولے۔ "ہمیں سو روپے دے دیتے، ہم اس سے بھی بُرا مصرعہ لکھ دیتے۔"

دلیپ کمار کی تیسری بڑی فلم میلہ کے میوزک ڈائریکٹر بھی نوشاد تھے جو ابھی تک محمد رفیع کو پرکھ رہے تھے اور اُن کی آواز کو بہت کم استعمال کر رہے تھے پھر بھی فلم کا کلاسیکی ٹائٹل سانگ رفیع نے گایا "یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے، افسوس ہم نہ ہوں گے۔" ایک گانا مکیش کے حصّے میں آیا: "گائے جا گیت ملن کے، تو اپنی لگن کے، سجن گھر جانا ہے۔" باقی سارے کے سارے گانے شمشاد بیگم نے گائے (جنہیں ہندی والے نہ جانے کیوں شمشاد بے غم لکھتے ہیں)

دلیپ کمار کی اُس وقت کی تمام دوسری فلموں کی طرح میلہ بھی ٹریجڈی تھی۔ اتنی کہ سینما ہال سے خصوصاً خواتین روتی ہوئی نکلتی تھیں۔ کلاسیکی فلم دیوداس کی ری میک میں ہیرو کا کردار دلیپ کمار کو کچھ یوں بھی دیا گیا کہ ہیرو کو آخر میں ہیروئن کی چوکھٹ پر مر جانا تھا۔

فلموں میں دلیپ کمار کو اتنے رُلانے اور آنسو بہانے والے سین کرنے پڑے کہ وہ بیمار رہنے لگے۔ دنیا انہیں شہنشاہِ جذبات کہنے لگی اور فلم کے آخر میں اُن کا مرنا ہی فلم کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ جب یہ صورتحال ان کے اعصاب کے لئے عذاب بننے لگی تو انہیں لندن جا کر ماہرین سے مشورہ لینا پڑا (پانچ سو پاؤنڈ میں انہیں وہی مشورہ ملا جو ہم دس پاؤنڈ میں دے دیتے۔) ماہرین نے کہا اب آپ ٹریجڈی فلمیں بنانا بند کر دیجئے اور کامیڈی فلمیں بنایئے۔ دلیپ صاحب نے واپس بمبئی جا کر کامیڈی فلم گوپی بنائی۔ اس میں شروع سے آخر تک ہنسی مذاق اور ناچنا گانا تھا۔ جب فلم کا افتتاحی شو ہوا اور اُسے دیکھنے کے لئے فلموں کے تقسیم کار جمع ہوئے تو دلیپ کمار نے باتوں باتوں میں ان سے کہا "سنئے، اس فلم کے آخر میں آپ مجھے مرتا ہوا نہیں دیکھیں گے۔" خود بتا رہے تھے کہ یہ سن کر تقسیم کار بھونچکے رہ گئے اور بولے "ہائیں آپ مریں گے نہیں، پھر تو یہ فلم نہیں چلے گی۔"

سنہ ۴۸ء کے آخر میں ثریا کی فلم گجرے کا ذکر ضروری ہے۔ اس کے نغمہ نگار گوپال سنگھ نیپالی تھے جن کے لکھے ہوئے کم سے کم دو گانے بہت سبک تھے۔ ایک گانا ثریا نے گایا:

دور پپیہا بولا رات آدھی رہ گئی ۔۔۔ میری تمہاری ملاقات باقی رہ گئی
میرا دل ہے اُداس جیا مند مند ہے ۔۔۔ بادلوں کے گھیرے میں چاند نظر بند ہے
بادل آئے پر برسات باقی رہ گئی ۔۔۔ میری تمہاری ملاقات باقی رہ گئی
آنکھ مچولی کھیلی جھولا جھوم کے جھولے ۔۔۔ بن میں چنبیلی پھولی ہم بہار میں بھولے
پر دینی تھی جو سوغات باقی رہ گئی ۔۔۔ میری تمہاری ملاقات باقی رہ گئی

دوسرے گانے کی نازک خیالی بھی قابل داد ہے۔ محبوب کے انتظار اور نہ آنے کی شکایت کا اتنا حسین اظہار کم ہی ہوا ہے، صرف چند مصرعے نقل کرتا ہوں:

برس برس بدلی بھی بکھر گئی اب کب آؤ گے
ترس ترس انکھیاں بھی نکھر گئیں اب کب آؤ گے
اُبھر اُبھر مہندی بھی اتر گئی اب کب آؤ گے

یہ گیت لتا نے گایا تھا اور طرز بنانے والا کوئی معمولی موسیقار نہیں، انل بسواس تھے جنہیں دنیا پیار سے انل دا کہتی تھی۔

اگر مقبول نغموں کا سالانہ گراف بنایا جائے تو سال ۱۹۴۹ء میں وہ اپنی چوٹی پر جائے گا۔ اس سال تو بڑے بڑے کام ہوئے۔ اپنے دامن میں نہایت اعلیٰ طرزیں سجائے نوشاد صاحب کی چار فلمیں دلاری، دل لگی، چاندنی رات اور سب سے بڑھ کر انداز جاری ہوئیں جس میں مجروح صاحب نے مکیش اور لتا کے لئے یادگار نغمے لکھے۔ راج کپور کی فلم برسات کے ساتھ دو بڑے نغمہ نگاروں حسرت جے پوری اور شیلندر کے نام سننے میں آئے۔ فلم لاہور میں راجندر کرشن نے 'بہاریں پھر بھی آئیں گی' جیسے نغمے لکھے۔ بلا کے ذہین میوزک ڈائریکٹر روشن میدان میں اُترے۔ فلم بڑی بہن کے گانے گلی گلی گائے جانے لگے اور سب سے بڑھ کر کھیم چند پرکاش کی موسیقی کی بنیادوں پر محل کی عمارت کھڑی ہوئی اور 'آئے گا آنے والا' جیسا نغمہ تخلیق ہوا۔

۴۹ء میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ کہیں کسی گمنام گوشے میں 'آزادی کی راہ' کے نام سے ایک فلم بنی جس کے لئے ساحر لدھیانوی نے اپنی زندگی کے پہلے چار نغمے لکھے۔ پھر خدا جانے کیا ہوا، اس فلم کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ اب نہ فلم کہیں ملتی ہے نہ اس کے گانے، یہاں تک کہ ساحر بھی اُسی گوشے میں گم رہے اور پورے دو سال بعد فلم نوجوان میں برآمد ہوئے۔

جس وقت فلم انداز بن رہی ہوگی، اس سے وابستہ ہر شخص اپنے عروج پر تھا۔ خود محبوب صاحب، دلیپ کمار، نرگس، گلوکار مکیش، موسیقار نوشاد اور نغمہ نگار مجروح سلطان پوری چنانچہ ایسے ایسے نغمے کانوں میں رس گھولنے لگے۔

۱۔ ہم آج کہیں دل کھو بیٹھے (مکیش)

۲۔ ڈر نہ محبت کر لے (شمشاد اور لتا)

۳۔ تو کہے اگر جیون بھر میں گیت سناتا جاؤں (مکیش)

۴۔ کوئی میرے دل میں خوشی بن کر آیا (لتا)

۵۔ ٹوٹے نہ دل ٹوٹے نہ (مکیش)

۶۔ جھوم جھوم کے ناچو آج گاؤ خوشی کے گیت (مکیش)

۷۔ توڑ دیا دل میرا تو نے ارے بے وفا (لتا)

۸۔ اُٹھائے جاان کے ستم (لتا)

اس آخری گانے کے بارے میں نوشاد صاحب بتاتے ہیں کہ انہوں نے اور مجروح نے رات بھر جاگ کر اسے مکمل کیا تھا۔ ان دنوں نوشاد صاحب کے مکان پر چھت ڈالی جارہی تھی اور سب کچھ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا، ایسے میں اس دلکش نغمے کو دونوں نے مل کر سمیٹا تھا۔

اپنی اور فلموں کی طرح انداز میں بھی نوشاد نے محمد رفیع کو گانے کے لئے ایک معمولی سا نغمہ دیا "یوں تو آپس میں بگڑتے ہیں، خفا ہوتے ہیں" لیکن رفیع کی دربدری کا یہ آخری گانا تھا۔ اس کے بعد نوشاد علی سمیت تمام موسیقاروں پر رفیع کے بھید کھلے اور پھر تو وہ اور شکیل بدایونی اُن کے دو بازو بن گئے۔ اسی سال نوشاد کی تین فلموں، چاندنی رات، دل لگی اور دلاری پر رفیع چھائے رہے اور یہ سلسلہ اُن کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلا۔

دلاری میں رفیع نے شعر کے رس میں ڈوبا ہوا نغمہ گایا: "سہانی رات ڈھل چکی، نہ جانے تم کب آؤ گے۔" اس کی طرز پہاڑی میں بنائی گئی اور پھر ہوا یہ کہ رفیع اور نوشاد دونوں کو یہ نغمہ اتنا عزیز ہوا کہ اس کی تخلیق پر وہ فخر کرنے لگے۔ You Tube میں اس کا وڈیو دیکھا جا سکتا ہے جس میں رفیع اپنا بہترین لباس زیب تن کر کے آئے اور نوشاد کسی عظیم موسیقار کی طرح سازینے کو کنڈکٹ کرتے دیکھے جا سکتے ہیں کہ ایک عجیب سرمستی ان کے چہرے بُشرے سے ٹپکی پڑتی ہے۔

فلم چاندنی رات میں شکیل بدایونی کے لکھے ہوئے چند نغمے آج بھی مقبول ہیں

مثلاً چھین کے دل کیوں پھیر لیں آنکھیں جان گئے ہم جان گئے۔ کیسے بجے دل کا ستار ٹھیس لگی ٹوٹ گئے تار۔ خبر کیا تھی کہ غم کھانا پڑے گا۔ دو دن کی خوشی راس نہ آئی میرے جی کو اور چھایا میری امید کی دنیا میں اندھیرا۔

اسی طرح فلم دل لگی کے مقبول نغمے: مرلی والے مرلی بجا۔ دنیا کیا جانے میرا افسانہ۔ تو میرا چاند میں تیری چاندنی۔ تیرا خیال دل سے بھلایا نہ جائے گا۔ اس دنیا میں اے دل والو دل کا لگانا کھیل نہیں۔ چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیری رات ہے۔ نرالا محبت کا دستور دیکھا۔ ظالم زمانہ مجھ کو تم سے چھڑا رہا ہے اور رفیع کی آواز میں یہ غزل:

تیرے کوچے میں ارمانوں کی دنیا لے کے آیا ہوں
تجھی پر جان دینے کی تمنا لے کے آیا ہوں
جگر میں درد دل میں ٹیس اور آنکھوں میں دو آنسو
ذرا تو دیکھ لے آ کر میں کیا کیا لے کے آیا ہوں
وہ افسانہ محبت کا کبھی جو تو نے چھیڑا تھا
وہی افسانہ ہونٹوں پر ادھورا لے کے آیا ہوں

دل لگی کے اکثر گانے ثریا اور شیام نے گائے ہیں۔ اتفاق سے فلم کے ہیرو کا نام بھی شیام تھا۔ دنیا یہی سمجھی کہ گانے اداکار نے خود گائے ہیں لیکن پہلے کہیں ذکر آ چکا ہے، اسٹوڈیو کا ایک ملازم جس کے ذمے چھوٹے موٹے کام کرنا تھا، کام کرتا جاتا اور گاتا جاتا تھا۔ ایک روز نوشاد صاحب اس کو بانہہ پکڑ کر لے آئے اور مشہور گلوکار بنا دیا مگر وہ نوشاد ہی کا چہیتا رہا۔ دوسرے موسیقاروں نے اس کی آواز کو بہت کم استعمال کیا۔

ان کی ایک اور فلم دلاری میں دو تین کے سوا سارے گانے لتا منگیشکر نے گائے ہیں۔ اُس وقت وہ بیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں چنانچہ ان کے گانوں سے بچپن ٹپکتا ہے۔ فلم کے ہیرو سریش تھے جو لڑکپن میں گاتے تھے مگر کسی حاسد نے انہیں کوئی ایسی چیز پلا دی کہ پھر ان کے گلے میں گانے کی سکت نہیں رہی۔ فلم میں ان کے لئے رفیع نے سہانی رات کا گانا گایا جس میں خدا جانے کیوں انہیں برطانوی شکاری کا لباس پہنا کر کھڑا کیا گیا تھا۔

فلموں میں کبھی کبھی عجیب و غریب کام ہوتے ہیں۔ ذرا دیر پہلے جس فلم انداز کا ذکر تھا اس کے ہیرو دلیپ کمار کے بارے میں آخر تک یہ بھید نہیں کھلا کہ اس کا روزگار کا ذریعہ کیا تھا۔ کھاتا کماتا کیسے تھا اور ایک امیر زادی کے گھر اتنا بن سنور کے آنے کے لئے اس کا خرچ کون اٹھاتا ہوگا۔

فلم بڑی بہن کے نغموں کی شہرت آسمان کو پہنچی۔ یہ نغمے قمر جلال آبادی اور راجند کرشن نے لکھے تھے اور ان میں آوازیں ثریا، لتا اور رفیع کی تھیں۔ دو بھائی حسن لال اور بھگت رام میوزک ڈائریکٹر تھے۔ اُن کے بعد دو بھائیوں یا ساتھیوں کے میوزک ڈائریکٹر ہونے کا رواج ایسا عام ہوا کہ تنہا موسیقار خیام تک نے اپنا نام ورما جی شرما جی رکھ لیا۔ جوڑی دار بننے کے اشتیاق میں تو انہوں نے ترک اسلام کیا۔

خیر یہ بڑی بہن کے مقبول گانوں کی یاد دہانی کا وقت ہے:

۱۔ چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے (لتا اور پریم لتا)

۲۔ وہ پاس رہیں یا دور رہیں، نظروں میں سمائے رہتے ہیں (ثریا)

۳۔ چلے جانا نہیں نین ملا کے، سیاں بے دردی (لتا)

۴۔ جو دل میں خوشی بن کر آئے، وہ درد جگا کر چلے گئے (لتا)

۵۔ تم مجھ کو بھول جاؤ، اب ہم نہ مل سکیں گے (ثریا)

۶۔ لکھنے والے نے لکھ دی، میری تقدیر میں بربادی (ثریا)

۷۔ بگڑی بنانے والے بگڑی بنادے، نیا ہماری پار لگا دے (ثریا)

۸۔ محبت کے دھوکے میں کوئی نہ آئے (رفیع)

اسی برس، راج کپور کی فلم برسات جاری ہوئی۔ اس میں بھی دو جوڑی دار میوزک ڈائریکٹر شنکر اور جے کشن لائے گئے۔ کسی مشاعرے میں حاضرین کی داد بٹورنے والے حسرت جے پوری بھی بُلائے گئے۔ شیلندر کو بھی دنیا نے جانا لیکن فلم کا سب سے مقبول نغمہ ' ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا' رمیش شاستری نے لکھا تھا۔ اس قطار میں

ایک اور شاعر جلال ملیح آبادی بھی تھے۔ غرض یہ کہ اس پورے طائفے نے برسات کے نغمے تیار کئے۔

فلم کے ہیرو راج کپور تھے اور فلم میں جگہ جگہ وائلن پر ایک مخصوص دھن بجاتے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ اس دھن کے راگ پر کئی نغمے تیار کئے۔

اُس دھن کا قصہ یوں سننے میں آیا کہ فلم کی تیاری سے پہلے راج کپور کا پیرس جانا ہوا۔ ایک روز انہوں نے پیرس کے ایک ریلوے اسٹیشن پر ایک شخص کو وائلن بجاتے سنا۔ وہ وہی مخصوص طرز بجا رہا تھا۔ وہ طرز راج کپور کے دل میں کھب گئی۔ اسے گنگناتے گنگناتے وہ بمبئی پہنچے اور شہر کے سب سے اچھے وائلن نواز کو یہ طرز یاد کرا دی۔ پھر جب فلم برسات کے گانوں کی طرزیں بن رہی تھیں تو راج کپور ان میں برابر کے شریک تھے۔ پیرس سے درآمد کی ہوئی وائلن کی اُس دھن پر فلم میں ایسے ایسے گانے بنائے گئے: مجھے کسی سے پیار ہو گیا۔ میری آنکھوں میں بس گیا کوئی رے اور بے حد سنجیدہ دوگانا "چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے۔"

جیسے نغمے سفر کرتے ہیں، ویسے ہی طرزیں بھی اڑان بھرا کرتی ہیں۔

آیئے آگے چلیں۔

فلم بازار میں قمر جلال آبادی کے لکھے ہوئے بعض نغموں میں شعر گوئی کی روایت بڑی خوبی سے نبھائی گئی اسی لئے یہ گانے مقبول ہوئے: اپنی نظر سے دور وہ ان کی نظر سے دور ہم، تم ہی بتاؤ کیا کریں مجبور تم مجبور ہم۔ اور شیام سندر کی بنائی ہوئی طرز نے اس گانے کو لمبی عمر عطا کر دی: ساجن کی گلیاں چھوڑ چلے دل رویا آنسو بہہ نہ سکے، یہ جینا بھی کوئی جینا ہے، ہم ان کو اپنا کہہ نہ سکے۔

ان ہی دنوں فلم چکوری تیار ہوئی جس کے بارے میں روایت ہے کہ اس کی کہانی سعادت حسن منٹو نے لکھی تھی۔

موسیقار نثار بزمی ابھی پاکستان نہیں گئے تھے۔ انہوں نے فلم ہماری قسمت کی نہ صرف موسیقی ترتیب دی بلکہ اس میں گلوکارہ رانی کے ساتھ ایک گانا گایا۔ اُس وقت تک اکثر

میوزک ڈائریکٹر اپنی ہر فلم میں دو ایک گانے خود بھی گاتے تھے، خصوصاً غلام حیدر، انل بسواس اور سی رام چندر عرف چتلکر نے یہ کام خوب کیا۔

فلم لاہور میں راجندر کرشن نے کچھ نغمے لکھے جن میں شاعری اپنے عروج پر تھی اور جنہیں بلا تکلف لازوال قرار دیا جا سکتا ہے مثلاً یہ نغمہ:

نظر سے دور جانے والے دل سے دور نہ کرنا — میری آنکھوں کو رونے پر کبھی مجبور نہ کرنا
بہاریں پھر بھی آئیں گی مگر ہم تو جدا ہوں گے — گھٹائیں پھر بھی چھائیں گی مگر ہم تم جدا ہوں گے
جہاں چھپ چھپ کے ہم ملتے تھے ساجن وہ گلی ہم کو — اشاروں سے بلائے گی مگر ہم تم جدا ہوں گے
سندیسہ پیار کا لائیں گی ساون کی جواں راتیں — پون جھومے گی گائے گی مگر ہم تم جدا ہوں گے

لتا منگیشکر اور کرن دیوان کی آوازوں میں یہ نغمہ جس میں کرن دیوان فلم رتن کے نغموں کے مقابلے میں کافی سیکھے سکھائے لگے مگر اس کے بول کتنے حسین ہیں، دیکھئے اور دونوں نے مل کر اسے جس طرح گایا ہے، ممکن ہو تو ضرور سنئے:

دنیا ہمارے پیار کی یوں ہی جواں رہے — میں بھی وہیں رہوں میرا ساجن جہاں رہے
دو دن کی زندگی ہے اسے یوں گزار دیں — اجڑی ہوئی یہ پیار کی راہیں سنوار دیں
ہم تم یہاں رہیں نہ رہیں اس کا غم نہیں — لیکن ہمارے پیار کا باقی نشاں رہے
دنیا میں چھوڑ جائیں گے ہم وہ نشانیاں — بن جائیں گی وہ پیار کی میٹھی نشانیاں
دنیا ہمارے بعد ہمیں یوں کرے گی یاد — دو پیار کرنے والے تھے پر ایک جاں رہے
میں بھی وہیں رہوں میرا ساجن جہاں رہے

فلم لاہور کے میوزک ڈائریکٹر شیام سندر تھے، اپنے نام جیسی سندر طرزیں بناتے تھے۔

ثریا کی فلم لیکھ میں قمر جلال آبادی نے مکیش کے لئے سادہ سی غزل لکھی اور مکیش نے اس میں اپنی آواز کا سوز بھر دیا:

لُٹ گیا دن رات کا آرام کیوں — اے محبت تیرا یہ انجام کیوں
ہم نے مانگی تھی محبت کی شراب — لائی قسمت آنسوؤں کا جام کیوں

دل سمجھتا ہے کہ تو ہے بے وفا　　　آ رہا ہے لب پہ تیرا نام کیوں

یہ مثال دے کر میں اپنی بات پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ جنہیں ہم فلمی شاعر کہہ کر بظاہر ان کا درجہ گھٹاتے ہیں ان میں سے اکثر مستند شاعر تھے اور اساتذہ کے کلاسیکی رنگ میں شعر کہتے تھے پر جب میر تقی میر کے نظریے کے مطابق گفتگو عوام سے کرنے کا مرحلہ آیا تو انہوں نے نہایت چابک دستی سے شعر کی ساری خوبیاں اور خصوصیات برقرار رکھتے ہوئے یہ نغمے لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ستھرے ستھرے مصرعے اور نکھرے ہوئے شعر گلی کوچوں میں زیر لب گنگنائے گئے تو یاروں کی محفل میں بلند آواز سے گائے گئے۔ شعر کہنے، سمجھنے اور دہرانے کا شعور آپ ہی آپ معاشرے کو منتقل ہو گیا۔

سنہ ۴۹ء کی فلم رات کی رانی میں آرزو صاحب نے جو کلکتے کو خیر باد کہہ آئے تھے، محمد رفیع کے لئے غزل لکھی۔ فلم میں یہ غزل ایک مشاعرے میں پڑھی گئی اور آخر میں شاعر نے اپنا تخلص بھی برتا۔ بمبئی میں اس کا چلن کم تھا مگر آرزو کے نام نے غزل کی شان بڑھا دی۔ اس کا مکمل متن یوں ہے:

جن راتوں میں نیند اڑ جاتی ہے　　　کیا قہر کی راتیں ہوتی ہیں
دروازوں سے ٹکرا جاتے ہیں　　　دیواروں سے باتیں ہوتی ہیں
گھِر گھِر کے جو بادل آتے ہیں　　　اور بن برسے کھل جاتے ہیں
آشاؤں کی جھوٹی دنیا میں　　　سوکھی برساتیں ہوتی ہیں
جب وہ نہیں ہوتے پہلو میں　　　اور لمبی راتیں ہوتی ہیں
یاد آ کے ستاتی رہتی ہے　　　اور دل سے باتیں ہوتی ہیں
ہنسنے میں جو آنسو آتے ہیں　　　دو تصویریں دکھلاتے ہیں
ہر روز جنازے اٹھتے ہیں　　　ہر روز براتیں ہوتی ہیں
ہمت کس کی ہے جو پوچھ سکے　　　یہ آرزوئے سودائی سے
کیوں صاحب آخر اکیلے ہیں　　　یہ کس سے باتیں ہوتی ہیں

اس کے بعد آرزو صاحب پاکستان چلے گئے اور دو سال بعد انتقال کر گئے۔ ان کا

ایک شعر یادگار رہے گا

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

فلم پتنگا میں یوں تو غیر سنجیدہ گانے بہت سے ہیں۔ موسیقار سی رام چندر کو اس میں کافی مہارت حاصل تھی لیکن چند سنجیدہ گانوں کو راجندر کرشن کے لکھے ہوئے بولوں نے سنوارا ہے مثلاً دل سے بھلا دو تم ہمیں، ہم نہ تمہیں بھلائیں گے، روٹھ کے جانے والے ہم دنیا سے روٹھ جائیں گے۔ او جانے والے تو نے ارمانوں کی دنیا لوٹ لی، مسکرانے بھی نہ پائی تھی، تمنا لوٹ لی۔ اور لتا ہی کی آواز میں تیسرا نغمہ: کبھی خاموش ہو جانا، کبھی فریاد کر لینا مگر اُس بے وفا کو چپکے چپکے یاد کر لینا۔

فلم شاعر کے نغمے شکیل بدایونی نے لکھے اور سہل زبان میں غزل تحریر کی۔

یہ دنیا ہے یہاں دل کا لگانا کس کو آتا ہے
ہزاروں پیار کرتے ہیں، نبھانا کس کو آتا ہے

اسی طرح فلم سنہرے دن میں شیون رضوی نے یہ نغمہ لکھا۔

بہاروں نے جسے چھیڑا ہے، وہ ساز جوانی ہے زمانہ سن رہا ہے جس کو میری ہی کہانی ہے

اور سنہ ۴۹ء کے آخر میں جدید زمانے کی کلاسیکی فلم محل بنی جسے پکار جیسی یادگار فلم کے خالق کمال امروہوی نے تخلیق کیا اور جس کی خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی اس کے نغمے تھے جن میں زیادہ تر خشب جارچوی کے قلم سے نکلے اور جن کی طرزیں کھیم چند پرکاش نے بنائیں۔ فلم محل کے تاج میں جو نغمہ نگینہ بن کر جڑا ہے اُس نے لتا منگیشکر کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ آئے گا آنے والا دو حصّوں میں ہے۔ پہلے حصّے میں مصرعے آراستہ کر کے نغمے کی تمہید باندھی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ گانے کا یہ حصّہ خود کمال امروہوی نے لکھا تھا۔ دوسرے حصے میں آئے گا آئے گا کی خوبصورت تکرار ہے جس کے متعلق سنا ہے کہ جب آزمائش کے طور پر یہ نغمہ فلم میں سرمایہ لگانے والے کسی سیٹھ کو سنایا گیا تو اُس نے اپنے بال نوچ لئے اور چلا کر بولا کہ کب آئے گا (یہاں کوئی بمبیا گالی بھی دی ہوگی۔) سنا ہے کہ سیٹھ اڑ گیا کہ یہ گانا

خود بھی نا کام ہوگا اور فلم کو بھی نا کام کرے گا۔

یہ اُس وقت بہت ہوتا تھا کہ اچھی شاعری اور نفیس موسیقی سرمایہ کار سیٹھوں کی موٹی عقل میں نہیں سماتی تھی اور وہ نغمہ نگاروں پر دباؤ ڈال کر مصرعے تبدیل کراتے تھے۔ اس جہالت کے بت کو آگے چل کر ساحر لدھیانوی نے پاش پاش کیا۔ لوگ تو کہتے ہی ہوں گے، سیٹھ حضرات بھی ان کو بد دماغ کہتے تھے اور ان کے آگے منہ کھولنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ ساحر لدھیانوی کا مصرعہ کاغذ پر نہیں، پتھر پر تحریر ہوتا تھا۔

ہاں تو محل کے سیٹھ کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا گیا اور سنا ہے کہ جب آئے گا آنے والا کی دھوم مچی تو منہ چھپاتا پھرتا تھا۔

چونکہ فلم محل اور اس کی کہانی آسیب زدہ تھی لہٰذہ اس نغمے کو بھی پُراسرار بنانا ضروری تھا۔ اُس وقت اسٹوڈیو میں آج جیسی سہولتیں تو تھیں نہیں اور گانے میں گونج کا تاثر پیش کرنا تھا لہٰذا اس طرح کے سارے بول اسٹوڈیو کے غسل خانے میں ریکارڈ کئے گئے۔ باقی حصّے کی ریکارڈنگ کے لئے مائیکروفون بڑے ہال کے وسط میں رکھا گیا۔ لتا نے ہال کے ایک کونے میں گانا شروع کیا اور آہستہ آہستہ مائیکروفون کی طرف بڑھتی گئیں۔ گانا ختم ہو گیا مگر پھر لتا کے قدم نہیں رُکے۔ ان کی پگڈنڈی آسمان تک جاتی تھی۔

خاموش ہے زمانہ چُپ چاپ ہیں ستارے — آرام سے ہے دنیا بے کل ہیں دل کے مارے
ایسے میں کوئی آہٹ اس طرح آ رہی ہے — جیسے کہ چل رہا ہے من میں کوئی ہمارے
یا دل دھڑک رہا ہے اِس آس کے سہارے — آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا
دیپک بغیر جیسے پروانے جل رہے ہیں — کوئی نہیں چلاتا اور تیر چل رہے ہیں
تڑپے گا کوئی کب تک بے آس بے سہارے — لیکن یہ کہہ رہے ہیں دل کے میرے اشارے
آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا آئے گا

بھٹکی ہوئی جوانی منزل کو ڈھونڈتی ہے — مانجھی بغیر نیّا ساحل کو ڈھونڈتی ہے
کیا جانے دل کی کشتی کب تک لگے کنارے — لیکن یہ کہہ رہے ہیں دل کے میرے اشارے
آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا

اس نغمے کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ پردے پر اسے مدھو بالا نے گایا۔ حسن اُس پر ختم تھا۔

محل کے دوسرے قابل ذکر نغمے کچھ یوں تھے:

ا۔ یہ رات پھر نہ آئے گی جوانی بیت جائے گی (زہرہ اور راج کماری)

۲۔ مشکل ہے بہت مشکل چاہت کا بُھلا دینا (لتا)

۳۔ گھبرا کے جو ہم سر کو ٹکرائیں تو اچھا ہو
اِس جینے میں سو دکھ ہیں مر جائیں تو اچھا ہو (راج کماری)

۴۔ میں وہ ہنسی ہوں لب پہ جو آنے سے رہ گئی (راج کماری)

۵۔ اک تیر چلا، دل پہ لگا، ہائے میرا دل (راج کماری)

۶۔ دل نے پھر یاد کیا، بے وفا لوٹ بھی آ (لتا)

ایک طرف دنیا میں فلم محل اور اس کی موسیقی کی دھوم مچ رہی تھی، دوسری طرف موسیقار کھیم چند پرکاش اسپتال میں زندگی کے آخری دن گن رہے تھے۔ وہ محل کی مقبولیت دیکھنے سے پہلے ہی صرف بیالیس سال کی عمر میں چل بسے۔ کہتے ہیں کہ صرف ایک نرس تھی جوان کو سہارا دے رہی تھی۔ مرتے ہوئے موسیقار نے اُس پر ایسا اثر چھوڑا کہ ان کی وفات کے بعد وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی۔ سنا ہے وہ سڑکوں پر گاتی پھرتی تھی 'آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا آئے گا'۔

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل

کہتے ہیں کہ سنہ ۵۰ء کو ختم ہونے والے دس برس مقبول موسیقی کے سنہرے برس تھے۔نہیں یوں نہیں تھا بلکہ ہوا یوں کہ ان دس برسوں کے دوران مقبول موسیقی کی کہانی کے سارے کردار اسٹیج پر آ چکے تھے۔

تمام بڑے فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار، اداکار اور گلوکار ان دس برسوں کے دوران میدان میں اتر چکے تھے۔ایک طلعت محمود رہ گئے تھے سو وہ بھی کلکتے سے سدھارے اور بمبئی جا پہنچے۔خود لکھنؤ کے تھے، ہم وطن ہونے کے تعلق سے موسیقار نوشاد علی سے ملے۔ ان سے پہلے ان کی شہرت پہنچ چکی تھی چنانچہ نوشاد صاحب نے اپنی زیر تکمیل فلم بابل کے گانے ان کے سپرد کر دیئے۔

ان ہی دنوں شاہد لطیف اپنی مشہور فلم آرزو بنا رہے تھے جس کے نغمے لکھنے والوں میں مجروح سلطان پوری اور جاں نثار اختر جیسے پائے کے شاعر شامل تھے اور موسیقی ترتیب دینے کا فرض انل دا کو سونپا گیا تھا جنہیں مجروح صاحب کی ایک غزل گانے کے لئے مردانہ آواز کی تلاش تھی۔انہیں طلعت محمود کے بمبئی پہنچنے کی خبر ملی تو انہوں نے اس خوبرو گلوکار کو بلایا اور اگرچہ وہ طلعت کی آواز سے اچھی طرح واقف تھے پھر بھی انہوں نے فرمائش کی کہ طلعت محمود کچھ گا کر سنائیں۔گانا شروع ہوا تو انل بسواس نے محسوس کیا کہ طلعت محمود بہت سنبھل سنبھل کر گا رہے ہیں۔انل بسواس نے سبب پوچھا تو طلعت صاحب نے جواب دیا

کہ لوگ کہتے ہیں کہ میری آواز کانپتی ہے اس لئے سنبھل کر گا رہا ہوں۔ اس پر انل بسواس نے وہ تاریخی جملہ کہا کہ اسی کانپتی ہوئی آواز کے لئے ہم نے تمہیں بلایا ہے۔

طلعت محمود نے اتنی ہی تاریخی غزل گائی: اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل، جہاں کوئی نہ ہو، اپنا پرایا مہرباں نامہرباں کوئی نہ ہو۔ اُدھر نوشاد صاحب کی فلم بابل میں طلعت محمود کی آواز میں پانچ گانے تیار ہوئے لیکن پھر یہ ہوا کہ بابل سے پہلے فلم آرزو ریلیز ہوگئی اور دنیا نے یہی کہا کہ طلعت محمود کا پہلا نغمہ فلم آرزو کے لئے ریکارڈ ہوا تھا۔

نوشاد صاحب اپنے عروج پر تھے اور ان کی دوسری فلموں کی طرح بابل بھی نغماتی یا میوزیکل فلم تھی۔ اس کے سارے نغمے شکیل بدایونی نے لکھے حالانکہ ان کی دو نامور فلموں شاہ جہاں اور انداز کے یادگار نغمے مجروح صاحب لکھ چکے تھے مگر اس کے بعد ان دونوں کا ساتھ ٹوٹ گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ نوشاد علی کو یقین تھا کہ مجروح کمیونسٹ ہیں اور یہ کہ کمیونسٹ خدا کو نہیں مانتے لہٰذا انہوں نے مجروح صاحب سے قطع تعلق کر لیا۔ اب خدا ہی جانے کہ اس میں کتنا سچ ہے۔

فلم بابل کے بعد نوشاد صاحب اور طلعت محمود کا تعلق بھی باقی نہیں رہا۔ طلعت محمود کسی بات پر اُن سے ناراض ہوگئے۔ اس کا لمبا قصہ ہے جس میں نہ ہی پڑا جائے تو اچھا ہے۔

بابل میں لتا اور شمشاد بیگم نے بہت مشہور گانے گائے حالانکہ شمشاد کی آواز جتنی توانا اتنی ہی نوجوان لتا کی آواز دھیمی تھی۔ نوشاد صاحب خود بتاتے ہیں کہ لتا کو مائیکروفون سے ڈیڑھ فٹ دور اور شمشاد کو نو دس فٹ دور کھڑا کیا جاتا تھا تب دونوں کی آوازوں میں توازن ہوتا تھا۔ شمشاد کی توانائی کا تو یہ عالم تھا کہ بابل کے ایک گانے میں بظاہر طلعت محمود شمشاد بیگم کو گانا سکھا رہے ہیں۔ ایک بول طلعت گاتے ہیں پھر وہی بول شمشاد بیگم دہراتی ہیں۔ گانا سنیں تو یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کو گانا سکھا رہا ہے۔

اس کے بعد ایم صادق کی فلم انمول رتن آئی جس میں طلعت نے کئی دلکش نغمے گائے، دو میں لتا منگیشکر بھی ان کے ساتھ تھیں:

۱۔شکوہ تیرا ہیں گاؤں دل میں سمانے والے　　بھولے سے یاد کرلے او بھول جانے والے

۲۔یاد آنے والے پھر یاد آرہے ہیں　　میرے خیالوں کی دنیا پہ چھائے جارہے ہیں

تیسری غزل ہے جو ڈی این مدھوک نے لکھی ہے اس کی طرز میوزک ڈائریکٹر ونود نے بنائی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں محرّم کی مجلسوں میں خواتین بالکل اسی طرز میں نوحے پڑھا کرتی تھیں۔ نغمے کے شعر یوں ہیں:

جب کسی کے رُخ پہ زلفیں آکے لہرانے لگیں　　حسرتیں اُٹھ اُٹھ کے ارمانوں سے ٹکرانے لگیں

مل گئیں آنکھوں سے آنکھیں بھول سے یا جان کر　　وہ بھی شرمانے لگے اور وہ بھی شرمانے لگیں

درد جو پیدا ہوا ہے دل میں، دل کیسے کہے　　دھڑکنیں دل کی کہانی دل کو سمجھانے لگیں

سنہ ۵۰ء میں ثریا نے ایس ڈی برمن کی فلم افسر کے لئے دو بہت خوبصورت نغمے گائے جو نریندر شرما نے لکھے تھے۔ نریندر اپنے گانوں میں عربی فارسی کے لفظ نہیں لکھتے تھے۔ یہ کمال آرزو لکھنوی کو بھی حاصل تھا۔ افسر کے وہ دو نغمے یوں تھے:

۱۔　من مور ہوا متوالا　　کس نے جادو ڈالا

۲۔　نین دیوانے اک نہیں مانیں　　کریں من مانی مانیں نا

فلم آنکھیں میں راجا مہدی علی خاں نے نغمے لکھے اور مدن موہن نے طرزیں بنائیں:

۱۔ پریت لگا کے میں نے یہ پھل پایا　　سدھ بدھ کھوئی چین گنوایا (مکیش)

۲۔ ہم عشق میں برباد ہیں برباد رہیں گے　　دل روئے گا تیرے لئے آنسو نہ بہیں گے (رفیع)

فلم باورے نین میں میوزک ڈائریکٹر نے اپنا سکّہ جمایا۔ اس کے گانے پروڈیوسر کیدار شرما نے خود لکھے اور آوازوں کے لئے مکیش، راج کماری اور گیتا رائے کو چنا۔ چند مثالیں:

۱۔　سن بیری بلم سچ بول رے اِب کیا ہوگا

۲۔　مجھے سچ سچ بتادو، کیا، کہ کب دل میں سمائے تھے
　　وہ پہلی بار مجھ کو دیکھ کر جب مسکرائے تھے

۳۔　خیالوں میں کسی کے اس طرح آیا نہیں کرتے

کسی کو بے وفا آ آ کے تڑپایا نہیں کرتے

اسی سال اے آر کاردار کی فلم داستان جاری ہوئی جس کے موسیقار نوشاد علی تھے اور نغمہ نگار شکیل بدایونی۔ سارے گانے ثریا اور محمد رفیع نے گائے، چند قابل ذکر نغمے:

۱۔ یہ موسم اور یہ تنہائی ذرا دم بھر کو آ جاؤ

۲۔ اے شمع تو بتا تیرا پروانہ کون ہے

۳۔ دل کو تیری تصویر سے بہلائے ہوئے ہیں

۴۔ محبت بڑھا کر جدا ہو گئے، نہ سوچا نہ سمجھا خفا ہو گئے

فلم ساز کیدار شرما نے فلم جوگن بنائی جس میں نرگس اور دلیپ کمار نے بہت متاثر کرنے والے کردار ادا کئے۔ گیتا رائے نے اس فلم میں میرا بائی کے گیت گائے خصوصاً وہ گیت جس کا میں اکثر حوالہ دیتا ہوں:

ہے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئی

میرا بائی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں تھیں ان کے دھارمک گیتوں میں فارسی کے لفظ مثلاً دیوانی اور درد کتنی خوبصورتی سے جگہ پا رہے تھے۔ اس طرح اردو نے وہ شکل اختیار کی جس شکل میں یہ ورثہ ہم نے پایا ہے۔

شاہین پکچرز، بمبئی کے بینر کے نیچے ایس ایم نواب نے فلم کھیل بنائی جس کے میوزک ڈائریکٹر سجاد حسین تھے اور نغمہ نگاروں کی تو پوری صف بندی کی گئی تھی: آرزو لکھنوی، ضیا سرحدی، ساغر نظامی، بہزاد لکھنوی، شمس عظیم آبادی، خاور زماں اور جاں نثار اختر، مگر شہرت ساغر صاحب کی ایک غزل کو ملی:

جاتے ہو تو جاؤ ہم بھی یہاں وعدوں کے سہارے جی لیں گے
خود دے کے کسی کو دل اپنا کچھ کھیل نہیں جینا لیکن
گھٹ گھٹ کے سہی مر مر کے سہی جیسے بھی بنے گا جی لیں گے

فلم لاجواب میں لتا نے پریم دھون (دھ۔وَن) کا نغمہ بڑی خوبی سے گایا:

اس ہنستی گاتی دنیا میں ہے مرا کون سہارا میں آنکھ سے ٹپکا آنسو ہوں آکاش سے ٹوٹا تارا

میوزک ڈائریکٹر سی رام چندر کی چار فلمیں جاری ہوئیں۔ انہیں مقبول طرزیں بنانے میں مہارت حاصل تھی چنانچہ فلم نرالا میں دو نغمے بہت کامیاب ہوئے:

۱۔ ایسی محبت سے، ہم باز آئے جو دل کو ستائے، جلائے، رُلائے

۲۔ محفل میں جل اٹھی شمع پروانے کے لئے، پریت بنی ہے دنیا میں مرجانے کے لئے

فلم سمادھی میں ان کا چلتا ہوا نغمہ گلی کوچوں میں گایا گیا:

گورے گورے بانکے چھورے کبھی میری گلی آیا کرو

گوری گوری بانکی چھوری چاہے روز بلایا کرو

فلم سرگم میں انہوں نے فلم کے نام کی مناسبت سے کلاسیکی انداز اختیار کیا:

۱۔ جب دل کو ستائے غم تو چھیڑ سکھی سرگم

۲۔ وہ ہم سے چپ ہیں ہم ان سے چپ ہیں، منانے والے منا رہے ہیں

۳۔ کوئی کسی کا دیوانہ نہ بنے وہ تیر نظر کا نشانہ نہ بنے

سی رام چندر کی چوتھی فلم سنگرام کے گانے یوں ہی سے تھے۔ بھلا دیئے گئے۔

اسی پر سنہ ۵۰ء کا خاتمہ ہوا مگر یہاں اتنے سارے نغموں کی مثالیں دینے کا ایک مقصد تھا۔

یہ ہمارے نغمے کے سفر کا ایک منظر نامہ ہے۔ عوامی تھیٹر سے نکل کر، گراموفون ریکارڈ میں ڈھل کر، بولتی فلموں میں اپنا چولا بدل کر اور وقت کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے نغمے نے اپنے انداز بدل ڈالے۔ فلمیں نغموں کے بل بوتے پر کامیاب ہونے لگیں۔ فلم لگنے سے پہلے اس کے نغمے باہر آجاتے تھے اور وہ اگر کامیاب ہوتے تو فلم بھی کامیاب ہوتی ورنہ ان کا حشر سی رامچندر کی سنگرام جیسا ہوتا۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس دوران بڑے بڑے موسیقار اور خصوصاً نامور شاعر نغمہ سازی کے میدان میں داخل ہوئے اور ان گانوں کو ستھرے مصرعے اور نکھرے ہوئے شعر کی شکل میں معیار عطا کیا۔ گانوں کو بڑی عمر ملی اور ایک ہی نغمہ تین تین نسلوں نے نہ صرف سراہا بلکہ خود بھی گایا یا کم سے کم گنگنایا ضرور۔

ان شاعروں اور نغمہ نگاروں کو قریب سے دیکھنا اور ان کے ہنر کو نزدیک جا کر سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ نہیں تھا کہ انہوں نے مقبول نغمے لکھے بلکہ اُن کا اعجاز یہ تھا کہ انہوں نے میر تقی میر کے نظریے کے مطابق شعر کی زبان میں عوام سے گفتگو کی اور انہیں اشعار نہیں دیئے، شاعری کا شعور دیا۔

شاعری نظم ہے یعنی ضابطہ، قاعدے کی پابندی، اصولوں سے وابستگی اور حدود کے اندر رہتے ہوئے خود کو قیود سے آزاد کرانے کا نام۔

اب ہم اپنے نغمہ نگاروں کی ہنر مندی کا ذرا باریک بینی سے جائزہ لیں گے اور جن مصرعوں کو کبھی دھیان سے سنا، کبھی نہیں سنا، انہیں پوری توجہ سے پڑھیں گے اور دیکھیں گے کہ باتوں باتوں میں وہ اپنی بات کس خوبی سے کہہ گئے۔

آیئے آگے چلیں۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ

اِدھر فلموں میں آواز اور نغمے آئے، اُدھر اس صنعت میں گوجرانوالہ کے ایک جوان نے قدم رکھا۔ دینا ناتھ ۱۹۰۲ء میں اُس شہر میں پیدا ہوئے جو ن۔ م۔ راشد، میرا جی، راجا مہدی علی خاں اور عبدالحمید عدم جیسے شاعروں کا شہر ہے۔ یہی گوجرانوالہ کا علاقہ ہے جہاں سے ہیر رانجھا کے خالق وارث شاہ اٹھے تھے۔

لاہور میں فلم سازی زوروں پر تھی۔ دینا ناتھ، جو مدھوک کے نام سے مشہور ہوئے، فلم سازوں کے قافلے میں شریک ہو گئے۔ اس کارواں کے ساتھ وہ آگے بڑھتے گئے اور جب ہر ایک نے بمبئی کا رخ کیا تو انہوں نے بھی وہاں پہنچ کر صرف نغمے ہی نہیں بلکہ کہانیاں، مکالمے اور منظر نامے بھی لکھے اور کتنی ہی فلموں کی ہدایت کاری بھی کی۔ فلم کی موسیقی پر ان کا دوسرا بڑا احسان یہ تھا کہ وہ اس میدان میں نوشاد علی جیسے میوزک ڈائریکٹر کو لے کر آئے۔

دینا ناتھ یا ڈی این مدھوک کون تھے؟ اور کیسے تھے؟ آیئے نوشاد صاحب کی زبانی سنتے ہیں:

"مدھوک صاحب نے فلموں کے لئے لوک گیت لکھنے میں پہل کی اور یہ ہنر دوسرے لوگوں کو بتایا۔ اپنے گانوں میں بڑے اچھے ایکسپریشن لائے تھے۔ حالانکہ ان کا تعلق پنجاب سے تھا مگر پوربی بھاشا کا خوب خوب استعمال کیا۔ بہت سے گیتوں میں اچھی

اچھی باتیں کیں، مثلاً کل کے سپنے آج بھی آنا (نوشاد صاحب بھول گئے۔ فلم آدمی کے لئے یہ نغمہ شکیل بدایونی نے لکھا تھا اور یہ بول تقریباً تیس سال پہلے جوتیکا رائے نے گایا تھا) یا آج سپنے میں پیا گھر آئے یا جاؤ گے جانے نہ دوں گی۔ ان گیتوں میں بڑا اپنا پن لگتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ ہمارا ہے۔ مدھوک صاحب کو پوربی زبان سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہیں انہیں مشکل ہوتی تھی تو میں دبے لفظوں میں ٹھیک کرا دیتا تھا۔ وہ ہمارے گھر پر بیٹھ کر لکھتے تھے، گھر کیا تھا، بس رہنے کا ٹھکانا تھا۔ لکھتے وقت وہسکی ضرور پیتے تھے شام کو، میں سوڈا فراہم کر دیتا تھا مگر خود میں نے زندگی میں کبھی نہیں پی، یہ اللہ کا کرم ہے۔ تو وہ مجھے پیر صاحب کہتے تھے۔ ارے بھئی پیر جی کیسے ہو۔ مجھے بہت عزّت بخشی۔ فلم میں پہلا چانس مجھے دلایا۔ وہ نہ ہوتے تو مجھے چانس نہ ملتا۔ ۱۹۴۰ء میں فلم پریم نگر کی کہانی اور مکالمے لکھ رہے تھے۔ مجھے پروڈیوسر کے پاس لے گئے کہ اس سے میوزک کمپوز کرا لیجئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو بچّہ ہے۔ کہنے لگے کہ آپ اسے کام تو دیجئے اور میرے جو پیسے بنتے ہیں وہ ضمانت میں رکھ لیجئے۔ نقصان ہو تو اس میں سے کاٹ لیجئے گا۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ مدھوک صاحب نے ہمیشہ مجھے بیٹے کی طرح سمجھا۔ بڑے سخی انسان تھے۔ گھر سے باہر نکلتے تھے تو ضرورت مندوں کا مجمع لگا ہوتا تھا۔ جو کچھ پاس ہوتا تھا ان لوگوں کو دے دیتے تھے۔ ٹیکسی والوں سے ان کا کھاتا چلتا تھا۔ جب بھی انہیں پیسے ملتے، ڈرائیوروں کا قرض چکا دیتے تھے۔ جس نے جتنا مانگا دے دیا۔ کبھی حساب نہیں پوچھتے تھے۔ اپنے گیتوں کے بارے میں خود کہتے تھے کہ میں غزل کا شاعر نہیں ہوں، مجھے بھاؤ گیت پسند ہے۔ تعریف کرو تو کہتے تھے کہ سب خدا کی دین ہے۔

(نومبر ۱۹۹۸ء کے انٹرویو سے اقتباس)

مدھوک صاحب کے لوک گیتوں کی کچھ مثالیں:

- سیاں نے انگلی مروری رے، رام کسم شرما گئی میں (فلم: پروانہ)
- پنچھی رے کاہے ہوت اداس (سہگل، غیر فلمی)
- میرے منڈیر سے نہ بول ہما گا جا (فلم: پروانہ)
- مدھر مدھر گا رے منوا (فلم: بھگت سورداس)

-کس کی لگی جُلمی نجریا (فلم: ترانہ)
-جھوٹے ہیں سب سپن سہانے (فلم: رتن)
-بے ایمان تورے نینوا نندیا نہ آئے (فلم: ترانہ)
-اب راجا بھئے مورے بالم وہ دن بھول گئے (تان سین)
-آجا بالما رین اندھیری ڈر لاگے (فلم: پروانہ)
-انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا (فلم: رتن)

مدھوک صاحب کے جو نغمے غزل کے قریب پہنچے ان کی چند مثالیں:

-وہ ہم سے چُپ ہیں ہم ان سے چُپ ہیں دلوں کے ارماں مچل رہے ہیں (فلم: رسیا)
-تم نہیں آتے تو نہیں آؤ یاد سے کہہ دو وہ بھی نہ آئے (فلم: شاردا)
-شکوہ ترا میں گاؤں دل میں سمانے والے بھولے سے یاد کر لے او بھول جانے والے (فلم: انمول رتن)
-شبنم کیوں نیر بہائے دنیا سوئے اور یہ روئے جائے (فلم: اشارہ)
-پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا یوں ہم کو نہ دنیا سے بیزار کیا ہوتا (فلم: پردیسی)
-لو پھر یاد کسی کی آئی دل میں ایک درد سہانا آنکھ میں آنسو بھر لائی (فلم: شہر سے دور)
-خاموش نگاہیں یہ سناتی ہیں کہانی لو آج چلی ٹھوکریں کھانے کو جوانی (فلم: داسی)
-کاغذ کی تھی وہ ناؤ جس میں ہم جا رہے تھے وہ ریت تھی جہاں پر ہم گھر بنا رہے تھے (فلم: زبان)
-چلے جا رہے ہیں وہ نظریں چرائے ہمیں کچھ نہ کہنا جو ہم یاد آئے (فلم: گونج)
-ارمان تڑپتے ہیں پہلو میں میرے آ کے برباد ہو گئے ہیں اس گھر کو ہم بسا کے (فلم: زمیندار)
-اے درد ذرا دم لے کروٹ تو بدلنے دے ارمان بھرے دل کو پہلو میں سنبھلنے دے (فلم: زمانہ)
-آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا میرے لئے تو موت کا ہائے بہانہ ہو گیا (فلم: نمستے)

مدھوک صاحب اسّی برس جئے۔ ان میں سے تقریباً تیس سال فلم کی صنعت میں

گزارے اور بالآخر ۹ جولائی ۱۹۸۲ء کو حیدر آباد دکن میں وفات پائی۔

انہوں نے لاہور کی فلم زمیندار کے کچھ نغمے لکھے تھے۔ اس وقت ایک اور نوجوان ان کے قدم سے قدم ملا کر چلا: قمر جلال آبادی۔

اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے

جب وہ پیدا ہوئے تو اوم پرکاش تھے۔ یہ بات ۱۹۱۷ء کی ہے اور یہ واقعہ امرتسر کے چھوٹے سے قصبے جلال آباد کا ہے۔ ابھی دس برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اردو میں شعر موزوں کرنے لگے۔ اس پر لوگ لڑکے کا مذاق اڑاتے مگر کہیں سے گھومتا گھامتا کوئی صوفی شاعر جس کا نام امر تھا اس بستی میں آنکلا۔ اس نے اوم پرکاش کو پاس بٹھا کر اُس کے شعر سنے، شاباشی دی اور نیا نام دیا: قمر جلال آبادی۔

ہائی اسکول کی تعلیم پوری کر کے وہ لاہور گئے اور صحافی ہو گئے۔ اخباروں میں لکھتے لکھتے وہ سیٹھ پنچولی کے پاس جا پہنچے جو مشہور فلم زمیندار بنانے کے ارادے باندھ رہے تھے۔ فلم کے نغمے ناظم پانی پتی اور ڈی این مدھوک لکھ رہے تھے۔ قمر جلال آبادی بھی اس صف میں شامل ہو گئے اور انہوں نے بہزاد لکھنوی کی مدد سے اپنے وقت کا یادگار نغمہ لکھا

دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا
روتے ہیں تو ہنسنے کا پیغام نہیں ملتا

ادھر ماسٹر غلام حیدر کی بنائی ہوئی طرز اور شمشاد بیگم کی آواز میں یہ نغمہ گونج رہا تھا، ساتھ ہی بمبئی کی فلمی صنعت میں داخلے کا راستہ بھی کھول رہا تھا۔ ایک قمر جلال آبادی ہی نہیں، ماسٹر غلام حیدر اور شمشاد بیگم، سب ہی نے بمبئی کی راہ لی۔ ماسٹر صاحب اور شمشاد تو محبوب صاحب کی فلم ہمایوں کی تکمیل میں ہاتھ بٹانے لگے۔ قمر نے اس وسیع اور کشادہ میدان میں

خدا جھوٹ نہ بلوائے چالیس برس گزارے اور نغمے ہی نغمے لکھے۔

ان کے گیتوں میں میر تقی میر جیسے دکھ بہت تھے، اندر کا نہ جانے کون سا دکھ تھا جو مصرعوں کی آڑ میں مسلسل جھانکتا تھا اور شاید ہندوستانی موسیقی میں جس تاثیر کی شہرت ہے، وہ کرب اور رنج ہی کی دین ہے۔ اُن کے نغموں پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ روایتی اور کلاسیکی شاعری کا دامن انہوں نے بس کبھی کبھار ہی چھوڑا۔ یہ سلسلہ کچھ یوں ہے:

-امید تڑپتی ہے روتی ہیں تمنّائیں
دنیا کا اشارہ ہے دنیا سے چلے جائیں
جب اشک مچلتا ہے، اک درد سا اٹھتا ہے
تم آنکھ کو سمجھاؤ ہم درد کو سمجھائیں (فلم: پگلی، ۱۹۴۳ء)

-دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی
آشاؤں کی کلیوں کو کھلنے ہی نہیں دیتی (فلم: چاند، ۱۹۴۴ء)

-میرے حال پر بے بسی رو رہی ہے
زہے زندگی، زندگی رو رہی ہے
عجب حال میں ہے میری زندگانی
کہ غم ہنس رہا ہے، خوشی رو رہی ہے (فلم: زمیندار، ۱۹۴۲ء)

-آجا تجھے افسانہ جدائی کا سنائیں
جو دل پہ گزرتی ہے وہ آنکھوں سے بتائیں (فلم: مرزا صاحباں، ۱۹۴۷ء)

-کیا یہی تیرا پیار تھا مجھ کو تو انتظار تھا
دینی تھی گر جدائی کیوں آنکھ تھی ملائی
ہوں گے جدا نہ ہم کبھی مجھ کو تو اعتبار تھا (فلم: مرزا صاحباں، ۱۹۴۷ء)

-کوئی روکے اُسے اور یہ کہہ دے کچھ اپنی نشانی دیتا جا
گر یہ بھی تجھے منظور نہیں تو یاد بھی اپنی لیتا جا (فلم: سیندور، ۱۹۴۷ء)

-او روٹھے ہوئے بھگوان تم کو کیسے مناؤں (فلم: سیندور، ۱۹۴۷ء)

-بدنام نہ ہو جائے محبت کا فسانہ　　اے درد بھرے آنسوؤں آنکھوں میں نہ آنا
کہہ دے نہ کہیں آنکھ میرے دل کی کہانی　　اے دل تیری دھڑکن کہیں سن لے نہ زمانہ
اے درد بھرے آنسوؤں آنکھوں میں نہ آنا　　(فلم: شہید، ۱۹۴۸ء)

-اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے　　کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا
بہتے ہوئے آنسو رک نہ سکے　　کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا　　(فلم: پیار کی جیت، ۱۹۴۸ء)

-او دور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا
راتیں ہوئیں اندھیری تم چاند بن کے آنا　　(فلم: پیار کی جیت، ۱۹۴۸ء)

-اپنی نظر سے دور وہ ان کی نظر سے دور ہم
تم ہی بتاؤ کیا کریں، مجبور تم مجبور ہم
ساتھی نہیں کوئی میرا اور کوئی راز داں نہیں
ایسا لٹا ہے قافلہ قدموں کا بھی نشاں نہیں
اتنا ہی یاد ہے ہمیں لٹ گئے بے قصور ہم　　(فلم: بازار، ۱۹۴۹ء)

-لٹ گیا دن رات کا آرام کیوں　　اے محبت تیرا یہ انجام کیوں
ہم نے مانگی تھی محبت کی شراب　　لائی قسمت آنسوؤں کا جام کیوں
دل سمجھتا ہے کہ تو ہے بے وفا　　آ رہا ہے لب پہ تیرا نام کیوں　　(فلم: لیکھ، ۱۹۴۹ء)

-تم مجھ کو بھول جاؤ　　اب ہم نہ مل سکیں گے
ڈالی سے پھول ٹوٹے　　اب کیسے کھل سکیں گے
شہنائیاں بجیں گی　　اور دلہنیں سجیں گی
ہاتھوں میں مل کے مہندی　　ساجن کے گھر چلیں گی
ہم دیکھتے رہیں گے　　رو رو کے یہ کہیں گے
تم مجھ کو بھول جاؤ　　اب ہم نہ مل سکیں گے　　(فلم: بڑی بہن، ۱۹۴۹ء)

-وہ پاس رہیں یا دور رہیں　　نظروں میں سمائے رہتے ہیں
اتنا تو بتا دے کوئی ہمیں　　کیا پیار اسی کو کہتے ہیں　　(فلم: بڑی بہن، ۱۹۴۹ء)

-راہی متوالے تو چھیڑ اک بار من کا ستار
جانے کب چوری چوری آئی ہے بہار چھیڑ من کا ستار (فلم: وارث، ۱۹۵۴ء)
-اک پردیسی میرا دل لے گیا جاتے جاتے میٹھا میٹھا غم دے گیا
کون پردیسی تیرا دل لے گیا موٹی موٹی انکھیوں میں آنسو دے گیا (فلم: پھاگن، ۱۹۵۸ء)
-دن ہے سہانا آج پہلی تاریخ ہے خوش ہے زمانہ آج پہلی تاریخ ہے (فلم: پہلی تاریخ، ۱۹۵۴ء)

یہ آخری گانا جسے کشور کمار نے گایا تھا، ریڈیو سیلون سے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ضرور نشر ہوتا تھا اور سننے والے اس کا انتظار کیا کرتے تھے۔

قمر صاحب کو اپنا لکھا ہوا نغمہ 'اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا' بہت پسند تھا۔ رفیع کی آواز میں یہ گانا یوں بھی بہت مقبول ہوا تھا مگر لاہور کے ایک مزاحیہ فلمی رسالے کے ایڈیٹر نے جن کا نام غالباً جنگلی یا وحشی تھا، اپنے سرورق پر اس گانے کے تعلق سے ایک گدھے کا کارٹون بنایا جس پر ایک نامراد عاشق بیٹھا گا رہا تھا اور گدھا اپنے پیچھے اپنے آثار یوں چھوڑتا جا رہا تھا کہ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

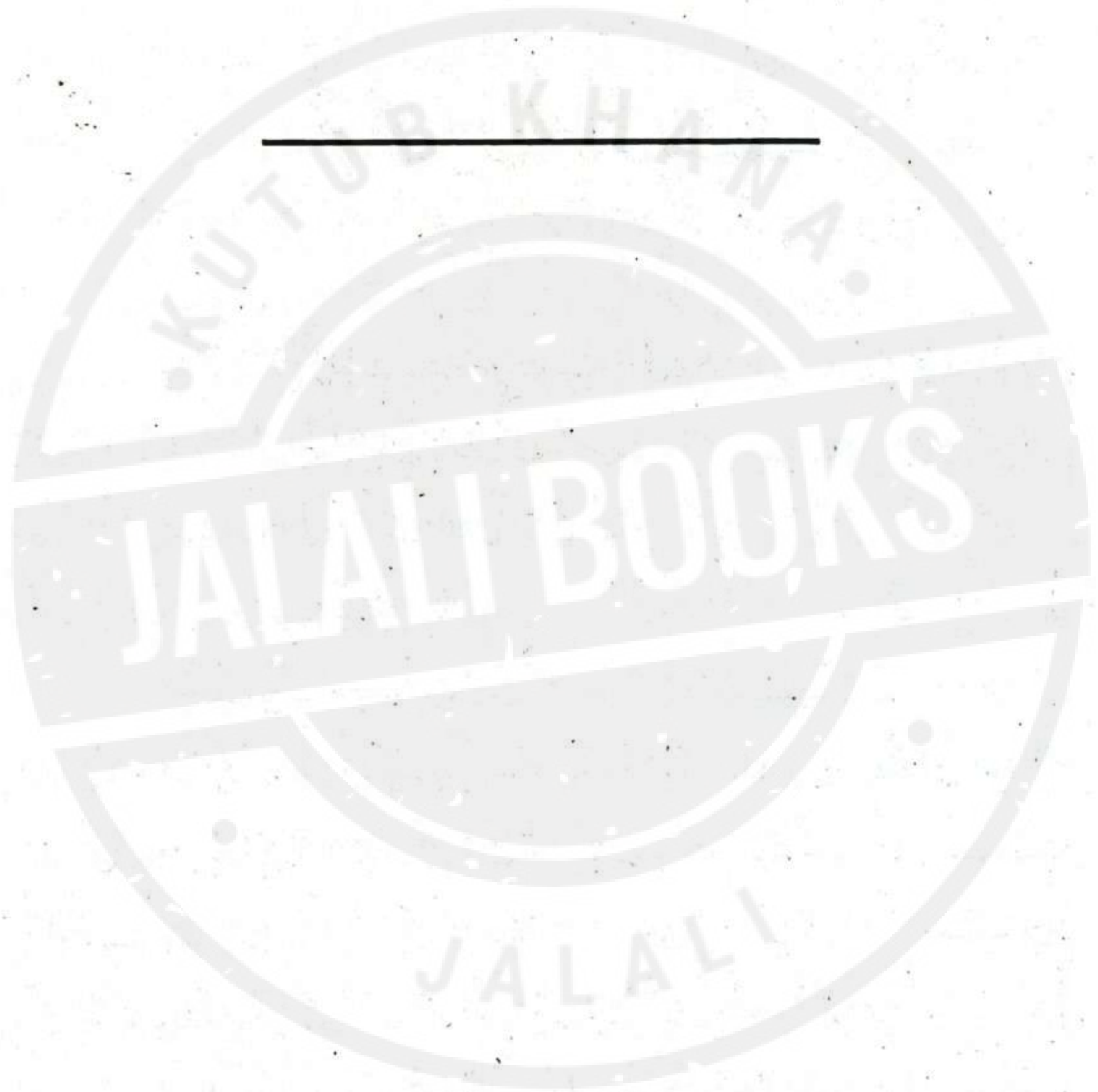
اس بدذوقی کی بھی بہت دھوم مچی تھی۔

قمر جلال آبادی نے تقریباً چالیس برسوں میں ہر طرح کے نغمے لکھے، رنجیدہ، سنجیدہ، گھمبیر، غیر سنجیدہ، شوخ اور چنچل۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے فلم ہاوڑا برج کو کچھ یادگار گیت دیئے مثلاً گیتا دت کی آواز میں 'میرا نام چن چن چو' اور آشا بھونسلے کا گایا ہوا نغمہ 'آیئے مہرباں بیٹھئے جانِ جاں، لیجئے شوق سے پھر، عشق کے امتحاں'۔ یہ گانا اپنے وقت کی بڑی حسینہ مدھو بالا پر فلمایا گیا تھا۔ Youtube پر دیکھا جا سکتا ہے۔ گانا سننے کے قابل اور مدھو بالا کے ہونٹوں کی حرکت دیکھنے کے قابل ہے۔

قمر صاحب کی بیٹی سبھا شینی شیو پوری نے باپ کی یاد میں ویب سائٹ قائم کی ہے جس میں ان کی نجی زندگی کا احوال بہت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے

کچھ تو ہے بات جو آئی ہے قضا رک رک کے
زندگی قرض ہے، قسطوں میں ادا ہوتی ہے

قمر جلال آبادی چوراسی سال جیے۔ زندگی کی آخری قسط انہوں نے ۹ جنوری ۲۰۰۳ء کو ادا کی۔



تم مجھے یوں بُھلا نہ پاؤ گے

یہ اکتوبر ۹۳ء کی بات ہے، حسرت جے پوری برطانیہ آئے ہوئے تھے اور شہر لیڈز میں ان کے اعزاز میں شام منائی جا رہی تھی۔ حسرت صاحب نے دیر تک اپنا غیر فلمی کلام سنایا۔ لوگوں نے دل کھول کر انہیں داد دی مگر ان کے ایک شعر پر پوری محفل پھڑک اُٹھی ؎

عشق گر دونوں طرف ہو تو مزا دیتا ہے   عشق گر ایک طرف ہو تو سزا دیتا ہے

مطلب یہ کہ حسرت جے پوری فلم کے گانوں کے لئے بنے تھے۔ ان کا مزاج اور ان کا انداز فلم کو خوب راس آیا۔ کہا کرتے تھے کہ شاعری خدا کی دین ہے مگر ان کا یہ ہنر فلم تک ہی محدود رہا۔ اپنی ۷۷ برس کی زندگی میں انہوں نے ساڑھے تین سو فلموں کے لئے دو ہزار گانے لکھے۔ اُن کے کئی شعری مجموعے اردو اور ہندی زبانوں میں شائع ہوئے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ دونوں زبانیں آپس میں ایسی بہنیں ہیں جنہیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔

بہت کچھ کہا کرتے تھے۔ میں نے ان کے کئی انٹرویو پڑھے، ریڈیو پر سنے اور ٹیلیویژن پر دیکھے۔ اپنے پہلے عشق کا قصہ اکثر سنایا کرتے تھے۔ راجستھان کے شہر جے پور میں پیدا ہوئے اور وہیں مسلم اسکول میں تعلیم پائی اور اپنے دادا فدا حسین سے اردو اور فارسی پڑھی۔ اب یہ پتہ نہیں کہ پہلے عشق کیا یا شعر لکھا لیکن محلّے کی لڑکی رادھا سے دل لگا بیٹھے اور اس کے نام ایک منظوم خط لکھا ؎

یہ میرا پریم پتر پڑھ کر کہ تم ناراض نہ ہونا
کہ تم میری زندگی ہو، کہ تم میری بندگی ہو

یہ خط شاید لڑکی کو نہ جا سکا لیکن بعد میں (۱۹۶۴ء) راج کپور کی فلم سنگم کے ذریعے دنیا بھر کو پہنچ گیا۔

حسرت جے پوری، جن کا گھر کا نام اقبال حسین تھا راج کپور سے بہت قریب رہے۔ وہ بھی یوں کہ جے پور چھوڑ کر بمبئی جا پہنچے اور بس کنڈکٹر ہو گئے جہاں انہیں ہر مہینے گیارہ روپے ملتے تھے۔ ان کی بس بھی چلتی رہی اور شاعری بھی یہاں تک کہ بمبئی کے مشاعروں میں بلائے جانے لگے۔ وہیں کسی مشاعرے میں راج کپور کے والد پرتھوی راج نے انہیں سنا۔ ان دنوں راج کپور اپنی موسیقی سے آراستہ فلم برسات بنانے کی تیاری کر رہے تھے (۱۹۵۰ء)۔ نئے نئے میوزک ڈائریکٹر شنکر اور جے کشن طرزیں بنا رہے تھے۔ حسرت صاحب کو راج کپور سے ملوایا گیا جس کے فوراً بعد ان کا لکھا ہوا پہلا نغمہ ریکارڈ ہوا ؎

جیا بے قرار ہے، چھائی بہار ہے   آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے

اور ساتھ ہی راج کپور نے پیرس میں کسی گداگر کو وائلن بجاتے ہوئے ایک طرز سنی تھی، اُسی کو راگ میں ڈھال کر دُھن بنائی گئی، جس پر حسرت نے لفظ بٹھائے ؎

ع   چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے

پورے بیس سال تک وہ راج کپور کی اور میوزک ڈائریکٹر شنکر جے کشن اور کئی دوسرے موسیقاروں کی فلموں کے لئے گانے لکھتے رہے اور اُن کے گیت مقبولیت کی بلندیوں کو چھوتے گئے۔ اُن فلموں میں برسات، پتیتا، آوارہ، انارکلی، آہ، بوٹ پالش، جھنک جھنک پائل باجے، طوفان اور دیا، چوری چوری، بسنت بہار، ہاوڑا برج، دل اپنا پریت پرائی، دل ایک مندر، ہمراہی اور میرا نام جوکر، جیسے نام آتے ہیں اور اب کچھ ایسے بول جو کہاں کہاں نہیں گنگنائے گئے ہوں گے:

- گنگناتے ہوئے گاتے ہوئے آجاتے ہیں   روح کو خواب سے یوں بھی وہ جگا جاتے ہیں
بھول جاتا ہوں تو یاد آتے ہیں وہ رہ رہ کر   نیند آتی ہے تو وہ آ کے جگا جاتے ہیں

خود وہ آئیں کہ نہ آئیں مگر اے بیتابی   یہ بھی کیا کم ہے کہ وہ یاد تو آ جاتے ہیں
وہی ہم ہیں، وہی تو ہے، وہی باتیں ہیں تری   ہم تری بزم سے جاتے ہیں تو کیا جاتے ہیں
(طلعت محمود۔ غیر فلمی غزل)

-ہم تجھ سے محبت کر کے صنم روتے بھی رہے، ہنستے بھی رہے
خوش ہو کے سہے الفت کے ستم روتے بھی رہے، ہنستے بھی رہے   (فلم: آوارہ، ۱۹۵۱ء)
-ہم درد کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے   پینے کو شراب غم، دل غم کا نشانہ ہے (فلم: داغ، ۱۹۵۲ء)
-چاند اک بیوہ کی چوڑی کی طرح ٹوٹا ہوا   ہر ستارہ بے سہارا سوچ میں ڈوبا ہوا
غم کے بادل اک جنازے کی طرح ٹھہرے ہوئے   سسکیوں کے ساز پر کہتا ہے دل روتا ہوا
کوئی نہیں میرا اس دنیا میں آشیاں برباد ہے   آنسو بھری مجھے قسمت ملی ہے زندگی ناشاد ہے
(فلم: داغ، ۱۹۵۲ء)
-یاد کیا دل نے کہاں ہو تم   جھومتی بہار ہے جہاں ہو تم   (فلم: پتیتا، ۱۹۵۳ء)
-زندگی بے بس ہوئی ہے   بے کسی کا ساتھ ہے
ایک ہم ہیں اس قفس میں   یا خدا کی ذات ہے
او آسمان والے   شکوہ ہے زندگی کا   (فلم: انارکلی، ۱۹۵۳ء)
-آ نیل گگن تلے پیار ہم کریں   ہِل مِل کے پیار کا اقرار ہم کریں (فلم: بادشاہ، ۱۹۵۴ء)
-آئے بہار بن کے لبھا کر چلے گئے   کیا راز تھا جو دل میں چھپا کر چلے گئے
(فلم: راج ہٹ، ۱۹۵۶ء)
-آنسو بھری ہیں یہ جیون کی راہیں   کوئی اُن سے کہہ دے ہمیں بھول جائیں
(فلم: پرورش، ۱۹۵۸ء)
-تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے، چشم بددور (فلم: سسرال، ۱۹۶۱ء)
-تیری زلفوں سے جدائی تو نہیں مانگی تھی   قید مانگی تھی رہائی تو نہیں مانگی تھی
(جب پیار کسی سے ہوتا ہے، ۱۹۶۱ء)
-ابتدائے عشق میں ہم ساری رات جاگے   اللہ جانے کیا ہوگا آگے

(فلم: ہریالی اور راستہ، ۱۹۶۲ء)

-ہم تیرے پیار میں سارا عالم کھو بیٹھے   تم کہتے ہو کہ ایسے پیار کو بھول جاؤ
(فلم: دل ایک مندر، ۱۹۶۳ء)

-بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے   ہوا ؤ راگنی گاؤ میرا محبوب آیا ہے
(فلم: سورج، ۱۹۶۶ء)

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں جب حسرت جے پوری انگلستان آئے تھے، ایک ملاقات میں بتا رہے تھے کہ نغمہ 'بہارو پھول برساؤ' لکھتے ہوئے اُن کے ذہن میں شب معراج کا تصور تھا۔

اس کے بعد وہ چھ برس زندہ رہے اور آخر دم تک نغمے لکھتے رہے اور ایک شعری مجموعہ تیار کرتے رہے۔ جاتے جاتے مدّاحوں کے لئے یہ نغمہ چھوڑ گئے۔

تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے   جب کبھی بھی سنو گے گیت میرے
سنگ سنگ تم بھی گنگناؤ گے   (فلم: پگلا کہیں کا، محمد رفیع، ۱۹۷۰ء)

خدا کے پاس جانا ہے

یہ قصّہ بھی فلم برسات سے شروع ہوتا ہے۔ اس فلم نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، دو نغمہ نگاروں پر شہرت کی برسات برسائی۔ حسرت جے پوری کی طرح شیلندر کو بھی گانے لکھنے کی پہلی دعوت ملی۔ وہ ٹھہرے سدا کے انقلابی اور تحریک آزادی میں لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے والے شاعر، فلموں کے لئے گانے لکھتے تو اُن کی انا کو ٹھیس لگتی۔ صاف انکار کر کے گھر آ گئے جہاں حال ہی میں پیدا ہونے والا بچہ بیمار پڑا تھا اور جیبیں خالی تھی، واپس گئے اور ہاں کر دی۔

ہاتھ بھی یوں لگے کہ بمبئی کے کسی جلسے میں اپنی نظم پڑھ رہے تھے: 'جلتا ہے پنجاب'۔ راج کپور کو ان کی فطرت میں چھپا ہوا رومانس اتنا پسند آیا کہ برسات کے گانے لکھنے کی پیشکش کر دی۔ رضامند ہونے کے بعد شیلندر نے پانچ سو روپے کے عوض دو گانے لکھے۔ 'برسات میں ہم سے ملے تم سجن تم سے ملے ہم' اور دوسرا گانا جس کا ایک شعر غیر سنجیدہ ہوتا تھا اور دوسرا رنجیدہ 'پتلی کمر ہے ترچھی نظر ہے'۔ یہ بات ۱۹۴۹ء کی ہے۔

اس فلم کی بدولت حسرت جے پوری، شیلندر اور میوزک ڈائریکٹر شنکر جے کشن بہت اچھی ٹیم بن گئے۔ اُن دنوں میوزک ڈائریکٹر ہی پروڈیوسر سے بات کر کے اپنی پسند کے نغمہ نگار کی سفارش کیا کرتے تھے۔ شنکر جے کشن نے شیلندر سے وعدہ کیا کہ وہ جگہ جگہ ان کے نام کی سفارش کریں گے۔ شاید فلمی وعدہ تھا، وہ بھول بھال گئے۔ اس پر شیلندر نے

انہیں ایک پرچے پر لکھ کر بھیجا۔ 'چھوٹی سی یہ دنیا، پہچانے راستے ہیں، کہیں تو ملو گے، کبھی تو ملو گے، تو پوچھیں گے حال'۔ شنکر اور جے کشن سمجھ گئے، معافی مانگی اور پھر تو ہمارا انقلابی شاعر نغموں پر نغمے تخلیق کرنے لگا۔

یہ سلسلہ کوئی پندرہ برس چلا۔ اُس مرحلے پر شیلندر نے اپنی کل پونجی لگا کر فلم تیسری قسم بنائی جو بدقسمتی سے ناکام ہوگئی۔ شیلندر وہ صدمہ برداشت نہ کر پائے اور صرف ۴۳ برس کی عمر میں چل بسے۔

شیلندر غزل کے شاعر نہیں تھے مگر شاعر کی حساس طبیعت پائی تھی۔ ان کے نغموں میں ان کے خواب بھی اور خواب پورے نہ ہونے کی حسرت بھی تھی۔ ان میں مایوسی نہیں تھی مگر وہ انقلاب بھی نہ تھا جس کی خاطر انہوں نے جیلیں کاٹی تھیں۔

برسات کے بعد انہوں نے جو نغمے لکھے ان کی چند مثالیں:

- آوارہ ہوں، یا گردش میں ہوں آسمان کا تارا ہوں (فلم: آوارہ، ۱۹۵۱ء)
- اے میرے دل کہیں اور چل غم کی دنیا سے دل بھر گیا (فلم: داغ، ۱۹۵۲ء)
- ہیں سب سے مدھر وہ گیت جنہیں، ہم درد کے سُر میں گاتے ہیں (فلم: پتیتا، ۱۹۵۳ء)
- اندھے جہان کے اندھے راستے جائیں تو جائیں کہاں (فلم: پتیتا، ۱۹۵۳ء)
- یہ شام کی تنہائیاں ایسے میں تیرا غم
پتے کہیں کھڑکے، ہوا آئی تو چونکے ہم (فلم: آہ، ۱۹۵۳ء)
- میرا جوتا ہے جاپانی، یہ پتلون انگلستانی، سر پہ لال ٹوپی روسی، پھر بھی دل ہے ہندوستانی (فلم: شری ۴۲۰، ۱۹۵۵ء)
- زندگی خواب ہے، خواب میں جھوٹ کیا اور بھلا سچ ہے کیا (فلم: جاگتے رہو، ۱۹۵٦ء)
- آجا کہ انتظار میں جانے کو ہے بہار بھی
تیرے بغیر زندگی درد بن کے رہ گئی (فلم: ہلاکو، ۱۹۵٦ء)
- رات نے کیا کیا خواب دکھائے رنگ بھرے سو جال بچھائے
آنکھیں کھلیں تو سپنے ٹوٹے رہ گئے غم کے کالے سائے (ایک گاؤں کی کہانی، ۱۹۵۷ء)

-ٹوٹے ہوئے خوابوں نے ہم کو یہ سکھایا ہے
دل نے جسے پایا تھا، آنکھوں نے گنوایا ہے (فلم: مدھومتی، ۱۹۵۸ء)
-مجھ کو یارو معاف کرنا میں نشے میں ہوں
اب تو ممکن ہے بہکنا، میں نشے میں ہوں (فلم: میں نشے میں ہوں، ۱۹۵۹ء)
-کسی کی مسکراہٹوں پہ ہو نثار کسی کا درد مل سکے تو لے ادھار
کسی کے واسطے ہو تیرے دل میں پیار جینا اسی کا نام ہے (فلم: اناڑی، ۱۹۵۹ء)
-او سجنا، برکھا بہار آئی، رس کی پھوہار لائی، انکھیوں میں پیار لائی (فلم: پرکھ، ۱۹۶۰ء)
-عجیب داستاں ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم
یہ منزلیں ہیں کون سی، نہ تم سمجھ سکے نہ ہم (فلم: دل اپنا پریت پرائی، ۱۹۶۰ء)
-چھوٹی سی یہ دنیا پہچانے راستے ہیں، کہیں تو ملو گے تو پوچھیں گے حال (فلم: رنگولی، ۱۹۶۲ء)
-یاد نہ جائے بیتے دنوں کی، جا کے نہ آئے جو دن دل کیوں بُلائے انہیں
(فلم: دل ایک مندر، ۱۹۶۳ء)
-پوچھو نہ کیسے میں نے رین بتائی (فلم: میری صورت تیری آنکھیں، ۱۹۶۳ء)
-وہاں کون ہے تیرا، مسافر جائے گا کہاں (فلم: گائیڈ ۱۹۶۵ء)
-دوست دوست نہ رہا، یار یار نہ رہا، زندگی ہمیں تیرا اعتبار نہ رہا (فلم: سنگم، ۱۹۶۴ء)
-سجن رے جھوٹ مت بولو، خدا کے پاس جانا ہے (فلم: تیسری قسم، ۱۹۶۶ء)
-رات اور دن دیا جلے، میرے من میں پھر بھی اندھیارا ہے (فلم: رات اور دن، ۱۹۶۷ء)

شیلندر کے گانوں کو سب سے زیادہ شہرت ریڈیو سیلون سے ملی۔ جن دنوں ان کی شاعری عروج پر تھی ان ہی دنوں ریڈیو سیلون بھی گھر گھر سنا جا رہا تھا۔ کشور کمار کی آواز میں ان کے لکھے ہوئے کئی نغمے صبح شام نشر ہوتے تھے مثلاً:

-ایک چھوٹی سی نوکری کا طلب گار ہوں میں تم سے کچھ اور جو مانگوں تو گنہ گار ہوں میں
-چھوٹا سا گھر ہو گا بادلوں کی چھاؤں میں آشا دیوانی من میں بنسری بجائے

مگر شیلندر کا جو نغمہ میرے دل پر آج تک نقش ہے وہ انہوں نے سنہ ۵۶ء میں لکھا

ہوگا، اُس وقت اُن کا پہلا بیٹا جس نے انہیں نغمے لکھنے پر مجبور کیا، چھ سات برس کا ہوگا۔ یہ نغمہ کشور کمار نے فلم مسافر میں گایا تھا اور اس کی طرز سلیل چوہدری نے بنائی تھی جنہیں میوزک ڈائریکٹروں کا میوزک ڈائریکٹر کہا جاتا تھا۔ پڑھیے

منّا بڑا پیارا امی کا دلارا کوئی کہے چاند کوئی آنکھ کا تارا
ہنسے تو بھلا لگے روئے تو بھلا لگے کہیں بھی اُس کے بنا امّی کا دل نہ لگے
جیو میرے لعل تم کو لگے میری عمر جیو میرے لعل
اک دن وہ ماں سے بولا کیوں پھونکتی ہے چولہا
کیوں نہ روٹیوں کا پیڑ ہم لگائیں روٹی توڑیں، آم توڑیں، روٹی آم کھائیں
کاہے کرے روز روز تو یہ جھمیلا
امّی کو آئی ہنسی ہنس کے وہ کہنے لگی لعل محنت کے بنا روٹی کس گھر میں پکی
جیو میرے لعل تم کو لگے میری عمر جیو میرے لعل
ایک دن جو چھپا منّا ڈھونڈے نہ ملا منّا
کرسیوں کے پیچھے بستروں کے نیچے
دیکھا کونا کونا سب نے سانس کھینچے
کہاں گیا، کیسے گیا سب تھے پریشان
سارا جگ ڈھونڈ تھکا کہیں منّا نہ ملا
مِلا تو پیار بھری ماں کی آنکھوں میں ملا
جیو میرے لعل تم کو لگے میری عمر جیو میرے لعل

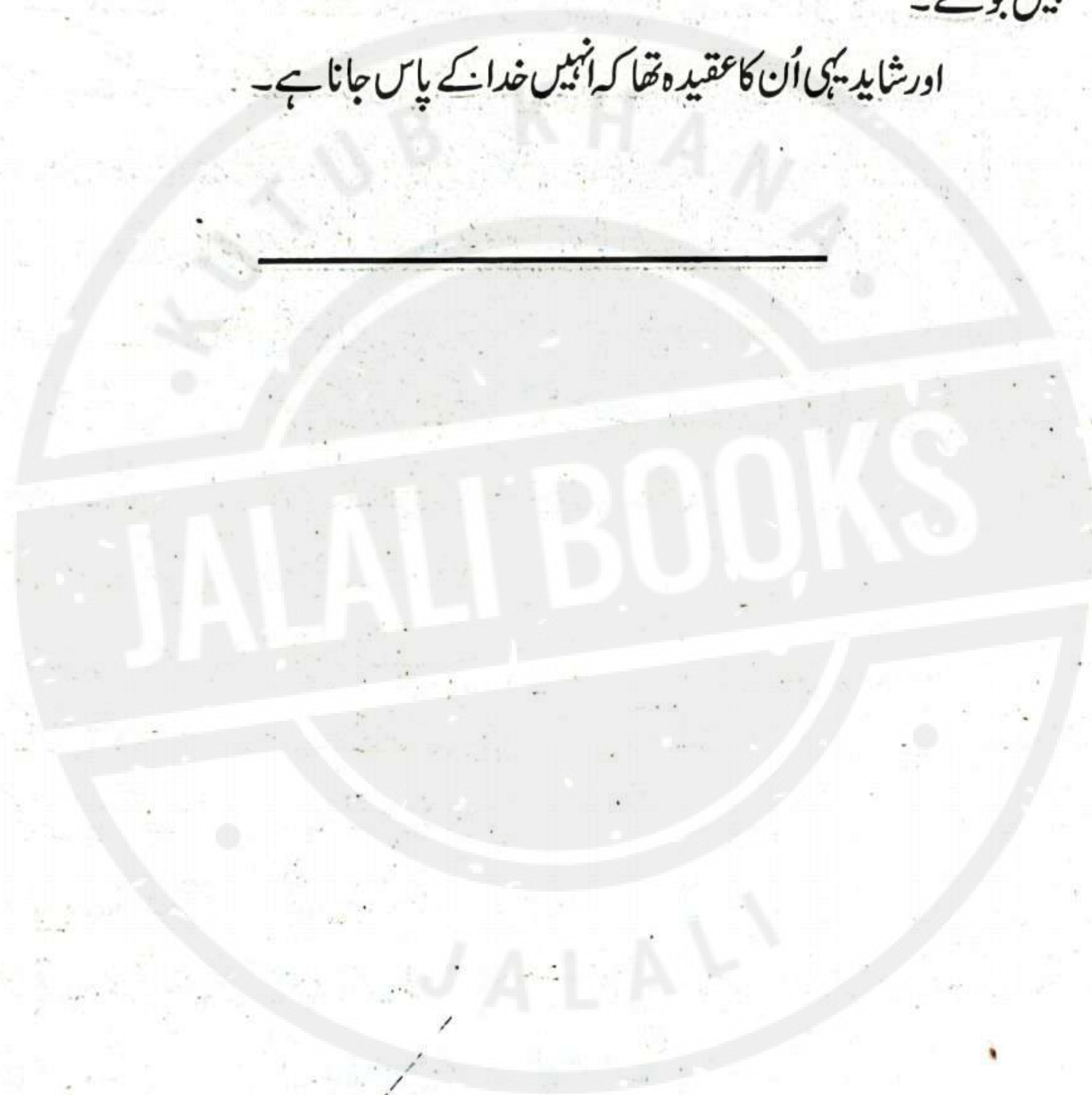
شاید ایسی ہی دعاؤں کا اثر ہے کہ اب شیلندر کا بیٹا شیلی نغمے لکھتا ہے حالانکہ وہ باپ جیسی بات کہاں۔

شیلندر کی بات اُن کے لکھے ہوئے فلم پتیتا (۵۳ء) کے ایک نغمے پر ختم کرتا ہوں جسے لتا منگیشکر نے گایا تھا اور جس کا آخری مصرعہ ۵۵ برس ہونے کو آرہے ہیں، میرے ذہن کے کسی گوشے میں ستارا بن کے چمک رہا ہے

اندھیرے گھر میں کسی نے ہنس کر چراغ جیسے جلا دیا کسی نے اپنا بنا کے مجھ کو مسکرانا سکھا دیا
کوئی ستارے لٹا رہا تھا، کسی نے دامن بچھا دیا وہ رنگ بھرتے ہیں زندگی میں بدل رہا ہے میرا جہاں

شیلندر کے بولوں میں صداقت بہت تھی، ان کا شاعرانہ مبالغہ بھی سچ لگتا تھا ان کے شعر زندگی کی سچائیوں کا آئینہ سے تھے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے نغموں میں وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے۔

اور شاید یہی اُن کا عقیدہ تھا کہ انہیں خدا کے پاس جانا ہے۔



اتنا نہ مجھ سے تو پیار بڑھا

جلال پور جٹاں کا نام ہم سب نے سنا ہے۔ نام سنا ہے تو شہر گجرات کے قریب واقع یہ قصبہ مشہور بھی ہو گا۔ مگر کیوں مشہور ہے کم سے کم مجھے تو معلوم نہیں، البتہ اس کی شہرت کی ایک وجہ جو شاید کسی کو پتہ نہیں، مجھے معلوم ہے۔

برصغیر کے سب سے بڑے نغمہ نگاروں میں سے ایک راجندر کرشن جلال پور جٹاں میں پیدا ہوئے تھے۔ بیسویں صدی شروع ہوئے انیّس برس گزر چکے تھے جب دگّل گھرانے میں ان کی ولادت ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی تعلیم پاکستان کے شہر گجرات میں ہوئی ہو گی جہاں ان کے اندر شاعری کے دیئے کی لَو اونچی ہوئی۔

ملازمت کی تلاش میں وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس شملہ چلے گئے اور بائیس سال کی عمر تک کلر کی کرتے رہے اور شعر گوئی کے مقابلوں میں حصّہ لیتے رہے۔ برصغیر کی آزادی سے ذرا پہلے وہ بمبئی جا پہنچے اور جاتے ہی فلم کی دنیا میں اپنی بستی بسا لی۔ ایک دو ناکام فلموں کی کہانی اور گانے لکھنے کے بعد تاریخ کے دو بڑے واقعات نے ساری ہی بستیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے۔

گاندھی جی کے قتل کے بعد ان کا لکھا ہوا نغمہ چہار جانب گونجا

سنو سنو اے دنیا والو　　　باپو کی یہ امر کہانی

اِس گانے سے راجندر کرشن کو کم اور گلوکار محمد رفیع کو زیادہ شہرت ملی۔ اس کی طرز

بنانے والے دو بھائیوں حُسن لال اور بھگت رام کو بھی کم ہی لوگوں نے جانا لیکن اُسی برس ۱۹۴۹ء میں برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر فلم لاہور بنی جس کے نغمے راجندر کرشن نے لکھے جن میں ان کے اعلیٰ شعری ذوق کا بھرپور اظہار تھا۔ اوّل تو لتا اور کرن دیوان کی آواز میں یہ نغمہ ۔

دنیا ہمارے پیار کی یوں ہی جواں رہے
میں بھی وہیں رہوں میرا ساجن جہاں رہے

دوسرے اس سے بھی زیادہ دلکش یہ غزل ۔

بہاریں پھر بھی آئیں گی، مگر ہم تم جدا ہوں گے
گھٹائیں پھر بھی چھائیں گی، مگر ہم تم جدا ہوں گے
جہاں چھپ چھپ کے ہم ملتے تھے ساجن وہ گلی ہم کو
اشاروں سے بلائے گی مگر ہم تم جدا ہوں گے

لتا منگیشکر کے لئے اس پُراثر نغمے کی اتنی ہی تاثیر لئے ہوئے طرز بہت بڑے موسیقار شیام سندر نے بنائی تھی۔

اُسی برس راجندر کرشن نے فلم بڑی بہن کے نغمے لکھ کر مقبول عام موسیقی کو نیا رخ دے دیا۔ حُسن لال بھگت رام کی کمپوز کی ہوئی یہ طرزیں گلی گلی گنگنائی گئیں اور سچ تو یہ ہے کہ نوعمر لتا منگیشکر کی شہرت کی پہل اسی فلم کے اس نغمے سے ہوئی ۔

چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے
پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے

بڑی بہن کے گانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا ضروری ہے:

- بگڑی بنانے والے بگڑی بنا دے نیّا ہماری پار لگا دے (ثریا)
- لکھنے والے نے لکھ دی میری تقدیر میں بربادی (ثریا)
- وہ پاس رہیں یا دور رہیں نظروں میں سمائے رہتے ہیں (ثریا)
- محبت کے دھوکے میں کوئی نہ آئے (رفیع)

-تم مجھ کو بھول جاؤ اب ہم نہ مل سکیں گے
ڈالی سے پھول ٹوٹے اب کیسے کھل سکیں گے
شہنائیاں بجیں گی اور دلہنیں سجیں گی
ہاتھوں میں مل کے مہندی ساجن کے گھر چلیں گی
ہم دیکھتے رہیں گے رو رو کے یہ کہیں گے
تم مجھ کو بھول جاؤ اب ہم نہ مل سکیں گے

اِس آخری مصرعے کو اُس نغمے سے ملا کر پڑھا جائے جس میں کہا گیا ہے کہ " مگر ہم تم جدا ہوں گے " تو شاعر کے اندر چھپے ہوئے کرب کا اندازہ ہوتا ہے۔ راجندر کرشن کو چار اعلیٰ ترین نغمہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ انہوں نے شاعری کی اعلیٰ قدروں کو عوام کے لئے لکھی جانے والی فلمی شاعری میں بڑی خوبی سے برتا۔ انہوں نے روایتی نازک خیالی سے لے کر اپنے دور کے انقلابی جذبے کا اثر بھی قبول کیا اور اپنی بات بڑے سلیقے سے نغموں میں ڈھال دی۔

راجندر کرشن نے جلال پور جٹاں سے بمبئی تک کا سفر کچھ آسانی سے طے نہیں کیا ہوگا۔ ان کی شاعری میں راہ کے سارے دشوار مرحلے اور نوعمری کا سارا رومانس بیک وقت کرب اور خواب بُنتا نظر آتا ہے۔

انہیں گھڑ دوڑ کا بہت شوق تھا۔ کہتے ہیں کہ گانا لکھنے کے لئے انہیں اگر پندرہ دن کا وقت دیا جاتا تھا تو کم سے کم دس بارہ دن اِدھر اُدھر کے مشغلوں اور ریس کورس میں گزار دیتے تھے اور آخر ایک روز کسی گوشے میں جا کر بیٹھتے اور پندرہ بیس منٹ میں نہایت عمدہ گانا لکھ لاتے تھے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا پھر کرنا خدا کا یہ ہوا، اور شاید اس میں مبالغہ نہیں کہ ایک روز گھوڑوں کی ریس میں وہ چھیالیس لاکھ روپے جیت گئے۔ واقف کار کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی زندگی سے جہدِ مسلسل کا عنصر نکل گیا اور کیا عجب کہ اُن کی شاعری سے وہ تاثیر بھی

رخصت ہوئی ہو جوان کی شہرت کی وجہ بنی تھی۔ آیئے اُن کے لکھے ہوئے کچھ نغموں پر ایک نگاہ ڈالیں:

-دل سے بھلادو تم ہمیں ہم نہ تمہیں بھلائیں گے
روٹھ کے جانے والے ہم دنیا سے روٹھ جائیں گے (فلم: پتنگا، ۱۹۴۹ء)

-ابھی شام آئے گی، نکلیں گے تارے، مگر تم نہ ہوگے (فلم: سمادھی، ۱۹۵۰ء)

-اے جان جگر دل میں سمانے آجا، اجڑی ہوئی بستی کو بسانے آجا (فلم: آرام، ۱۹۵۱ء)

-اے زندگی کے راہی ہمت نہ ہار جانا بیتے گی رات غم کی بدلے گا یہ زمانہ (فلم: بہار، ۱۹۵۱ء)

-بلما بڑا نادان پریت کی نہ جانے پہچان (فلم: البیلا، ۱۹۵۱ء)

-غم کی وادی میں خوشی کا کارواں کھونے لگا
عشق میں جو کچھ نہ ہونا تھا وہی ہونے لگا (فلم: ساقی، ۱۹۵۲ء)

-میں دل ہوں اک ارمان بھرا تو آ کے مجھے پہچان ذرا (فلم: انہونی، ۱۹۵۲ء)

-یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی تیری اک ادا پہ نثار ہے
مجھے کیوں نہ ہو تیری آرزو تیری جستجو میں بہار ہے (فلم: سنگدل، ۱۹۵۲ء)

-وہ تو چلے گئے اے دل یاد سے ان کی پیار کر جینے میں کیا مزا رہا موت کا انتظار کر
تجھ کو خوشی سے کیا غرض غم ہے تیرے نصیب میں خوشیوں کی آس چھوڑ دے غم کو گلے کا ہار کر
بھول جا دن بہار کے دیکھ نہ خواب پیار کے دل تو نثار کر دیا جان بھی اب نثار کر
جینے میں کیا مزا رہا موت کا انتظار کر (فلم: سنگدل، ۱۹۵۲ء)

-جاگ درد عشق جاگ دل کو بے قرار کر چھیڑ کے آنسوؤں کے راگ
(فلم: انارکلی، ۱۹۵۳ء)

-مجھ سے مت پوچھ میرے عشق میں کیا رکھا ہے ایک شعلہ ہے جو سینے میں چھپا رکھا ہے
(فلم: انارکلی، ۱۹۵۳ء)

-وفاؤں کا مجبور دامن بچھا کر دعا کر غم دل خدا سے دعا کر
جو بجلی چمکتی ہے ان کے محل پر وہ کر لے تسلّی میرا گھر جلا کر (فلم: انارکلی، ۱۹۵۳ء)

-من ڈولے میرا تن ڈولے، میرے دل کا گیا قرار، یہ کون بجائے بانسریا (فلم: ناگن، ۱۹۵۴ء)
-میرا دل یہ پکارے آجا میرے غم کے سہارے آجا (فلم: ناگن، ۱۹۵۴ء)
-جادوگر سیاں چھوڑ و موری بیّاں ہوگئی آدھی رات اب گھر جانے دو
پھیکا پھیکا کجرا، ٹوٹا ہوا گجرا کہہ دے گا ساری بات اب گھر جانے دو (فلم: ناگن، ۱۹۵۴ء)
-کتنا حسین ہے موسم کتنا حسین سفر ہے ساتھی ہے خوب صورت یہ موسم کو بھی خبر ہے
(فلم: آزاد، ۱۹۵۵ء)
-اے دل مجھے بتا دے تو کس پہ آ گیا ہے وہ کون ہے جو آ کر خوابوں پہ چھا گیا ہے
(فلم: بھائی بھائی، ۱۹۵۶ء)
-چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار کے درد انوکھے ہائے دے گیا پیارے
(فلم: چمپا کلی، ۱۹۵۷ء)
-ہم سے آیا نہ گیا تم سے بلایا نہ گیا فاصلہ پیار میں دونوں سے مٹایا نہ گیا
(فلم: دیکھ کبیرا رویا، ۱۹۵۷ء)
-چل اڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ (فلم: بھابی، ۱۹۵۷ء)
-کون آیا میرے من کے دوارے پائل کی جھنکار لئے (فلم: دیکھ کبیرا رویا، ۱۹۵۷ء)
-ان کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے اپنی تو یہ عادت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
مجبور بہت کرتا ہے یہ دل تو زباں کو کچھ ایسی ہی حالت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
کہنے کو بہت کچھ تھا اگر کہنے پہ آتے دنیا کی عنایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
کچھ کہنے پہ طوفان اٹھا لیتی ہے دنیا اب اس پہ قیامت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
(فلم: عدالت، ۱۹۵۸ء)
-ہم پیار میں جلنے والوں کو چین کہاں آرام کہاں (فلم: جیلر، ۱۹۵۸ء)
-یوں حسرتوں کے داغ محبت میں دھو لئے خود دل سے دل کی بات کہی اور رو لئے
(فلم: عدالت، ۱۹۵۸ء)
-ہم چل رہے تھے، وہ چل رہے تھے مگر دنیا والوں کے دل جل رہے تھے (فلم:

دنیا نہ مانے، ۱۹۵۹ء)

-بے رحم آسماں میری منزل بتا ہے کہاں
جو نہ سوچا تھا وہ ہو گیا کیوں نصیبہ میرا سو گیا
غم کی ایسی گھٹا چھا گئی چین دل کا کہیں کھو گیا
یہ بتا کس لئے، لے رہا ہے میرا امتحان، بے رحم آسماں (فلم: بہانا، ۱۹۶۰ء)

-بھولی ہوئی یاد و مجھے اتنا نہ ستاؤ
اب چین سے رہنے دو میرے پاس نہ آؤ (فلم: سنجوگ، ۱۹۶۱ء)

-اتنا نہ مجھ سے تو پیار بڑھا کہ میں اک بادل آوارہ
کیسے کسی کا سہارا بنوں کہ میں خود بے بس بے چارہ (فلم: چھایا، ۱۹۶۱ء)

-وہ بھولی داستاں لو پھر یاد آ گئی نظر کے سامنے گھٹا سی چھا گئی
کہاں سے پھر چلے آئے وہ کچھ بھٹکے ہوئے سائے
وہ کچھ بکھری ہوئی یادیں وہ کچھ ٹوٹے ہوئے نغمے
پرائے ہو گئے تو کیا کبھی یہ بھی تو تھے اپنے
نہ جانے ان سے کیوں مل کر نظر شرما گئی
بڑے رنگین زمانے تھے ترانے ہی ترانے تھے
مگر اب پوچھتا ہے دل وہ دن تھے یا فسانے تھے
فقط اک یاد ہے باقی بس اک فریاد ہے باقی
وہ خوشیاں لٹ گئیں لیکن دلِ برباد ہے باقی
کہاں تھی زندگی میری کہاں پر آ گئی (فلم: سنجوگ، ۱۹۶۱ء)

-آنسو سمجھ کے کیوں مجھے آنکھوں سے تم نے گرا دیا (فلم: چھایا، ۱۹۶۱ء)

-ضرورت ہے اک شریمتی کی کلاوتی کی سیوا کرے جو پتی کی (فلم: من موجی، ۱۹۶۲ء)

-اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ رہا غیر تو غیر ہیں اپنوں کا سہارا نہ رہا (فلم: بھروسا، ۱۹۶۳ء)

-حال دل یوں انہیں سنایا گیا آنکھ ہی کو زباں بنایا گیا (فلم: جہاں آرا، ۱۹۶۴ء)

-پھر وہی شام وہی غم وہی تنہائی ہے   دل کو سمجھانے تری یاد چلی آئی ہے (فلم: جہاں آرا، ۱۹۶۴ء)

-بعد مدّت کے یہ گھڑی آئی   آپ آئے تو زندگی آئی
عشق مر مر کے کامیاب ہوا   آج اک ذرّہ آفتاب ہوا (فلم: جہاں آرا، ۱۹۶۴ء)

-میرے سامنے والی کھڑکی میں   اک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے
افسوس یہ ہے کہ وہ ہم سے   کچھ اکھڑا اکھڑا رہتا ہے (فلم: پڑوسن، ۱۹۶۸ء)

راجندر کرشن نے تقریباً تین سو فلموں کے نغمے اور منظر نامے لکھے۔ ان کے گانوں میں شوخی اور سنجیدگی کی آمیزش ان کی خوبی اور خصوصیت ہے۔ جس وقت بہت بڑی فلم مغل اعظم کے نام سے بن رہی تھی، مخالفوں نے راتوں رات فلم انارکلی بنا دی مگر اس بھاگ دوڑ میں بڑے اچھے نغمے لکھے گئے اور سی رام چندر نے اتنی ہی دلکش طرزیں بنائیں۔

فلم چھایا کے لئے عظیم موسیقار سلیل چوہدری نے دنیا کے بہت بڑے اور تاریخ ساز موسیقار موٹسارٹ Mozart کی ایک مشہور سمفنی کی طرز کو ہندوستانی انداز میں ڈھالا جس پر راجندر کرشن نے اتنے ہی نفیس بول لکھے: 'اتنا نہ مجھ سے تو پیار بڑھا'۔

کیسے جیالے لوگ تھے، کیسے بڑے بڑے کام کر گئے۔
یاد رہیں گے برسہا برس۔

آپ یوں فاصلوں سے گزرتے رہے

پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ تمام اچھے، بڑے اور مستند شاعر اشتراکی ہو گئے اور دنیا کے مزدوروں کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لئے دنیا کے آرام چھوڑ کر بمبئی کے کمیون میں جا بسے۔

وہاں بھی بعض آرام میسّر ہونے کے باوجود دو وقت کی روٹی یقیناً درکار تھی۔ ایسے میں شاعر پتھر ڈھونے سے رہے۔ انہیں جو ہنر آتا تھا اُسی کو روٹی روزی کا ذریعہ بنایا اور بمبئی کی فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئے۔

جو شاعر کم انقلابی تھے یا پوری طرح سرخ سویرے کے منتظر نہیں تھے انہیں بھی اس صنعت میں منافع کے امکانات نظر آئے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فلمی صنعت نے، جہاں عام تماش بینوں کے لئے سادہ اور سلیس زبان لکھنا ضروری تھا، اُس مرحلے پر اِن مستند شاعروں، ادیبوں کے لئے اپنی بانہیں وا کر دیں۔

اُس کے بعد یہ ہوا کہ معیاری فلمیں بننے لگیں اور روایتی شاعری کے لگے بندھے اصولوں میں لچک پیدا کی گئی۔ اس طرح کہ شعر کی خوبی بھی ماند نہ پڑے اور بات وہاں تک پہنچ جائے جہاں کامیابی کا سب سے بڑا پیمانہ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کو سمجھا جاتا ہے۔

فلم کی دنیا میں کمال امروہوی پہلے ہی پکار (۱۹۳۹ء) جیسی فلم بنا کر اور اس کے نغمے لکھ کر شہرت کی بلندیوں کو چھو چکے تھے۔ پھر سن چالیس کے عشرے میں راجا مہدی علی

خاں اس میدان میں اترے اور سن پچاس کے عشرے میں کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، کیف بھوپالی اور جاں نثار اختر جیسے شاعروں نے غزل اور نظم کی بیاضیں کھولیں اور بقول علی سردار جعفری ؎

آپ آئے تو محفل میں نغموں کی برات آئی

ان شاعروں نے نہ صرف اپنی نام وری کا پاس رکھا اور اعلیٰ مصرعے تراشے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنے نغموں میں تجربے بھی کئے اور طرح طرح کے اسلوب آزمائے۔

اس موقع پر دو نغموں کا ذکر ضروری ہے جو باذوق لوگوں کے ہاتھ لگتے تو امر ہو جاتے لیکن یہ دونوں وقت کی گرد میں اَٹ کر اِدھر اُدھر رُل گئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ سنہ ۵۶ء کا ذکر ہے، میں کراچی کے بوہری بازار میں گراموفون کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اندر سے لتا منگیشکر کی مانوس آواز کانوں میں پڑی۔ وہ کوئی غزل یا نظم گا رہی تھیں۔ اس کے بول بعد میں سنتا، پہلے اس کی طرز نے اتنا مسحور کیا کہ میں نے جھٹ دکان میں جا کر وہ ریکارڈ خرید لیا حالانکہ اُسے بجانے کے لئے گھر میں گراموفون نہ تھا۔

وہ سنہ ۵۵ء کی فلم سردار کا نغمہ تھا جو کیف عرفانی نے لکھا تھا اور جس کی طرز اپنے وقت کے بہت بڑے گلوکار جگ موہن نے بنائی تھی، اس کے علاوہ کسی نے غضب کا ستار بجایا تھا۔ کیف عرفانی کوئی بہت بڑے شاعر نہیں تھے لیکن ملہار، شیشم، ترانہ اور ناچ جیسی فلموں میں گانے لکھ چکے تھے اور گلوکار مکیش نے اُن کے اشعار کو بڑی شہرت عطا کی تھی ؎

جیئیں گے مگر مسکرا نہ سکیں گے — کہ اب زندگی میں محبت نہیں ہے
لبوں پہ ترانے اب آ نہ سکیں گے — کہ اب زندگی میں محبت نہیں ہے

فلم سردار کے جس نغمے کی بات ہو رہی تھی اُسے یہاں نقل کرنے سے پہلے بتا دوں کہ انٹرنیٹ پر لوگوں نے اس نغمے کے حق میں ایسے ایسے کلمات لکھے ہیں کہ غلو کا گمان ہوتا ہے۔ حیرت ہے اس کے بعد یہ نغمہ بس ایک دو بار سننے میں آیا اور پھر لاپتہ ہو گیا:

پیار کی یہ تلخیاں جو نہ سہہ سکوں تو میں کیا کروں
پیار کی یہ تلخیاں
دل کا قرار لے کے صنم تم جو چل دیئے
آج میرے غم پہ یہ آنسو بھی ہنس دیئے
سہنی پڑی ہیں یوں مجھے تجھ بن اے پاسباں
پیار کی یہ تلخیاں
آنکھوں میں رہ گئی ترے ملنے کی آرزو
سونی سی چاندنی ہے ہوا جب سے دور تو
اشکوں کا بس چلے تو کریں تجھ سے جا بیاں
پیار کی یہ تلخیاں
قسمت سے پوچھتی ہے محبت تو یہ بتا
نامراد کیوں رہی میری حسیں دعا
کیا مل گیا تجھے، مجھے یوں دے کے آسماں
پیار کی یہ تلخیاں

کھو جانے والا دوسرا نغمہ علی سردار جعفری جیسے ترقی پسند شاعر کی لکھی ہوئی قطعہ بند غزل ہے جس کی طرز نوشاد صاحب نے بنائی تھی اور اسے محمد رفیع نے گایا تھا۔

اُن دنوں محمد مجیب کا لکھا ہوا ڈراما "حبّہ خاتون" شہرت پا چکا تھا۔ یہ ایک کشمیری شہزادے اور ایک دہقان کی بیٹی کی محبت کی داستان تھی جس میں امیری اور غریبی کے نظام پر ضرب پڑتی تھی۔ کچھ انقلاب پسندوں نے حبّہ خاتون کی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں میں علی سردار جعفری کا شامل ہونا عین ممکن ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، فلم تو نہ بن سکی البتہ جعفری صاحب کی ایک غزل مکمل ہوگئی جو دستیاب ہے۔ اس میں نوشاد صاحب کی کمپوزیشن اور رفیع صاحب کی ادائیگی نہایت عمدہ ہے اور اسے کشمیری سازوں سے سجایا گیا ہے۔

جس رات کے خواب آئے، وہ خوابوں کی رات آئی
پیغام بہاروں کا آخر میرے نام آیا
آپ آئے تو محفل میں نغموں کی برات آئی
یہ مہکی ہوئی زلفیں یہ بہکی ہوئی سانسیں
تقدیر میری جاگی جنّت میرے ہاتھ آئی
چہرے پہ تبسّم نے ایک نور سا چھلکایا
لو آج دلہن بن کے پہلو میں حیات آئی

شرما کے جھکیں نظریں ہونٹوں پہ وہ بات آئی
پھولوں نے دعائیں دیں تاروں کا سلام آیا
جس رات کے خواب آئے وہ خوابوں کی رات آئی
نیندوں کو چرا لیں گی یہ نیند بھری آنکھیں
جس رات کے خواب آئے وہ خوابوں کی رات آئی
کیا کام چراغوں کا جب چاند نکل آیا
جس رات کے خواب آئے وہ خوابوں کی رات آئی

یہ بات ۱۹۶۸ء کی ہے۔ میں صحافت کی تربیت کے لئے برطانیہ آیا ہوا تھا اور ویلز کے ایک ہوسٹل میں میرا قیام تھا۔ کچھ دنوں بعد گھر یاد آنے لگا اور ساتھ ہی بہت پرانے پرانے گانے یاد آنے لگے۔ ہاسٹل کے کامن روم میں بڑا سا گراموفون رکھا تھا اور کچھ نئے پرانے ریکارڈ رکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ سارے کے سارے مغربی موسیقی کے تھے۔ ایک روز میں انہیں الٹ پلٹ رہا تھا کہ ایک ریکارڈ پر اردو ہندی تحریر نظر آئی۔ لکھا تھا 'آج کی کالی گھٹا'۔ یہ سنہ ٦٦ء کی فلم "اُس کی کہانی" کا نغمہ تھا جسے گیتا دت نے گایا تھا، کیفی اعظمی نے لکھا اور بنگال کے موسیقار کانو رائے نے طرز بنائی تھی۔ ریکارڈ چلایا تو حیرت انگیز مصرعے کھلتے چلے گئے۔ روایتی گیت نہیں تھا۔ بحر اور وزن کی پابندیاں بھی کم تھیں جو گانے کی ادائیگی آسان بنا دیتی ہیں اور ساتھ میں کوئی بڑا آرکسٹرا نہیں، بس چار پانچ ساز بج رہے تھے۔ ویلز کے قصبے پینارتھ Penarth کی شام کی فضاؤں میں وہ نغمہ اتنی بار دہرایا گیا کہ مجھے ازبر ہو گیا۔

عرصہ گزر گیا اور ستمبر ۱۹۸۷ء میں یعنی تقریباً بیس سال بعد کیفی اعظمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس نغمے کا ذکر چھیڑا۔ بولے "ہاں وہ ہمارا ہی تھا۔" پھر انہوں نے بتایا کہ میوزک ڈائریکٹر کانو رائے نے اس کی طرز پہلے سے تیار کر لی تھی جو بنگالی موسیقار عام طور پر کیا کرتے تھے۔ بعد میں کیفی صاحب نے اُس پر الفاظ بٹھائے، پھر گیتا دت کو اُس کی مشق کرائی گئی۔ آخر ریکارڈنگ ہوئی اور سننے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دو جگہ

لڑکھڑائیں مگر شاید انہیں مزید مشقت سے بچانے کے لئے ریکارڈنگ کو اوکے کر دیا گیا۔ اس کے بول یوں ہیں:

آج کی کالی گھٹا مست متوالی گھٹا
مجھ سے کہتی ہے پیاسا ہے کوئی
کون پیاسا ہے مجھے کیا معلوم
پیاس کے نام سے جی ڈرتا ہے
کسی الزام سے جی ڈرتا ہے
شوق بے نام سے جی ڈرتا ہے
میٹھی نظروں میں سمایا ہے کوئی
کیوں سمایا ہے، مجھے کیا معلوم
پیاسی آنکھوں میں محبت لے کے
لڑکھڑا جانے کی اجازت لے کے
مجھ سے بے وجہ شکایت لے کے
دل کی دہلیز تک آیا ہے کوئی
کون آیا ہے مجھے کیا معلوم
کچھ مزا آنے لگا جینے میں
جاگ اٹھا درد کوئی سینے میں
میرے احساس کے آئینے میں
ایک سایہ نظر آتا ہے
کس کا سایہ ہے مجھے کیا معلوم
زندگی پہلے نہ تھی اتنی حسیں
اور اگر تھی تو مجھے یاد نہیں
یہی افسانہ نہ بن جائے کہیں

کچھ نگاہوں سے سناتا ہے کوئی
کیا سناتا ہے مجھے کیا معلوم

کیفی صاحب کا مقام اپنی جگہ مگر اپنے دور کی شاعری سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے اور اس بات کا پورا امکان ہے کہ جن دنوں یہ نغمہ لکھا گیا گلزار کا انداز اور اسلوب فضا میں رنگوں کی طرح اڑنے لگا ہوگا۔ کیفی صاحب کی طرح گلزار بھی انقلابی تھے اور ان کے اُستاد احمد ندیم قاسمی بھی سدا کے ترقّی پسند تھے۔ اپنے نظریئے کو اپنی شاعری کے قلب میں اتارتے ہوئے انہوں نے اپنی فکر اور تخیل کو آزاد چھوڑ دینے کا جو انداز اختیار کیا وہ عام لوگوں کے دلوں کو بھا گیا اور فلموں میں جدید شاعری پوری آب و تاب سے جلوہ دکھانے لگی۔

گلزار نے پہلے پہلے ۱۹۶۳ء کی فلم بندنی میں وہ دلکش نغمہ لکھا

میرا گورا انگ لے لے موہے شام رنگ دے دے
چھپ جاؤں گی رات ہی میں موہے پی کا سنگ دے دے

پھر اُن کا سفر جاری رہا۔ بڑے بڑے موسیقاروں نے ان کے نغموں کو سُر عطا کئے۔ سنہ ۸۷ء میں ان کی فلم اجازت جاری ہوئی۔ اُس کا ایک نغمہ

میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے
ساون کے کچھ بھیگے بھیگے دن رکھے ہیں
اور میرے ایک خط میں لپٹی رات پڑی ہے
وہ رات بجھا دو، میرا وہ سامان لوٹا دو
پت جھڑ میں کچھ پتوں کے گرنے کی آہٹ
کانوں میں ایک بار پہن کے لوٹ آئی تھی
پت جھڑ کی وہ شاخ ابھی تک کانپ رہی ہے
وہ شاخ گرا دو، میرا وہ سامان لوٹا دو
ایک اکیلی چھتری میں جب آدھے آدھے بھیگ رہے تھے

آدھے سوکھے، آدھے گیلے
سوکھا تو میں لے آئی تھی
گیلا من شاید بستر کے پاس پڑا ہو
وہ بھجوادو، میرا وہ سامان لوٹادو
ایک سوسولہ چاند کی راتیں
ایک تمہارے کاندھے کا تل
گیلی مہندی کی خوشبو، جھوٹ موٹ کے شکوے کچھ
جھوٹ موٹ کے وعدے یاد کرادوں
سب بھجوادو، میرا وہ سامان لوٹادو

سنئے پھر کیا ہوا۔ کمال امروہوی نے فلم شنکر حسین لکھی۔ ان کے بیٹے تاجدار کمال نے بنائی، یوسف نقوی نے ہدایات دیں۔ کچھ اداکار بھرتی کئے گئے جو کچھ زیادہ مانوس نہیں۔ سنا ہے کچھ ہندو مسلم اتحاد کا موضوع تھا۔ لکھنؤ کی عزاداری دکھائی گئی تھی۔ لتا منگیشکر نے واقعہ کربلا کے تعلق سے سوز پڑھا جو شیام بینگل کی فلم سرداری بیگم میں بھی اپنی قدیم روایتی طرز میں پڑھا گیا تھا۔ شنکر حسین نامی فلم کے میوزک ڈائریکٹر خیام نے اس کی نئی طرز بٹھائی۔ یہ سب تو ہوا۔ لطف کی بات یہ ہوئی کہ چار عظیم شاعر مل کر بیٹھے: کمال امروہوی، جاں نثار اختر، کیف بھوپالی اور کیفی اعظمی۔ ان چاروں نے ایک ایک نغمہ اپنے ذمّے لے لیا اور طے یہ پایا کہ جدید شاعری کی جائے۔ پھر جو چار نغمے وجود میں آئے، یادگار ہیں۔ خیام نے نہایت عمدہ طرزیں بنائیں جنہیں لتا اور رفیع نے دل لگا کر گایا۔ ایک نغمہ تو دور دور تک پہنچا جو جاں نثار اختر نے لکھا تھا، پڑھئے

آپ یوں فاصلوں سے گزرتے رہے
دل سے قدموں کی آواز آتی رہی
آہٹوں سے اندھیرے چمکتے رہے
رات آتی رہی، رات جاتی رہی
گنگناتی رہیں میری تنہائیاں
دور بجتی رہیں کتنی شہنائیاں
زندگی زندگی کو بلاتی رہی
دل سے قدموں کی آواز آتی رہی

قطرہ قطرہ پگھلتا رہا آسماں — روح کی وادیوں میں نہ جانے کہاں
اک ندی دل رُبا گیت گاتی رہی — دل سے قدموں کی آواز آتی رہی
آپ کی گرم بانہوں میں کھو جائیں گے — آپ کے نرم زانو پہ سو جائیں گے
مدتوں رات نیندیں چراتی رہی — دل سے قدموں کی آواز آتی رہی

جاں نثار اختر عشق میں مبتلا تھے۔ عشق کی ساری نزاکتیں اور نفاستیں اس نغمے میں ڈھل گئیں۔

دوسرا نغمہ کیف بھوپالی نے لکھا۔ جدید علامتی شاعری کا یہ بھی ایک شاہکار ہے ؎

اپنے آپ راتوں میں چلمنیں سرکتی ہیں — چونکتے ہیں دروازے، سیڑھیاں دھڑکتی ہیں
ایک اجنبی آہٹ آ رہی ہے کم کم سی — جیسے دل کے پردوں پر گر رہی ہو شبنم سی
بن کسی کی یاد آئے دل کے تار ہلتے ہیں — بن کسی کے کھنکائے چوڑیاں کھنکتی ہیں
اپنے آپ

کوئی پہلے دن جیسے گھر کسی کے جاتا ہو — جیسے خود مسافر کو راستہ بلاتا ہو
پاؤں جانے کس جانب بے اٹھائے اٹھتے ہیں — اور چھم چھما چھم چھم پائلیں چھنکتی ہیں
اپنے آپ

جانے کون بالوں میں انگلیاں پروتا ہے — کھیلتا ہے پانی سے تن بدن بھگوتا ہے
جانے کس کے ہاتھوں سے گاگریں چھلکتی ہیں — جانے کس کی بانہوں سے بجلیاں لپکتی ہیں
اپنے آپ

تیسرا یادگار نغمہ کمال امروہوی نے لکھا۔ فلم پاکیزہ بنائے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے جس کی کامیابی کا سرور ابھی باقی ہوگا، اوپر سے حسرت موہانی کا انداز اور ویسا ہی عشق ؎

کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی — بہت خوبصورت مگر سانولی سی
مجھے اپنے خوابوں کی بانہوں میں پا کر — کبھی نیند میں مسکراتی تو ہو گی
اسی نیند میں کسمسا کسمسا کر — سرہانے سے تکیہ گراتی تو ہو گی

وہی خواب دن کی منڈیروں پہ آ کے — اسے من ہی من میں لبھاتے تو ہوں گے
کئی ساز سینے کی خاموشیوں میں — میری یاد میں جھن جھناتے تو ہوں گے
وہ بے ساختہ دھیمے دھیمے سروں میں — میری دھن میں کچھ گنگناتی تو ہو گی
کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی

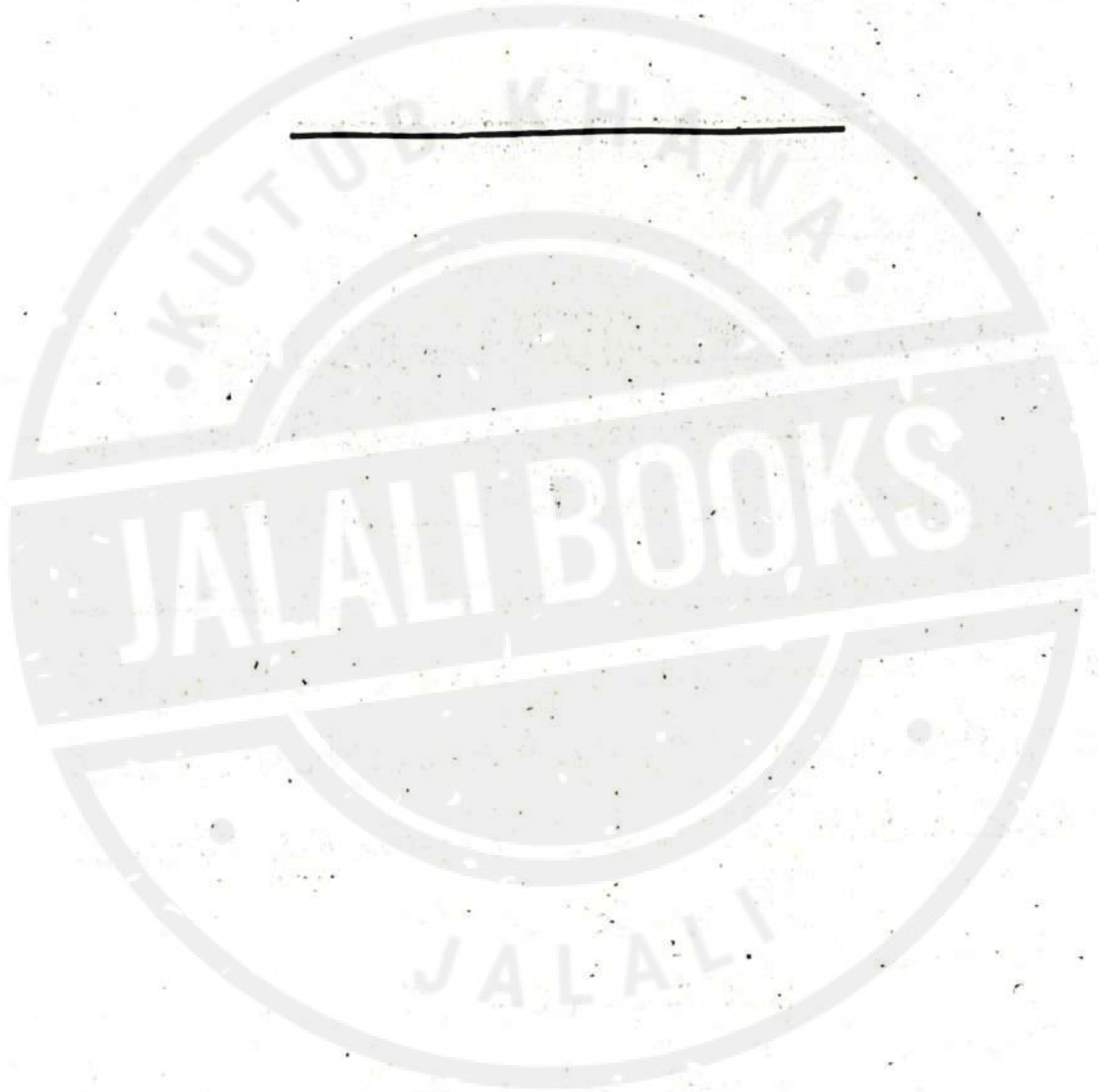
چلو خط لکھیں، جی میں آتا تو ہو گا — مگر انگلیاں کپکپاتی تو ہوں گی
قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتا تو ہو گا — امنگیں قلم پھر اٹھاتی تو ہوں گی
میرا نام اپنی کتابوں پہ لکھ کر — وہ دانتوں میں انگلی دباتی تو ہو گی
زباں سے کبھی اُف نکلتی تو ہو گی — بدن دھیمے دھیمے سلگتا تو ہو گا
کہیں کے کہیں پاؤں پڑتے تو ہوں گے — دوپٹہ زمیں پر لٹکتا تو ہو گا
کبھی صبح کو شام کہتی تو ہو گی — کبھی رات کو دن بتاتی تو ہو گی
ہر اک چیز ہاتھوں سے گرتی تو ہو گی — طبیعت پہ ہر کام گھلتا تو ہو گا
پلیٹیں کبھی ٹوٹ جاتی تو ہوں گی — کبھی دودھ چولہے پہ جلتا تو ہو گا
غرض اپنی معصوم نادانیوں پر — وہ نازک بدن جھینپ جاتی ہو گی
کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی

شنکر حسین کا چوتھا نغمہ کیفی اعظمی کے حصّے میں آیا۔ وہ روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کی مخصوص چار بیت تھی جو قوالی کے انداز میں دف بجا کر رام پور، بھوپال اور ٹونک میں گائی جاتی ہے۔ فلم میں یہ چار بیت، رام پور کے مشہور گلوکار ببّن خان اور عزیز نازاں نے گائی۔ کیفی صاحب کو روایتی انداز کے بول لکھنے پڑے

اچھا انہیں دیکھا ہے — بیمار ہوئیں آنکھیں
مرجھائی سی رہتی ہیں — گھبرائی سی رہتی ہیں
معشوق کی محفل میں — شرمائی سی رہتی ہیں
کیا جانے ہوا کیا ہے — پتھرائی سی رہتی ہیں
اچھا انہیں دیکھا ہے

پڑھنے والے سوچتے ہوں گے کہ پھر اس فلم نے خوب خوب دھاک بٹھائی ہو گی۔ یقین تو نہیں آتا لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ فلم کا صرف ایک ہی شو ہو سکا۔ اُس میں بھی تماشائی فلم ادھوری چھوڑ کر اور ان کے بقول کرسیاں توڑ کر چلے گئے۔

جھوٹ ہو تو کہنے والے کی گردن پر۔



اک دن ہم کو یاد کرو گے

نغمہ نگاری کے تین بڑے ستونوں کی طرف چلنے سے پہلے اور مستند شاعروں کی بات کرتے ہوئے آخر میں راجا مہدی علی خاں کا ذکر ضروری ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ لتا منگیشکر اور میوزک ڈائریکٹر مدن موہن ایک دوسرے کے لئے بنے تھے۔ ایک تیسرا شخص بھی تھا جو اِن دونوں کے لئے بنا تھا اور وہ تھے راجا مہدی علی خان۔ وہ سعادت حسن منٹو کے کہنے پر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر فلم کی صنعت میں گئے اور نہ صرف مکالمے لکھے بلکہ اشوک کمار کی فلم آٹھ دِن میں اداکاری بھی کی مگر اُن کے اندر کا شاعر بے چین رہا اور بالآخر انہوں نے سنہ ۴۶ء میں فلم دو بھائی کے لئے گانا لکھا

میرا سندر سپنا بیت گیا
میں پریم میں سب کچھ ہار گئی
بے درد زمانہ جیت گیا

اس کے بعد وہ نغمہ نگاری کے میدان میں آگے ہی بڑھتے گئے اور غزل اور گیت کے امتزاج کی وہ بنیاد رکھی جس پر اُن کے ساتھ ساتھ مجروح سلطان پوری نے بھی شاندار عمارت اٹھائی۔ راجا مہدی خاں کے لکھے ہوئے چند نغمے مثال بن کر آپ کے سامنے ہیں، جو سب نے سُنے پر کوئی نہ جانا کہ کس نے لکھے ہیں:

- اک دن ہم کو یاد کرو گے (فلم: دو بھائی، ۱۹۴۷ء)

-ہمیں چھوڑ پیا کس دیس گئے، پیالوٹ کے آنا بھول گئے (فلم: دو بھائی)
-وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو (فلم: شہید، ۱۹۴۸ء)
-پریت لگا کے میں نے یہ پھل پایا، سدھ بدھ کھوئی چین گنوایا (فلم: آنکھیں، ۱۹۵۰ء)
-میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا، نہ جی کو جلانا، مجھے بھول جانا (فلم: مدہوش، ۱۹۵۱ء)
-آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے، دل کی اے دھڑکن ٹھہر جا مل گئی منزل مجھے (فلم: ان پڑھ، ۱۹۶۲ء)
-ہے اسی میں پیار کی آبرو، وہ جفا کرے میں وفا کروں
جو وفا بھی کام نہ آسکے، تو وہی کہے کہ میں کیا کروں (فلم: ان پڑھ)
-اگر مجھ سے محبت ہے مجھے سب اپنے غم دے دو
ان آنکھوں کا ہر اک آنسو مجھے، میری قسم دے دو (فلم: آپ کی پرچھائیاں، ۱۹۶۲ء)
-جو ہم نے داستاں اپنی سنائی، آپ کیوں روئے
تباہی تو ہمارے دل پہ آئی، آپ کیوں روئے (فلم: وہ کون تھی، ۱۹۶۴ء)
-لگ جا گلے سے پھر یہ حسین رات ہو نہ ہو
شاید پھر اس جنم میں ملاقات ہو نہ ہو (فلم: وہ کون تھی)
-نیناں برسیں رم جھم رم جھم پیا تورے آون کی آس (فلم: وہ کون تھی)
-آخری گیت محبت کا سنا لوں تو چلوں
میں چلا جاؤں گا، دو اشک بہا لوں تو چلوں (فلم: نیلا آکاش، ۱۹۶۵ء)
-تو جہاں جہاں چلے گا، میرا سایہ ساتھ ہوگا (فلم: میرا سایہ، ۱۹۶۶ء)

فلم میرا سایہ کے لئے راجا مہدی علی خان نے بہت پرانے لوک گیت کو نئے انداز میں لکھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ گانا اس بار بھی پہلے کی طرف مقبول ہوا: "جُھمکا گرا رے، بریلی کے بازار میں۔" دوسری دلچسپ بات ہے کہ مجھے رام پور میں پرانے ریکارڈ جمع کرنے والے ایک نوجوان کے ہاں اصل اور پرانے گانے کا ساٹھ ستر سال پرانا ریکارڈ سننے کا اتفاق ہوا جس کے پہلے بول سے تو سب واقف ہیں مگر آگے کے بول اب کسے یاد

رہے ہوں گے

جھمکا گرا رے، بریلی کے بازار میں جھمکا گرا رے

ساس موری روئے، نند میری روئے

سیاں سوئے رے گلے میں بیاں ڈال کے

جھمکا گرا رے

راجا مہدی علی خاں کا لکھا ہوا جو سیدھا سادہ سا نغمہ دل کو چھوتا ہے، جس کی طرز وہی مدن موہن نے بنائی ہے اور جسے لتا منگیشکر نے اپنے سروں سے آراستہ کیا ہے، مجھے ذاتی طور پر پسند ہے۔ یہ نغمہ ۱۹۵۱ء کی فلم ادا میں شامل تھا جن دنوں لکھنؤ کی ریحانہ ہیروئن بنا کرتی تھیں:

پریتم میری دنیا میں دو دن تو رہے ہوتے ہم پریم کے ساگر میں اک ساتھ بہے ہوتے

گر یوں ہی بچھڑنا تھا ہم سے تجھے او ظالم دو بول محبت کے ہم سے نہ کہے ہوتے

بے درد اگر تجھ کو غیروں ہی کا ہونا تھا وعدے وہ وفاؤں کے ہم سے نہ کئے ہوتے

آخری بات یہ کہ لتا کے وہ زیادہ تر نغمے جنہیں سن کر محسوس ہوتا ہے کہ کسی آسیب زدہ کھنڈر نما حویلی میں کوئی بھٹکی ہوئی روح گاتی پھر رہی ہے، ان سب کی طرزیں مدن موہن نے بنائی تھیں اور اُن سب کے بول راجا مہدی علی خاں نے لکھے تھے۔ آج اُن کی وہ پیش گوئی ٹھیک ہی نکلی ؎

اک دن ہم کو یاد کرو گے

یہ گیت سارے زمانے میں گائے جائیں گے

شکیل بدایونی سرتاپا شاعر تھے۔

ایک روز سڑک کے کنارے کھڑے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں سامنے سے ایک کھلی ہوئی کار آتی نظر آئی۔ چمکتی دمکتی اسپورٹس کار کی چھت نہیں تھی۔ اسے ایک خوش رنگ اور خوش شکل لڑکی چلا رہی تھی جس کی گوری رنگت پر دھوپ کا چشمہ انوکھی چھب دکھا رہا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس پر شکیل نے ایک طویل نظم کہی جس کا عنوان تھا "تصادم"۔ نظم میں سارا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا کہ سننے اور پڑھنے والے کے ذہن میں متحرک تصویر بن گئی۔ اس کا عنوان تصادم بھی خوب رکھا گیا تھا۔

اس عنوان سے خیال ہوتا ہے کہ کار کی کسی سے ٹکر ہوئی ہوگی۔

جی نہیں۔ ہوا یہ کہ کار جب دوستوں کے جھرمٹ کے قریب آ کر رکی تو اُس کا بونٹ شکیل صاحب کی شیروانی سے ذرا سا چھو گیا تھا،

طویل نظم کی تخلیق کے لئے اتنا سا تصادم کافی تھا۔

قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ بدایوں میں پیدا ہوئے ہوں گے مگر ضروری نہیں۔ مجروح سلطان پور میں نہیں، کہیں اور پیدا ہوئے تھے اور کیفی اعظمی کی ولادت اعظم گڑھ میں نہیں ہوئی۔ شکیل کی سوانح لکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں شعر گوئی کی روایت نہیں تھی اور ان کے والد شاعر نہیں تھے۔ مگر سوچئے کہ ایک شخص اردو داں ہو، مسلمان ہو اور اُس کا نام محمد

جمال احمد سوختہ ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شاعر نہ ہو۔

شکیل میں تو شاعری کے جراثیم مرض کی حد تک تھے۔ اٹھتے بیٹھتے شعر کہتے تھے۔ اپنے ہم جماعت دوستوں کے لئے ان کی محبوباؤں کے نام منظوم خط لکھ کر دیا کرتے تھے۔ کوئی بھی واقعہ یا حادثہ ہوتا پچاس ساٹھ اشعار کی نظم کہہ دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ علی گڑھ کی نمائش میں جاتے اور اگر کہیں یونیورسٹی کی لڑکیوں کا سامنا ہو جاتا تو اُن پر اشعار کی جھڑی لگ جاتی۔

بیس سال کی عمر میں ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور مشاعروں میں اپنے کلام کی دھوم مچانے لگے۔ چار سال بعد سلمہ سے شادی کی، بی اے کر کے دلّی میں ملازمت کی اور شادی کے چھ سال بعد بمبئی جا پہنچے۔ اُس وقت اچھے اچھے شاعر اور ادیب فلمی دنیا کا رخ کر رہے تھے، شکیل نے بھی جھٹ اپنا مقام بنالیا۔ اے آر کاردار فلم درد بنا رہے تھے جس کی موسیقی نوشاد علی ترتیب دے رہے تھے۔

سوانح نگار کہتے ہیں کہ نوشاد نے اُن سے کہا کہ اپنی شاعری کی صلاحیت کو ایک شعر میں قلم بند کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر شکیل نے وہ مشہور شعر لکھا ہے

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی ایک آگ لگا دیں گے

میری مانئے تو یہ شکیل بدایونی جیسے شاعر کا سب سے کمزور شعر تھا، جہاں انہیں کہنا تھا کہ ہم اپنے درد کا افسانہ دنیا کو سنائیں گے، وہاں سنا دیں گے سے تو محسوس ہوتا ہے گویا دھمکی دے رہے ہیں۔

دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ ہر دل میں محبت کی ایک آگ لگا دیں گے۔ محبت کی آگ نہیں لگائی جائی، دھیمی سی لو اونچی کی جاتی ہے۔ محبت کا الاؤ بننا خطرے سے خالی نہیں۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ فلم کا نام درد طے تھا۔ گانے میں جسے فلم کی اصطلاح میں ٹائٹل سانگ کہا جاتا ہے، یہ لفظ استعمال ہونا تھا، دوسرے یہ کہ یہ گانا کسی یتیم خانے کے

بچوں کو گاناتھا، چنانچہ یہ ضرور ہے کہ گانے پر یتیمی برس رہی ہے۔

فلم درد تقسیم ہند کے وقت سنہ ۴۷ء میں جاری ہوئی تھی۔ یہ وقت ہندو مسلم کشاکش کا تھا اور ایسے میں یہ مصرعہ لکھنا بڑی جرأت کا کام تھا

اسلام کی کشتی کو ہم پار لگا دیں گے

اسی فلم میں شکیل نے اوما دیوی کے لئے وہ گانا لکھا جو مقبولیت کی سب سے اونچی منزل تک جا پہنچا

افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بے قرار کا
آنکھوں میں رنگ بھر کے ترے انتظار کا

نوشاد کی موسیقی اور شکیل کی شاعری کی بدولت فلم درد کو غیر معمولی شہرت ملی اور اس کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور کبھی نہیں چھوڑا۔ نوشاد کی تخلیقی صلاحتیں جب عروج پر پہنچیں تو شکیل نے اُسی انداز کے پُر پیچ نغمے لکھے اور جب نوشاد کی موسیقی میں تھکن کے آثار نمودار ہوئے تو شکیل نے ان کے لئے سہل اور سادہ کلام لکھ کر ان کا کام آسان بنائے رکھا۔ نوشاد کے علاوہ ان کی موسیقار روی اور غلام محمد سے بھی بہت قربت تھی اور گلوکار موسیقار ہیمنت کمار کے لئے فلم "صاحب، بی بی اور غلام" کے گیت لکھ کر شکیل نے ایک ایسی فلم کی تخلیق میں ہاتھ بٹایا جو عرصہ ء دراز تک برصغیر کی عظیم فلموں میں شمار ہوگی۔

انہوں نے تقریباً نوّے فلموں کے لئے نغمے لکھے اور حیرت انگیز طور پر اپنے نغموں کو کلاسیکی شاعری کی ڈگر سے ہٹنے نہیں دیا۔

ذیابطس کے مریض تھے۔ اُن دنوں موٴثر علاج دستیاب نہ تھا۔ صرف ۵۳ برس کی عمر میں ۱۹۷۰ء میں انتقال کر گئے۔

نغمہ نگاروں کو کیسی کیسی مشکلیں پیش آتی ہیں، خاص طور پر اُس وقت جب اُن کے آجر (پے ماسٹر) سرمایہ دار ہوتے ہیں، اس کی یہ دلچسپ داستاں پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے مگر اسے یہاں دُہرانا ضروری ہے۔

شکیل بدایونی کے علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھی اور جگری دوست رسال الدین

صاحب سنایا کرتے ہیں کہ شکیل فلم انوکھی ادا کے گانے لکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک شعر لکھا ؎

جفاؤں پر ملال آتا تو ہو گا   انہیں میرا خیال آتا تو ہو گا

فلم کے پروڈیوسر محبوب یا شاید پیسہ لگانے والے کسی سیٹھ نے یہ شعر سنا تو خالص بمبئی کے لہجے میں کہا کہ یہ ہمارے پلّے نہیں پڑتا، اسے آسان کرو۔ اس پر شکیل نے پہلا مصرعہ تبدیل کیا مگر سیٹھ نے کہا کہ اسے سن کر بھی سر گھوم جاتا ہے، اور آسان کرو۔ تنگ آ کر شکیل نے لکھا ؎

کبھی دل دل سے ٹکراتا تو ہوگا   انہیں میرا خیال آتا تو ہوگا

یہ مصرعہ سن کر سیٹھ پھڑک اٹھا اور خوش ہو کر اُسی وقت شکیل کو پانچ سو روپے دیئے۔

اس پر رسال الدین صاحب کہتے ہیں "ہمیں ایک سو روپے دے دیتا، ہم اس سے بھی بُرا مصرعہ لکھ دیتے۔"

یہاں پر ساحر لدھیانوی کے طور طریقوں کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ساحر کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتا تھا۔ وہ جس طرح اور جو بھی چاہتے تھے، لکھتے تھے اور کسی پروڈیوسر یا سیٹھ کو اعتراض کرنے کی جرات نہیں تھی۔ ساحر کی نازک مزاجی (یا بددماغی) مشہور تھی۔ ناراض ہو جاتے تو غضب ہو جاتا تھا۔ ایک بار نہایت برہمی کے عالم میں آل انڈیا ریڈیو پہنچے اور حکامِ بالا سے کہا کہ ریکارڈ بجاتے ہوئے نغمہ نگار کا نام نہ لیا گیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ریڈیو والوں نے ہاتھ جوڑ لئے۔

شکیل بدایونی کے یا کسی بھی پائے کے شاعر کے لکھے ہوئے نغموں کے ساتھ یہ عجیب معاملہ ہے کہ لوگوں کو نغمے کے شروع کے ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین چار بول یاد رہ جاتے ہیں اور آگے چل کر وہ اپنی شاعری کے جو جوہر دکھاتا ہے انہیں یا تو لوگ دھیان سے نہیں سنتے یا پھر یاد نہیں رکھتے۔

یہاں ہم شکیل کے نغموں کی ذرا گہرائی میں چلیں گے اور دیکھیں گے کہ اکثر اوقات وہ تین تین مصرعوں کے بند لکھ کر نغمہ نگاری کے کیسے کیسے پھول کھلاتے تھے۔

ملاحظہ ہو۔

کیا بتائیں کتنی حسرت دل کے افسانے میں ہے   صبح گلشن میں ہوئی اب شام ویرانے میں ہے
کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اب جاؤں کدھر   ٹھوکریں کھانا ہی قسمت میں لکھا ہے در بدر
میرے مٹنے کی شکیل ان کو نہ ہو پروا مگر   ان کا افسانہ بھی شامل میرے افسانے میں ہے
(فلم: ناٹک، ۱۹۴۷ء)

اس قید میں جینا مشکل ہے اے موت لگی ہے آس تری
چپکے سے ذرا آ کر کہہ دے جا ہم نے تجھے آزاد کیا

(فلم: میلہ، ۱۹۴۸ء)

دنیا ہے موج دریا، قطرے کی زندگی کیا   پانی میں مل کے پانی، انجام یہ کہ فانی
دم بھر کو سانس لے لے، یہ زندگی کے میلے   (فلم: میلہ، ۱۹۴۸ء)
وہ پا لیتے تو ہوں گے دل پہ قابو   انہیں یہ بھی کمال آتا تو ہوگا
(فلم: انوکھی ادا، ۱۹۴۸ء)

جگر میں درد، دل میں ٹیس اور آنکھوں میں دو آنسو
ذرا تو دیکھ لے آ کر میں کیا کیا لے کے آیا ہوں

(فلم: دل لگی، ۱۹۴۹ء)

میری زندگی پہ نہ مسکرا، مجھے زندگی کا الم نہیں   جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں
وہی کارواں، وہی راستے، وہی زندگی، وہی مرحلے   مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں، کبھی ہم نہیں
میں قفس میں قید ہوں باغباں، مجھے کیا غرض بہار سے   نہ چمن ہے میرا نہ آشیاں جو خزاں بھی آئے تو غم نہیں
(فلم: ہزار راتیں، ۱۹۳۵ء)
خبر کیا تھی گلستانِ محبت میں بھی خطرے ہیں   جہاں گرتی ہے بجلی ہم اسی ڈالی پہ جا بیٹھے
(فلم: چور بازار، ۱۹۵۴ء)

مٹا کر ہر اک آرزو ہر تمنّا، زمانے کے بازار میں لائی دنیا
کئے خوب سودے غم زندگی کے، جنازے خریدے، کفن بیچ ڈالا (فلم: حورِ عرب، ۱۹۵۵ء)

تقدیر کی گردش کیا کم تھی، اُس پر یہ قیامت کر بیٹھے
بیتابیِ دل جب حد سے بڑھی، گھبرا کے محبت کر بیٹھے (فلم: ستارا، ۱۹۵۵ء)
شکریہ اس مہربانی کا تمہاری شکریہ جب خیالوں میں بلاتا ہوں چلے آتے ہو تم
(فلم: نازنین، ۱۹۱۵ء)

زلفیں ہیں جیسے کاندھوں پہ بادل جھکے ہوئے
آنکھیں ہیں جیسے مے کے پیالے بھرے ہوئے
مستی ہے جس میں پیار کی تم وہ شراب ہو
چہرہ ہے جیسے جھیل میں ہنستا ہوا کنول
یا زندگی کے ساز پہ چھیڑی ہوئی غزل
جانِ بہار تم کسی شاعر کا خواب ہو
(فلم: چودھویں کا چاند، ۱۹۶۰ء)

دل خاک ہو گیا یہ کسی کو خبر نہیں سب یہ سمجھ رہے ہیں تمنا نکل گئی (فلم: بابل، ۱۹۵۰ء)
نہ جانے کیوں بدلتی جارہی ہے زندگی میری میں دل سے بے خبر، دل مجھ سے غافل ہوتا جاتا ہے
(فلم: دیدار، ۱۹۵۱ء)

کیوں تم نے لگائے ہیں یہاں ظلم کے ڈیرے
دھن ساتھ نہ جائے گا، بنے کیوں ہو لٹیرے
پیتے ہو غریبوں کا لہو شام سویرے
خود پاپ کرو نام ہو شیطان کا بدنام۔ انسان بنو (فلم: بیجو باورا، ۱۹۵۲ء)

نہ روا ے دل کہیں رونے سے تقدیریں بدلتی ہیں کہیں آنسو بہانے سے تمنائیں نکلتی ہیں
(فلم: اڑن کھٹولا، ۱۹۵۵ء)

چلو اچھا ہوا اپنوں میں کوئی غیر تو نکلا اگر ہوتے سبھی اپنے تو بیگانے کہاں جاتے
تمہیں نے غم کی دولت دی بڑا احسان فرمایا زمانے بھر کے آگے ہاتھ پھیلانے کہاں جاتے
(فلم: امر، ۱۹۵۲ء)

ذلت سے ہیرے موتی بھی مالک قسم نہ لیں　　نفرت سے گر ملے تو محبت بھی ہم نہ لیں
عزت سے جو نہ دیکھے ہمیں اُس نظر سے کیا　　محلوں میں رہنے والے ہمیں تیرے در سے کیا
(فلم: شباب، ۱۹۵۴ء)

تمنا ہے یہی اب تو مراسر ہو تر اور ہو　　نہ آنسو کوئی آنکھوں میں نہ شکوہ کوئی لب پر ہو
اگر یوں موت آجائے تو اپنے دل سے غم نکلے
(فلم: شباب، ۱۹۵۴ء)

ہمارے پیار کے قصے سنائے جائیں گے　　یہ گیت سارے زمانے میں گائے جائیں گے
ہم نہ ہوں گے، فسانہ ہوگا، آنے والے کو آنا ہوگا
(فلم: سوہنی مہینوال، ۱۹۵۸ء)

حسن والے تری دنیا میں کوئی آیا ہے　　تیرے دیدار کی حسرت بھی کوئی لایا ہے
توڑ دے، توڑ دے پردے کا چلن آج کی رات
(فلم: کوہ نور، ۱۹۶۰ء)

سنا ہے جام الفت میں بلا کا جوش ہے ساقی　　ابھی تو دل ہے قابو میں ابھی تو ہوش ہے باقی
اگر پی کر بہک اٹھے تو مستانوں کا کیا ہوگا
(فلم: کوہ نور، ۱۹۶۰ء)

وہ دن کدھر گئے کہو وہ دن کدھر گئے　　آیا مری وفا کا نہ تم کو خیال کیوں
تم سے چھپا ہوا ہے مرے دل کا حال کیوں　　پوچھا نہ مجھ سے ہائے کہ دل ہے نڈھال کیوں
کیسے زمانے آئے اور آ کر گزر گئے　　وہ دن کدھر گئے کہو وہ دن کدھر گئے
(فلم: سنگھار، ۱۹۴۹ء)

ارمان بھرے دل کی لگن تیرے لئے ہے　　نگری مرے جیون کی سجن تیرے لئے ہے
لوٹا ہے مرے دل نے محبت کا خزانہ　　جو تیری کہانی ہے وہی میرا افسانہ
یہ پھول، یہ خوشبو، یہ چمن تیرے لئے ہے
(فلم: جان پہچان، ۱۹۵۰ء)

وہ صبح کبھی تو آئے گی

شکیل بدایونی نے لکھا　　　جفاؤں پر ملال آتا تو ہوگا۔

فلم کے پروڈیوسر نے کہا کہ یہ مصرعہ اچھا نہیں

ساحر لدھیانوی نے لکھا　　　پھر نہ کیجئے مری گستاخ نگاہی کا گلہ

فلم کے پروڈیوسر نے کہا کہ ساحر صاحب نے لکھا ہے تو اچھا ہی ہوگا۔

اس صنعت میں اپنا مقام بنانے کے لئے ساحر کو ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ آئے اور چھا گئے۔ آدھی صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، ان کا شروع شروع کا لکھا ہوا نغمہ آج تک زندہ ہے

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں

رُت ہے جواں، ان کو یہاں کیسے بُلائیں

کہتے ہیں کہ ساحر اپنے دوستوں کے ساتھ تھے اور کوئی فلمی گانا بج رہا تھا جس کے بول اتنے ناقص تھے کہ ساحر کہہ اٹھے "بمبئی کو میری ضرورت ہے۔"

وہ اپنا پسندیدہ شہر لاہور چھوڑ کر اُس وقت کے بمبئی اور آج کے ممبئی جا پہنچے۔ اُن دنوں ،ام دریانی فلم ترانہ بنا رہے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ساحر نے ایک فلمی شاعر کو گانے کے بول لکھ کر دیئے تا کہ بطور نمونہ ترانہ کی پروڈکشن ٹیم کو دکھایا جائے اور اس طرح ساحر کو وہاں داخلہ مل جائے۔ شاعر صاحب نے بول پڑھے تو ان کی رال ٹپک پڑی اور

انہوں نے وہ نغمہ فوراً اپنے نام سے داخل کر دیا جو جھٹ منظور کر لیا گیا۔ اس طرح عام نوعیت کے گیت لکھنے والے شاعر صاحب کے نام ایک نہایت نفیس نغمہ فلم ترانہ کی تاریخ میں لکھا گیا۔

مگر تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنانے کے قائل ساحر لدھیانوی کے دروازے پر تقدیر مسلسل دستک دیئے جا رہی تھی۔ ان ہی دنوں کاردار پروڈکشن والے فلم نوجوان بنا رہے تھے اور دیو آنند اور گرودت فلم بازی کی تیاری میں مصروف تھے۔ دونوں فلموں کے میوزک ڈائریکٹر ایس ڈی برمن تھے۔ اس ٹولی نے ساحر لدھیانوی کے لئے بانہیں کھول دیں اور پھر تو ایسی ایسی بے مثال فلمیں بنیں کہ جن کا جواب پھر کبھی نہ بن سکا۔ ساحر کے لکھے ہوئے نغموں کو بے پناہ شہرت ملی، اتنی کہ آگے چل کر ایس ڈی برمن جیسے بزرگ اور عظیم موسیقار ساحر کی شہرت سے جلنے لگے۔ انہیں اعتراض تھا کہ نغمہ نگاروں کو میوزک ڈائریکٹر سے زیادہ شہرت مل رہی ہے۔

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت تک ریڈیو والے جب کوئی نغمہ نشر کرتے تو نغمہ نگار کا نام نہیں بتاتے تھے۔ کسی نے ساحر کو توجہ دلائی۔ اُس وقت تک ساحر کے نغموں کی طرح ان کی بد دماغی کی بھی شہرت ہو چکی تھی۔ وہ ریڈیو والوں کے پاس پہنچے اور کہا کہ آئندہ نغمہ نگاروں کا نام نشر نہ کیا گیا تو ان سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

ریڈیو والوں نے ہاتھ جوڑ لئے۔

ساحر کا ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جانا بے سبب نہ تھا۔

وہ مارچ ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا نام عبدالحئ تھا، نام تو خیر جیسا بھی تھا مگر بچپن کچھ بہت خوشگوار نہیں تھا۔ ماں باپ کے تعلقات خراب تھے۔ باپ دوسری شادی کی فکر میں تھے اور ماں یہ سارا جھنجھٹ چھوڑ کر نکل جانا چاہتی تھیں۔ یہی ہوا۔ ساحر تیرہ برس کے تھے کہ باپ نئی دلہن بیاہ لائے اور ماں نے بیٹے کی انگلی تھامی اور شوہر کی دولت کو ٹھکرا کر نکل گئیں۔ اس کے بعد بچے کی تحویل کے لئے کھینچا تانی شروع ہوئی اور ساحر کو باپ کی پہنچ سے باہر رکھا گیا۔ مگر مفلسی وہاں جا پہنچی اور

ماں نے جیسے بھی بن پڑا ساحر کو اسکول کی تعلیم دلوائی۔ کالج پہنچتے پہنچتے یہ ہوا کہ ساحر اپنا کلام پڑھا کرتے تھے اور لڑکیاں اُن پر صدقے قربان ہوا کرتی تھیں۔ ان لڑکیوں میں امریتا پریتم بھی تھیں۔ وہ سکھ تھیں، ساحر مسلمان تھے اور امریتا کے باپ سخت روایتی باپ نکلے۔ انہوں نے پرنسپل سے کہہ سن کر ساحر کو اس بنیاد پر کالج سے نکلوا دیا کہ وہ پرنسپل کے لان میں بیٹھ کر لڑکیوں سے باتیں کرتے ہیں۔

کالج اور لدھیانہ سے نکل کر وہ لاہور چلے گئے اور اپنا پہلا مجموعہ کلام "تلخیاں" ترتیب دیا۔ یہ تو ہو گیا پر اب اشاعت کے لئے پبلشر درکار تھا۔ جتنے ناشر بدنصیب تھے، کتاب چھاپنے سے انکار کرتے رہے۔ دو سال بعد تلخیاں کی اشاعت کی نوبت آئی۔ دنیا پر پہلی بار کھلا کہ لاہور میں ایک غضب کا ہونہار شاعر وارد ہوا ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی کُھلا کہ اس شاعر کے کلام سے انقلاب کی بُو آتی ہے۔ ساحر ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے اور سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کے جذبات ایک روز بھی چھپا کر نہیں رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان اُن کو اور وہ پاکستان کو راس نہ آئے اور اس سے پہلے کہ وہ جیل جاتے، وہ راتوں رات دلّی چلے گئے۔

۱۹۴۹ء کے قریب وہ بمبئی پہنچے جہاں ان ہی جیسے کچھ انقلابی 'آزادی کی راہ پر' کے عنوان سے فلم بنا رہے تھے۔ ساحر نے اس فلم کے لئے چار نغمے لکھے۔ ایک نغمے کا پہلا بول (فلم کی اصطلاح میں مکھڑا) تھا: بدل رہی ہے زندگی۔

عجیب زمانہ ہوگا، کسی نے اس فلم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ فلم کہاں گئی، نغمے کیا ہوئے۔ کسی کو خبر نہیں۔ البتہ اس کے بعد فلم نوجوان، بازی، جال، ٹیکسی ڈرائیور، دیوداس، گھر نمبر چوالیس اور منیم جی جیسی کچھ سنجیدہ اور کچھ چلتی ہوئی فلموں میں ساحر لدھیانوی، ہی ساحر لدھیانوی تھے۔

یہ سلسلہ سن ۸۰ء تک چلا۔ وہی اُن کی عمر کا آخری برس تھا۔

ساحر کی نجی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساحر سے زیادہ سحر تھے۔ وقت اور حالات نے اُن پر جادو کیا ہوا تھا۔ نوعمری کی الجھنوں سے لے کر جوانی کے

معاشقوں تک سب ہی اُن کو عمر بھر ستاتے رہے۔

ان کی عادتیں دنیا زمانے سے نرالی تھیں مثلاً تھوڑی دیر بعد ہاتھ دھوتے تھے (جدید طبّی علوم کے مطابق یہ عادت نہیں بلکہ بیماری ہے) جس صابن کی بٹّی سے ایک بار نہا لیتے اُسے دوبارہ استعمال نہ کرتے، کبھی یہ نہ طے کر پاتے کہ کون سے کپڑے پہنیں، ہر بار یہ فرض بوڑھی ماں کو ادا کرنا پڑتا۔ اپنی تحریروں میں بری طرح کانٹ چھانٹ کیا کرتے۔

ان کے نغموں کے مجموعے " گاتا جا بنجارا" کے ۱۹۹۶ء کے ایڈیشن کے دیباچے میں اردو کے نقّاد اظہر غوری نے بھی کچھ دلچسپ اشارے کئے ہیں۔ مثلاً ساحر بزدل بھی تھے، عمر بھر ہوائی جہاز میں اس خوف سے نہیں بیٹھے کہ گر جائے گا۔ کبھی کسی خاتون سے ملنے جاتے تو ساتھ میں کسی دوست کو ضرور لے جاتے تھے، اور جب کبھی کسی خاتون کا ان کی جانب جھکاؤ ہوتا تو بچ نکلنے کے راستے ڈھونڈنے لگتے۔

اگر کسی سے ٹوٹ کر عشق کیا تو وہ پنجابی کی ادیبہ امرتا پریتم اور مشہور گلوکارہ سدھا ملہوترا تھیں۔ دونوں غیر مسلم تھیں اور دونوں کے باپ کسی مسلمان سے شادی کے لئے تیار نہیں تھے۔ امرتا پریتم کے باپ کو یہ اعتراض تھا کہ ساحر اول تو مسلمان ہے، دوسرے فلمی شاعر ہے، خود بھی فاقے کرے گا اور ان کی بیٹی کو بھی بھوکا مارے گا۔ جہاں تک مسلمان ہونے کا تعلق تھا، ساحر لاکھ کہا کرتے تھے کہ وہ لادین ہیں مگر کون سنتا ہے، اور جہاں تک غریب ہونے کا تعلق ہے تو سنا ہے کہ جب اپنا مکان بنوانے لگے تو معمار کو سختی سے ہدایت کی کہ ان کا مکان امرتا پریتم کے باپ کے مکان سے اونچا ہونا چاہیئے۔

امرتا پریتم سے ملاقات ہوتی تو دونوں گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے۔ ساحر اس دوران سگریٹیں پھونکتے رہتے۔ ان کے جانے کے بعد امرتا بچی ہوئی سگریٹوں کے کش لیتی رہتیں۔ کسی اخباری کانفرنس میں کاغذ قلم لئے بیٹھی تھیں، دھیان کہیں اور تھا۔ کاغذ پر سینکڑوں بار ساحر ساحر لکھا۔

سدھا ملہوترا کے لئے دو یادگار گانے لکھے ؎ سلام حسرت قبول کر لو، میری محبت قبول کر لو۔ اور دوسرا دل کو چھو لینے والا نغمہ ؎ تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو،

میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے۔

سب ہوا مگر عمر بھر کنوارے رہے۔ ان کے چڑچڑے پن کے اور بھی اسباب ہوں گے مگر یہ تنہائی اُن کو مار گئی۔

ساحر نے بہت سے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا جن میں روی، برمن، روشن، خیام اور او پی نیّر شامل ہیں۔ ان کے زیادہ تر نغمے محمد رفیع اور لتا منگیشکر نے گائے۔ خصوصاً لتا کا بڑا نام تھا مگر ساحر نغمہ اس شرط پر لکھتے تھے کہ انہیں لتا کو ملنے والے معاوضے سے ایک روپیہ زیادہ ملے گا—— وہ ملتا تھا۔

اصول پرست تھے۔ رمیش سہگل فلم 'پھر صبح ہوگی' بنا رہے تھے جس کی کہانی روسی مصنف دوستوفسکی کے مشہور ناول 'جزا و سزا' سے لی گئی تھی۔ اس عظیم کہانی کے نغمے ساحر لکھ رہے تھے اور خیال تھا کہ ان کی طرزیں شنکر جے کشن سے بنوائی جائیں گی۔ ساحر اڑ گئے کہ جس نے یہ ناول پڑھا ہو صرف وہی طرزیں بنا سکتا ہے۔ ساحر کا خیال سو فیصد درست تھا۔ موسیقار خیام دوستوفسکی کے مداح نکلے اور انہوں نے ایسی طرزیں مرتّب کیں کہ کئی زمانے یاد رکھیں گے ؎ وہ صبح کبھی تو آئے گی۔

آیئے اس پس منظر میں ساحر کے شروع کے آٹھ دس برسوں کے نغموں پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ اُن کی شخصیت کے بطن سے کیسے کیسے شعر پیدا ہوئے۔

۱۹۵۱ء فلم نوجوان۔ موسیقار: ایس ڈی برمن۔

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں رت ہے جواں، اُن کو یہاں کیسے بُلائیں
کہا بھی نہ جائے، رہا بھی نہ جائے تم سے اگر، ملے بھی نظر، ہم جھینپ جائیں

......

دل کا درد نہ جانے دنیا، جانے دل تڑپانا پیار کے دو بولوں کے بدلے دشمن ہوا زمانہ
امید نے ٹھوکر کھائی ہے، دل دے کے جدائی پائی ہے پہلے سے نہ تھا یہ جانا، پہلے سے نہ تھا یہ جانا
کہ دل کا آنا، ہے جی سے جانا، ہائے رے ہائے دشمن ہوا زمانہ

۱۹۵۱ء فلم بازی۔ موسیقار: ایس ڈی برمن۔

سنو گجر کیا گائے، سمے گزرتا جائے اورے جینے والے، اورے بھولے بھالے سونا نہ، کھونا نہ

بچھڑا زمانہ کبھی ہاتھ نہ آئے گا   دوش نہ دینا مجھے پھر پچھتائے گا

اورے جینے والے، اورے بھولے بھالے، سونا نہ، کھونا نہ

......

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے اپنے پہ بھروسا ہے تو یہ داؤ لگالے

ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں   انصاف تیرے ساتھ ہے، الزام اٹھالے

۱۹۵۲ء فلم جال۔ موسیقار: ایس ڈی برمن۔

یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں، سن جا دل کی داستاں

چاندنی راتیں، پیار کی باتیں، کھو گئیں جانے کہاں

آتی ہے صدا تیری ٹوٹے ہوئے تاروں سے   آہٹ تیری سنتی ہوں خاموش نظاروں سے

بھیگی ہوا، اودی گھٹا، کہتی ہے تیری کہانی   تیرے لئے بے چین ہے شعلوں میں لپٹی جوانی

سینے میں بل کھا رہا ہے دھواں   سُن جا دل کی داستاں

لہروں کے لبوں پر ہیں کھوئے ہوئے افسانے   گلزار امیدوں کے، سب ہو گئے ویرانے

تیرا پتہ پاؤں کہاں سونے ہیں سارے ٹھکانے   جانے کہاں گُم ہو گئے جا کے وہ اگلے زمانے

برباد ہے آرزو کا جہاں   سُن جا دل کی داستاں

......

پگھلا ہے سونا دور گگن پر   پھیل رہے ہیں شام کے سائے

خاموشی کچھ بول رہی ہے   بھید انوکھے کھول رہی ہے

پنکھ پکھیرو سوچ میں گم ہیں   پیڑ کھڑے ہیں سیس جھکائے

دھندلے دھندلے مست نظارے   اڑتے بادل، مُڑتے دھارے

چھپ کے نظر سے جانے یہ کس نے رنگ رنگیلے کھیل رچائے
کوئی بھی اس کا راز نہ جانے ایک حقیقت لاکھ فسانے
ایک ہی جلوہ شام سویرے بھیس بدل کر سامنے آئے
پگھلا ہے سونا دور گگن پر پھیل رہے ہیں شام کے سائے

......

آشا: چاہے کتنا مجھے تم بلاؤ نہیں بولوں گی
طلعت: بول نہ بول اے جانے والے سن تو لے دیوانوں کی
اب نہیں دیکھی جاتی ہم سے یہ حالت ارمانوں کی
حسن کے کھلتے پھول ہمیشہ بے دردوں کے ہاتھ بِکے
اور چاہت کے متوالوں کو دھول ملی ویرانوں کی

......

۱۹۵۴ء فلم انگارے۔ موسیقار: ایس ڈی برمن

طلعت: تیرے ساتھ چل رہے ہیں یہ زمیں یہ چاند تارے
لتا: یہ زمیں یہ چاند تارے تیری اک نظر پہ وارے
طلعت: میرے لب پہ آتے آتے کوئی بات رہ گئی ہے
لتا: میں چلی ہوں میری دنیا تیرے ساتھ رہ گئی
میں بسی ہوئی ہوں تجھ میں مجھے کس لئے پکارے

۱۹۵۴ء فلم ٹیکسی ڈرائیور۔ موسیقار: ایس ڈی برمن

جائیں تو جائیں کہاں سمجھے گا کون یہاں درد بھرے دل کی زباں
مایوسیوں کا مجمع ہے جی میں کیا رہ گیا ہے اس زندگی میں روح میں غم دل میں دھواں
اپنا بھی غم ہے ان کا بھی غم ہے اب دل کے بچنے کی امید کم ہے اک کشتی، سو طوفاں

۱۹۵۵ء فلم دیوداس ۔ موسیقار: ایس ڈی برمن
وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ ہم بُلائیں   میری حسرتوں سے کہہ دو کہ یہ خواب بھول جائیں
اگر اس جہاں کا مالک کہیں مل سکے تو پوچھوں   ملیں کون سی خطا پر ہمیں اس قدر سزائیں
تیری بے رخی کے صدقے میری زندگی کی خوشیاں   تو اگر اسی میں خوش ہے، تو خوشی سے کر جفائیں

......

جسے تو قبول کر لے وہ ادا کہاں سے لاؤں   ترے دل کو جو لبھائے وہ صدا کہاں سے لاؤں
میں وہ پھول ہوں کہ جس کو گیا ہے کوئی مسل کے   مری عمر بہہ گئی ہے مرے آنسوؤں میں ڈھل کے
جو بہار بن کے برسے وہ گھٹا کہاں سے لاؤں   جسے تو قبول کر لے وہ ادا کہاں سے لاؤں
مری بے بسی ہے ظاہر مری آہِ بے اثر سے   کبھی موت بھی جو مانگی تو نہ پائی اُس کے در سے
جو مراد لے کے آئے وہ دعا کہاں سے لاؤں   جسے تو قبول کر لے وہ ادا کہاں سے لاؤں

۱۹۵۵ء فلم گھر نمبر چوالیس ۔ موسیقار: ایس ڈی برمن
پھیلی ہوئی ہیں سپنوں کی باہیں آ جا چل دیں کہیں دور
وہیں مری منزل، وہیں تیری راہیں، آ جا چل دیں کہیں دور
اونچی گھٹا کے سائے تلے چھپ جائیں، دھندلی فضا میں کچھ کھوئیں کچھ پائیں
دھڑکن کی لے پر کوئی ایسی دھن گائیں، دے دے جو دل کو دل کی پناہیں
آ جا چل دیں کہیں دور
جھولا دھنک کا دھیرے دھیرے ہم جھولیں، امبر تو کیا ہے تاروں کے بھی لب چھولیں
مستی میں جھولیں اور سارے غم بھولیں، پیچھے نہ دیکھیں مڑ کے نگاہیں
آ جا چل دیں کہیں دور

......

چپ ہے دھرتی چپ ہیں چاند ستارے
میرے دل کی دھڑکن تجھ کو پکارے
کھوئے کھوئے سے یہ مست نظارے
ٹھہرے ٹھہرے سے یہ رنگ کے دھارے
ڈھونڈ رہے ہیں، تجھ کو ساتھ ہمارے
میرے دل کی دھڑکن تجھ کو پکارے
کونے کونے مستی پھیل رہی ہے
بانہیں بن کر ہستی پھیل رہی ہے
تجھ بن ڈوبے دل کو کون ابھارے
میرے دل کی دھڑکن تجھ کو پکارے
نکھرا نکھرا سا ہے چاند کا جوبن
بکھرا بکھرا سا ہے نور کا دامن
آ جا میری تنہائی کے سہارے
میرے دل کی دھڑکن تجھ کو پکارے

......

تری دنیا میں جینے سے تو بہتر ہے کہ مر جائیں
وہی آنسو، وہی آہیں، وہی غم ہے جدھر جائیں
کوئی تو ایسا گھر ہوتا جہاں سے پیار مل جاتا
وہی بیگانے چہرے ہیں، جہاں پہنچیں، جدھر جائیں
ارے او آسماں والے بتا اِس میں بُرا کیا ہے
خوشی کے چار جھونکے گر ادھر سے بھی گزر جائیں

۱۹۵۵ء فلم جورو کا بھائی۔ موسیقار: جے دیو

سرمئی رات ہے ستارے ہیں
آج دونوں جہاں ہمارے ہیں
صبح کا انتظار کون کرے
پھر یہ رُت، یہ سماں ملے نہ ملے
آرزو کا چمن کھلے نہ کھلے
وقت کا اعتبار کون کرے
لے بھی لو ہم کو اپنی بانہوں میں
روح بے چین ہے نگاہوں میں
التجا بار بار کون کرے

۱۹۰۰ء فلم میرین ڈرائیو۔ موسیقار: این دتہ

اب وہ کرم کریں کہ ستم، میں نشے میں ہوں
مجھ کو نہ کوئی ہوش نہ غم، میں نشے میں ہوں

وہ بے وفا ہے، اب بھی یہ دل مانتا نہیں
کمبخت نا سمجھ ہے، انہیں جانتا نہیں
میں آج توڑ دوں گا بھرم، میں نشے میں ہوں

۱۹۵۵ء فلم منیم جی۔ موسیقار: ایس ڈی برمن

جیون کے سفر میں راہی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو
رو رو کے ان ہی راہوں میں کھونا پڑا اک اپنے کو ہنس ہنس کے ان ہی راہوں میں اپنایا ہے بیگانے کو
اب ساتھ نہ گزریں گے ہم لیکن یہ فضا وادی کی دہراتی رہے گی برسوں، بھولے ہوئے افسانے کو
تم اپنی نئی دنیا میں کھو جاؤ پرائے بن کر جی پائے تو ہم جی لیں گے مرنے کی سزا پانے کو

......

آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو کہاں تم ابھی تھے یہاں
میرے پہلو میں تاروں نے دیکھا تمہیں بھیگے بھیگے نظاروں نے دیکھا تمہیں
تم کو دیکھا کئے یہ زمیں آسماں تم ابھی تھے یہاں
ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں پہ ہیں انگلیوں کے نشاں☆ تم ابھی تھے یہاں
تم جدا ہو کے بھی میری راہوں میں ہو گرم اشکوں میں ہو سرد آہوں میں ہو
چاندنی میں جھلکتی ہیں پرچھائیاں تم ابھی تھے یہاں

۱۹۵۵ء فلم ریلوے پلیٹ فارم۔ موسیقار: مدن موہن

بستی بستی، پربت پربت گاتا جائے بنجارا لے کر دل کا اکتارا

☆ دلکش نغمے کا یہ مصرعہ " گاتا جائے بنجارا" کے ابتدائی ایڈیشن میں یوں تھا ابھی بانہوں پہ ہیں انگلیوں کے نشاں۔ خدا جانے فلم میں کس نے کس کے کہنے پر اس مصرعے کا چہرہ بگاڑ دیا۔ ر ع

دھن دولت کے پیچھے کیوں ہے یہ دنیا دیوانی یہاں کی دولت یہیں رہے گی ساتھ نہیں یہ جانی
سونے چاندی میں تُلتا ہو جہاں دلوں کا پیار آنسو بھی بیکار وہاں پر آہیں بھی بیکار
دنیا کے بازار میں آخر چاہت بھی بیوپار بنی میرے دل سے اُن کے دل تک چاندی کی دیوار بنی
ہم جیسوں کے بھاگ میں لکھا چاہت کا وردان نہیں جس نے ہم کو جنم دیا وہ پتھر ہے بھگوان نہیں

۱۹۵۶ء فلم چندر کانت ۔ موسیقار: این دتہ
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
کسی گیسو، کسی آنچل کا سہارا بھی نہیں راستے میں کوئی دھندلا سا ستارہ بھی نہیں
میری نظروں نے نظاروں کی تمنا کی تھی میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
دل میں ناکام امیدوں کے بسیرے پائے روشنی لینے کو نکلا تو اندھیرے پائے
رنگ اور نور کے دھاروں کی تمنا کی تھی میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
پیار مانگا تو سسکتے ہوئے ارمان ملے چین چاہا تو اُمڈتے ہوئے طوفان ملے
ڈوبتے دل نے کناروں کی تمنا کی تھی میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

۱۹۵۷ء فلم نیا دور ۔ موسیقار: او پی نیّر
ساتھی ہاتھ بڑھانا ایک اکیلا تھک جائے گا مل کر بوجھ اٹھانا
ساتھی ہاتھ بڑھانا
ایک سے ایک ملے تو قطرہ بن جاتا ہے دریا ایک سے ایک ملے تو ذرّہ بن جاتا ہے صحرا
ایک سے ایک ملے تو رائی بن سکتی ہے پربت ایک سے ایک ملے تو انسان بس میں کر لے قسمت
ساتھی ہاتھ بڑھانا
ماٹی سے ہم لعل نکالیں موتی لائیں جل سے جو کچھ اس دنیا میں بنا ہے، بنا ہمارے بل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں
ساتھی ہاتھ بڑھانا

۱۹۵۸ء فلم لائٹ ہاؤس۔ موسیقار: این دتہ

تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم
گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم
او آسمان والے، کبھی تو نگاہ کر کب تک یہ ظلم سہتے رہیں خامشی سے ہم

۱۹۵۷ء فلم پیاسا۔ موسیقار: ایس ڈی برمن

اس فلم کے بارے میں عام خیال ہے کہ ساحر کی اپنی زندگی کی کہانی تھی۔ اس میں ساحر اپنی بڑی نظمیں لے کر آئے جن میں عوام کے خیال سے ذرا سہولت پیدا کر دی گئی مثلاً "ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں" کو تبدیل کر دیا گیا: جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں۔ فلم کے ایک سُبک گانے "جانے کیا تو نے کہی" کی طرز ایس ڈی برمن کے اپنے ایک بنگالی گانے کی دھن سے لی گئی جس پر ساحر نے لفظ بٹھاتے ہوئے نازک خیالی کا حیران کن مظاہرہ کیا۔

جانے کیا تو نے کہی جانے کیا میں نے سُنی بات کچھ بن ہی گئی
سنسناہٹ سی ہوئی تھرتھراہٹ سی ہوئی جاگ اٹھے خواب کئی
نین جھک جھک کے اٹھے پاؤں رک رک کے اٹھے آ گئی چال نئی
زلف شانے پہ مُڑی ایک خوشبو سی اڑی کھل گئے راز کئی
بات کچھ بن ہی گئی جانے کیا تو نے کہی

......

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا
بچھڑ گیا ہر ساتھی دے کر پل دو پل کا ساتھ کس کو فرصت ہے جو تھامے دیوانوں کا ہاتھ
ہم کو اپنا سایہ تک اکثر بیزار ملا

اس کو ہی جینا کہتے ہیں تو یوں ہی جی لیں گے   اف نہ کریں گے لب سی لیں گے آنسو پی لیں گے
غم سے اب گھبرانا کیسا غم سو بار ملا

......

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بدنام بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے، یہ سودوں پر تکرار
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بیباک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ بیمار چہرے
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
جنہیں ناز ہے ہند پر ان کو لاؤ
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں

......

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے
ہر اک جسم گھایل، ہر اک روح پیاسی
نگاہوں میں الجھن دلوں میں اداسی
یہ دنیا ہے یا عالم بدحواسی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے
یہاں اک کھلونا ہے انساں کی ہستی
یہ بستی ہے مردہ پرستوں کی بستی
یہاں پر تو جیون سے ہے موت سستی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے
جلا دو اسے، پھونک ڈالو یہ دنیا
مرے سامنے سے ہٹا لو یہ دنیا
تمہاری ہے، تم ہی سنبھالو یہ دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

......

فلم پیاسا کے دو گیت بہت مقبول ہوئے:

ہم آپ کی آنکھوں میں اس دل کو بسا دیں تو؟
ہم موند کے پلکوں کو اس دل کو سزا دیں تو؟

......

آج سجن موہے انگ لگا لو، جنم سپھل ہو جائے
ہردے کی پیڑا، دیہہ کی اگنی، سب شیتل ہو جائے

......

۱۹۵۸ء فلم پھر صبح ہوگی۔ موسیقار: خیام

پھر نہ کیجئے میری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو
میں کہاں تک نہ نگاہوں کو پلٹنے دیتی
آپ کے دل نے کئی بار پکارا مجھ کو
ایک یوں ہی سی نظر دل کو جو چھو لیتی ہے
کتنے ارمان جگاتی ہے تمہیں کیا معلوم
روح بے چین ہے قدموں سے لپٹنے کے لئے
تم کو ہر سانس بلاتی ہے تمہیں کیا معلوم

......

وہ صبح کبھی تو آئے گی
ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے، جب سکھ کا ساگر چھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
جس صبح کی خاطر جگ جگ سے ہم سب مر مر کر جیتے ہیں
جس صبح کے امرت کی دُھن میں ہم زہر کے پیالے پیتے ہیں
ان بھوکی پیاسی روحوں پر اک دن تو کرم فرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
مانا کہ ابھی تیرے میرے ارمانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں

مٹی کا بھی ہے کچھ مول مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
انسانوں کی عزت جب جھوٹے سکّوں میں نہ تولی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
دولت کے لئے جب عورت کی عصمت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کچلا جائے گا، غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب یہ دنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

......

دو بوندیں ساون کی
اک ساگر کی سیپ میں ٹپکے اور موتی بن جائے
دوجی گندے جل میں گر کر اپنا آپ گنوائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو بوندیں ساون کی

دو کلیاں گلشن کی
اک سہرے کے بیچ گندھے اور من ہی من اترائے
اک ارتھی کی بھینٹ چڑھے اور دھولی میں مل جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو کلیاں گلشن کی

دو سکھیاں بچپن کی
ایک سنگھاسن پر بیٹھے اور روپ متی کہلائے
دوجی اپنے روپ کے کارن گلیوں میں بِک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو سکھیاں بچپن کی

۱۹۵۸ء فلم سادھنا۔ موسیقار: این دتّہ
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا
تُلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا

۱۹۵۸ء فلم سونے کی چڑیا۔ موسیقار: او پی نیّر
رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا کس کے روکے رکا ہے سویرا
لب پہ شکوہ نہ لا، اشک پی لے جس طرح بھی ہو کچھ دیر جی لے
اب اکھڑنے کو ہے غم کا ڈیرا کس کے روکے رُکا ہے سویرا

......

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرّا جائیں اور تری مرمریں بانہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش سیاہ راتوں میں اور ترے ریشمی آنچل کا کنارہ نہ ملے

۱۹۵۹ء فلم دھول کا پھول۔ موسیقار: این دتّہ
تو میرے پیار کا پھول ہے، کہ میری بھول ہے، کچھ کہہ نہیں سکتی
پر کسی کا کیا تو بھرے، یہ سہہ نہیں سکتی
پوچھے گا کوئی تو کسے باپ کہے گا، جگ تجھے پھینکا ہوا پاپ کہے گا
بن کے رہے گی شرمندگی، تری زندگی، جب تک تو جیئے گا
آج پلاؤں تجھے دودھ میں، کل زہر پیئے گا

۱۹۵۹ء فلم دیدی۔ موسیقار: سدھا ملہوترا

سُدھا: تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے
میرے دل کی، مرے جذبات کی قیمت کیا ہے الجھے الجھے سے خیالات کی قیمت کیا ہے
میں نے کیوں پیار کیا، تم نے نہ کیوں پیار کیا ان پریشان خیالات کی قیمت کیا ہے
تم جو یہ بھی نہ بتاؤ تو یہ حق ہے تم کو میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے
مکیش: زندگی صرف محبت نہیں کچھ اور بھی ہے زلف و رخسار کی جنت نہیں کچھ اور بھی ہے
بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی اس دنیا میں عشق ہی ایک حقیقت نہیں، کچھ اور بھی ہے
تم اگر آنکھ چراؤ تو یہ حق ہے تم کو میں نے تم سے ہی نہیں، سب سے محبت کی ہے

۱۹۶۰ء فلم بابر۔ موسیقار: روشن

سُدھا: سلام حسرت قبول کرلو میری محبت قبول کرلو
اداس نظریں تڑپ تڑپ کر تمہارے جلوؤں کو ڈھونڈتی ہیں
جو خواب کی طرح کھو گئے اُن حسین لمحوں کو ڈھونڈتی ہیں
اگر نہ ہو ناگوار تم کو تو یہ شکایت قبول کرلو

یہ ہیں ساحر کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے بدلتے ہوئے رنگ اور شاید ان نغموں میں جو تاثیر ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ انہوں نے اپنے دل کے حادثوں کو اپنے شعروں میں ڈھالا۔

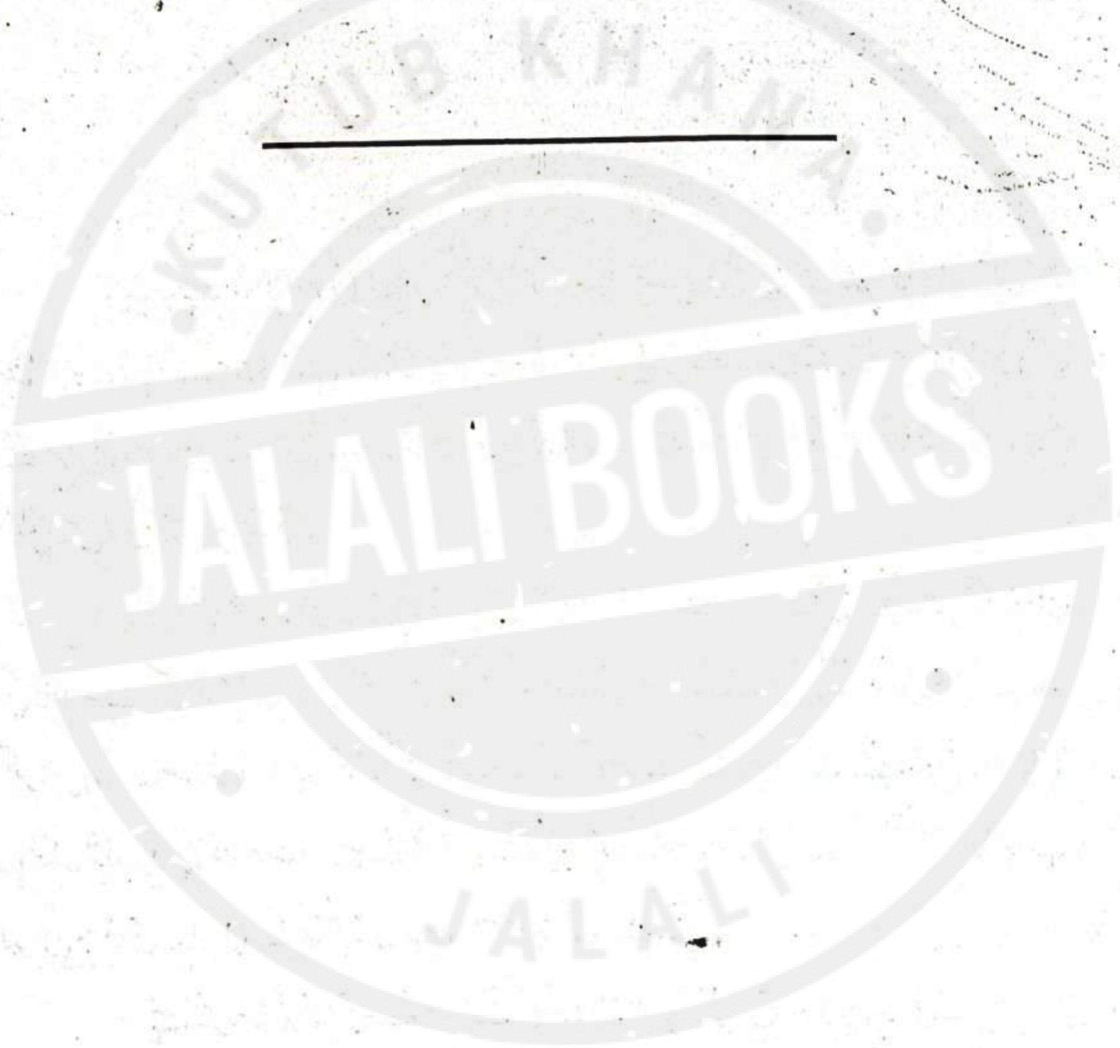
ساحر کی زبان کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے لکھتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ کوئی لفظ یا کوئی محاورہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس خیال پر انہوں نے اپنی شاعری قربان نہیں کی۔ انہوں نے اپنے مصرعوں میں روزمرہ کو بڑی خوبی سے برتا

میں دیکھوں تو سہی دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لئے اپنی نگہبانی مجھے دے دو

اس غزل میں ساحر کی عورت اچانک کیسی دلیر ہو گئی، حیرت ہے!

فلم کی جس سچویشن میں ایک دکھیاری ماں اپنے ناجائز بچے کو گا کر سلانے کی کوشش کر رہی ہے اُس گانے کے بول ساحر نے لکھے کوئی دوسرا مشکل ہی سے لکھ پائے گا۔

ساحر جلد ہی مر گئے مگر کچھ ایسے بھی نہیں مرے۔ اُن کے روشن سویرے کے خوابوں کی سانس کی گرمی آج بھی رخساروں کو چھوتی محسوس ہوتی ہے۔ بہت قریب سے!



رہیں نہ رہیں ہم، مہکا کریں گے

یہ بات ۱۹۴۵ء کی ہے۔ بمبئی میں سابو صدیق انسٹی ٹیوٹ گراؤنڈ میں بڑا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے تمام سرکردہ شاعر شریک تھے۔ اُن میں جگر مرادآبادی بھی تھے جو اپنی عادت کے مطابق ایک شاگرد کو ساتھ لائے تھے۔ گمنام سا شاگرد تھا جسے کم سے کم بمبئی میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

اِس مشاعرے کی بڑی خوبی یہ تھی اس کی نظامت ساغر نظامی کر رہے تھے۔ ان کی نظامت کے انداز کی بڑی دھوم تھی۔ محفل کو لوٹ لیا کرتے تھے اپنی پُر لطف باتوں سے۔ مگر اس رات معاملہ ذرا جدا تھا۔ مجمع سنجیدہ نہ تھا، آوازے کسے جا رہے تھے، مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ شاعر تو اپنا کلام سنا رہے تھے مگر مجمع سننے پر آمادہ نہ تھا۔ مشاعرے کے منتظم سیّد شہاب الدین دسنوی بے بسی کے عالم میں یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

ایسے میں ساغر نظامی نے جگر کے شاگرد کا نام لیا: مجروح سلطان پوری۔

نوجوان شاعر نہایت سکون سے چلتا ہوا مائیکروفون تک آیا۔ سیاہ شیروانی زیب تن کیے ہوئے جس کے بٹن گلے تک بند تھے، چوڑے پائنچوں کا لکھنوی پاجامہ، رنگت کھلی کھلی اور جاذب نظر شخصیت۔ اُس نے کوئی تمہید باندھے بغیر اپنی گرج دار آواز میں غزل پڑھنی شروع کی

شبِ انتظار کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا، کبھی اک چراغ جلا دیا

ہتھے سے اکھڑا ہوا مجمع سمٹ کر رہ گیا اور پھر جو داد و تحسین کے نعرے بلند ہوئے تو لوگوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سحر تک یہی نوجوان شعر سناتا رہے۔ اُس مجمع میں مشہور فلم ساز اے آر کاردار بھی موجود تھے۔ انہوں نے مجروح کو پیغام بھجوایا کہ مشاعرے کے بعد اُن سے ملیں۔ ملے تو کاردار نے اُن سے اصرار کیا کہ ان کی زیرِ تکمیل فلم شاہ جہاں کے نغمے لکھیں۔ مجروح کسمسائے تو جگر صاحب نے سمجھایا کہ ہاں کہہ دیں۔

موسیقار نوشاد اور مجروح یکجا ہوئے تو ایسے ایسے نغمے وجود میں آئے: غم دیئے مستقل، کتنا نازک ہے دل یہ نہ جانا، ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ اور جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے۔

فلم کے دس میں سے آٹھ نغمے مجروح نے لکھے اور پہلی ادائیگی کے طور پر انہیں پانچ سو روپے ملے۔ طبِ یونانی سیکھ کر حکیم بنتے بنتے مجروح نغمہ نگار بن گئے۔ ان کی حسّاس انگلیاں مریض کی بجائے معاشرے کی نبض پر رکھی گئیں اور انہوں نے لمحہ بھر میں جان لیا کہ وہ کون سا نسخہ لکھیں کہ دوا میں سخن کا حسن بھی کوٹا گیا ہو اور دل تک اُتر جانے والی تاثیر بھی گھولی گئی ہو۔

فلم شاہ جہاں کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ گلوکار سہگل کی زندگی کے وہ آخری دن تھے۔ کچھ عرصے بعد جب ان کا جنازہ اٹھا تو ان کی وصیت کے مطابق سارے راستے ان ہی کی آواز میں مجروح کا نغمہ بجایا گیا

جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے

خود مجروح کو بمبئی کا موسم راس نہ آیا اور وہ واپس اپنے آبائی گھرانے چلے گئے۔ اور جب وہ پوری طرح صحت یاب ہو کر لوٹے تو محبوب کی زیرِ تکمیل فلم انداز (۱۹۴۹ء) جیسے ان ہی کی منتظر تھی۔ نوشاد نے ایک بار پھر ہارمونیم سنبھالا اور مجروح نے قلم۔ ایک بار پھر عظیم نغمے تخلیق ہوئے اور ایک بار پھر نغموں کی دنیا پر سُروں کی برسات ہوئی:

-ہم آج کہیں دل کھو بیٹھے یوں سمجھو کسی کے ہو بیٹھے
-جھوم جھوم کے ناچو آج ناچو آج گاؤ خوشی کے گیت
آج کسی کی ہار ہوئی ہے آج کسی کی جیت
-ٹوٹے نہ دل ٹوٹے نہ ساتھ ہمارا چھوٹے نہ
-تو کہے اگر جیون بھر میں گیت سناتا جاؤں من بین بجاتا جاؤں

یہ چاروں گانے مکیش نے گائے تھے۔نوشاد صاحب بتاتے ہیں کہ گانے لکھنے، طرزیں بنانے اور ان کی مشق کرنے کا سارا کام ان کے گھر پر ہوا کرتا تھا اور یہ کہ مکیش ان گانوں کی مشق کے لئے بمبئی کی بسوں میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے۔جن دنوں انداز کے گانے وجود میں آرہے تھے،نوشاد صاحب کے مکان کی چھت ڈالی جارہی تھی اور مزدور کام کررہے تھے۔وہ بتاتے ہیں کہ سب سے زیادہ مشقت جس نغمے کی خاطر کرنی پڑی وہ لتا منگیشکر کو گانا تھا۔اُس کے لئے مجروح اور نوشاد ساری رات جاگے تب کہیں صبح ہوتے گانے کے بول اور طرز مکمل ہوئی

اٹھائے جا اُن کے ستم اور جیئے جا یوں ہی مسکرائے جا،آنسو پیئے جا
یہی ہے محبت کا دستور اے دل وہ غم دے تجھے،تو دعائیں دیئے جا
کبھی وہ نظر جو سمائی تھی دل میں اُسی اِک نظر کا سہارا لئے جا
ستائے زمانہ یا ستم ڈھائے دنیا مگر تو کسی کی تمنا کیئے جا

نوشاد صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہر شعر کی الگ طرز بناتے تھے۔ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم انداز کے نغموں کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود نوشاد نے پھر کبھی مجروح صاحب سے کوئی نغمہ نہیں لکھوایا۔ کہتے ہیں کہ کان بھرنے والوں نے انہیں یقین دلا دیا کہ مجروح کمیونسٹ ہیں اور اُن کا خدا پر ایمان نہیں ہے۔

مجروح واحد نغمہ نگار ہیں جنہوں نے پچاس برس تک نغمے لکھے۔اس پورے کیریئر میں مجھے ان کا ایک نغمہ بھی ایسا نہ ملا جس میں انقلاب کی نوید،سرخ سویرے کی امید یا سماج کو بدل ڈالنے کا کوئی چھوٹا سا اشارہ بھی ہو۔

جہاں تک خدا پر یقین کا تعلق ہے، لے دے کر فلم شمع پروانہ (۱۹۵۴ء) میں ایک دوگانا ملتا ہے ؎ تو نے میرا یار نہ ملایا میں کیا جانوں تیری یہ خدائی۔

اوّل تو اُس وقت بیوہ کی مناجات قسم کی نظموں میں خدا سے گلہ شکوہ کرنے کا چلن عام تھا، دوسرے یہ گانا مجروح کے کمزور نغموں میں شمار ہونا چاہئے کہ جہاں مصرعے کو وزن میں بٹھانے کے لئے انہیں "تیری خدائی" کے درمیان یہ داخل کرنا پڑا۔ میں کیا جانوں تیری یہ خدائی۔

فلم انداز کے بعد مجروح نے کرکٹ کے بلّے باز کی طرح اپنے بازو کھولے اور نغمہ نگاری کی دنیا میں ایک بے مثال ہُنر کو خوب خوب آزمایا اور وہ ہنر تھا برصغیر کے گیت کے سانولے سلونے بدن پر غزل کا مہین اور نفیس لباس پہنانے کا ہنر۔ اس کاریگری میں کوئی دوسرا شاعر اُن سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اپنے Imagination یا تصّور کو ایسی کھلی فضا فراہم کی کہ پھر کوئی ان کا ثانی پیدا نہ ہو سکا ؎

چلو سجنا جہاں تک گھٹا چلے لگا کر مجھے گلے

یا دُن کا لکھا ہوا ایک اور نغمہ

یہ ہے ریشمی زلفوں کا اندھیرا نہ گھبرایئے
جہاں تک مہک ہے میرے گیسوؤں کی چلے آیئے

یا پھر یہ نغمہ

جایئے آپ کہاں جائیں گے یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی
دور تک آپ کے پیچھے پیچھے میری آواز چلی جائے گی

اور یہ تصور کتنے شاعروں نے باندھا ہوگا

وادیاں میرا دامن، راستے میری بانہیں
جاؤ میرے سوا تم کہاں جاؤ گے

اب ہم مجروح کے اس شعری سفر میں ان کے ساتھ ساتھ وہاں تک چلتے ہیں، جہاں تک ان کی زندگی کی گھٹا چلی۔

۱۹۴۶ء کی فلم شاہ جہاں میں ان کے لکھے ہوئے نغمے کئی نسلوں نے یاد رکھے:
اے دلِ بے قرار جھوم۔ چاہ برباد کرے گی، ہمیں معلوم نہ تھا۔ غم دیئے مستقل کتنا نازک ہے دل یہ نہ جانا، ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ، دے اٹھے داغ کو، ان سے اے ماہ نو کہہ سنانا، ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ۔ جب دل ہی ٹوٹ گیا۔ جب اُس نے گیسو بکھرائے، بادل آیا جھوم کے۔ کر لیجئے چل کر مری جنّت کے نظارے۔ میرے سپنوں کی رانی، روحی روحی روحی۔

اپنے نغموں کی بے پناہ شہرت دیکھنے سے پہلے مجروح بیمار پڑ گئے۔ بمبئی کی آب وہوا موافق نہ تھی، وہ واپس سلطان پور چلے گئے۔ اگر چہ خود حکیم تھے مگر صحت یاب ہونے میں تین برس لگے۔ ۴۹ء میں ان کی فلم انداز جاری ہوئی۔ اس کے نغموں میں ان کا جھکاؤ گیت کی طرف تھا اس میں شاید نوشاد کی طرزوں کا دخل بھی تھا لیکن ان کے بعد جب ان کے نظریات سے بے نیاز موسیقاروں نے ان کے خزانے کا منہ کھولا تو اس میں سے غزلیں اُبل پڑیں۔ ۵۰ء میں انل بسواس کی فلم آرزو میں انہوں نے کلکتے سے بمبئی میں وارد ہونے والے طلعت محمود کے لئے کچھ ایسے مصرعے لکھے

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو — اپنا پرایا مہرباں نامہرباں کوئی نہ ہو
جا کر کہیں کھو جاؤں میں نیند آئے اور سو جاؤں میں — دنیا مجھے ڈھونڈے مگر میرا نشاں کوئی نہ ہو
الفت کا بدلہ مل گیا، وہ غم لٹا وہ دل گیا — چلنا ہے سب سے دور دور اب کارواں کوئی نہ ہو

یہاں تک مجروح کے انداز پر اساتذہ کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اگلے دو ڈھائی برسوں میں ان کے اندر سے اصل مجروح برآمد ہونا شروع ہوا۔ ۵۳ء کی فلم ہمدرد میں انہوں نے لکھا:

وہی گیت جو میرے دل میں تھے وہ لبوں پہ آ کے مچل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
مجھے سہل ہو گئیں منزلیں، وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
بڑی چیز ہے تجھے کیا پتہ، تری اک ادا تیری اک صدا
جو تڑپ رہے تھے بہل گئے، جو گرے تھے گر کر سنبھل گئے

جسے سن سکا تھا نہ آج تک وہی راز جیسے کہ سُن لیا
وہی گیت جو میرے دل میں تھے وہ لبوں پہ آ کے مچل گئے

اسی برس او پی نیّر کی فلم باز کے لئے مجروح نے کچھ مصرعے آراستہ کئے:

مجھے دیکھو حسرت کی تصویر ہوں میں — جو بن بن کے بگڑی وہ تقدیر ہوں میں
نہایا ہوا ہوں خود اپنے لہو میں — مگر پھر بھی بے رنگ تصویر ہوں میں
چلا میں تو اہل وطن خوش رہو تم — نہ بیٹھا نشانے پہ وہ تیر ہوں میں

۵۳ء میں ضیا سرحدی نے 'انقلابی' فلم فٹ پاتھ بنائی۔ طبقات میں بٹے ہوئے معاشرے کے محروم لوگوں کی داستان تھی، چنانچہ اس کے نغموں میں اتنے ہی انقلابی شاعر علی سردار جعفری نے بھی ہاتھ بٹایا۔ مگر نہ تو ان نغموں میں کمیونزم کی بو تھی نہ خدا سے انکار تھا۔ فلم کی ایک قطعہ بند غزل جو ایک بار پھر طلعت محمود نے گائی بہت مقبول ہوئی:

شام غم کی قسم آج غمگین ہیں ہم — آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم
اب تو آ جا کہ اب رات بھی سو گئی — زندگی غم کے صحراؤں میں کھو گئی
ڈھونڈتی ہے نظر، تو کہاں ہے مگر — دیکھتے دیکھتے آیا آنکھوں میں دم

اسی برس مدن موہن کی فلم باغی نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ مدن موہن تو مقبول طرزیں بنانے کے ماہر تھے اور غزل کا انہیں خوب شعور تھا۔ مجروح نے لکھا:

ہمارے بعد اب محفل میں افسانے بیاں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے
نہ ہم ہوں گے، نہ تم ہو گے، نہ دل ہوگا، نہ گھر پھر بھی
ہزاروں منزلیں ہوں گی، ہزاروں کارواں ہوں گے

سنہ ۵۴ء میں نہایت ذہین موسیقار روشن نے مجروح کے اشعار کو موسیقی سے سجایا:

ہمیں اے دل کہیں لے چل، بڑا تیرا کرم ہوگا — ہمارے دم سے ہر غم، نہ ہم ہوں گے نہ غم ہوگا
تمناؤں سے بدلی ہے نہ بدلے گی کبھی قسمت — لکھا ہے جو مقدر میں وہی تیری قسم ہوگا

اس کے بعد چلتے ہوئے گانوں کا دور آیا۔ او پی نیّر کی تھرکتی ہوئی طرزوں پر مجروح

نے بھی ایسے ایسے مصرعے چُست کیئے کہ نغموں کی شکل ہی بدل گئی۔ اُن کی فلم آر پار میں ایسے ایسے نغمے تیار ہوئے: بابو جی دھیرے چلنا۔ ہوں ابھی میں جواں۔ جا جا جا بے وفا۔ محبت کرلو جی بھرلو۔ سن سن سن ظالما اور کبھی آر کبھی پار لاگا تیرِ نظر۔

لیکن آر پار کے ایک نغمے میں عورتوں کا لب ولہجہ کس کمال سے ڈالا گیا:

اے لو میں ہاری پیا، ہوئی تیری جیت رے　　　کاہے کا جھگڑا بالم، نئی نئی پریت رے

پھر فلم مسٹر اینڈ مسز ۵۵ جاری ہوئی۔ چلتے ہوئے گانوں کے درمیان ایک غزل جیسی چیز آ گئی تو بھلی لگی:

میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا　　　ٹکڑے ٹکڑے دل کے چنتا کس کو اتنا ہوش تھا

کاروانِ دل کا لٹا بیٹھا ہوں منزل کے قریب　　　میں نے خود کشتی ڈبو دی جا کے ساحل کے قریب

یہ زمیں چُپ چاپ تھی اور آسماں خاموش تھا　　　ٹکڑے ٹکڑے دل کے چُنتا کس کو اتنا ہوش تھا

فلم مسافر خانہ میں بھی کچھ چلتے ہوئے گانے لکھے گئے:

- دل دے ڈالا اندرانہ　　　سیاں اب ہوگا کیا　　　جانے میری بلا
- کچھ آنکھ ملی کچھ پیسہ ملا　　　ہمیں دلبر دیکھے، کیسا ملا

لیکن جب موسیقار بدلا تو نغموں کے انداز بھی بدلے گئے۔ ۵۶ء میں ہیمنت کمار فلم ایک ہی راستہ کی طرزیں بنا رہے تھے۔ مجروح نے خالص ہیمنت کے رنگ میں اٹھلاتے ہوئے نغمے لکھے:

چلی گوری پی سے ملن کو چلی　　　نیناں باوریا، من میں سانوریا
ڈار کے کجرا لٹ بکھرا کے　　　ڈھلتے دن کو رات بنا کے
کنگنا کھنکاتی، بندیا چمکاتی　　　چھم چھم ڈولے سجنا کی گلی
چلی گوری پی سے ملن کو چلی

......

سانولے سلونے آئے دن بہار کے　　　جھومتے نظارے جھومے رنگ ڈار کے
ندی کنارے، کوئی پکارے　　　آیا زمانہ گاؤ گیت پیار کے

ڈولتی گھٹا کے سنگ ڈولے جیا باغ میں پپیہا بولے پیا پیا
رت رنگیلی کہے کر کے اشارے چھیڑو فسانے دلِ بے قرار کے

فلمیں چونکہ محبت کی داستانوں کے گرد گھومتی تھیں، مجروح نے بھی خود کو محبت میں ڈبولیا اور صحیح معنوں میں اردو ہندی میں Love Poems لکھیں۔

یہ بھی ان ہی دنوں کی بات ہے (۵۴ء) مُکل رائے فلم سیلاب کے نغموں کی طرزیں بنا رہے تھے۔ جس سطح کا میوزک ڈائریکٹر تھا، اُسی سطح کے گلوکار ہیمنت کمار نے مجروح کے یہ بول گائے:

ہے یہ دنیا کون سی اے دل مجھے کیا ہو گیا جیسے منزل پر کوئی آ کے مسافر کھو گیا
میں ہوں اک پنچھی اکیلا اس گگن کی چھاؤں میں اڑتے اڑتے آ گیا ہوں بادلوں کے گاؤں میں
اپنے ہی سپنوں کی دھن میں چلتے چلتے کھو گیا ہے یہ دنیا کون سی اے دل مجھے کیا ہو گیا
سن بھی لو غم کی صدائیں، درد کا پیغام لو ڈگمگاتے جا رہے ہیں آ کے ہم کو تھام لو
پھر نہ یہ کہنا دیوانے تو کہاں گم ہو گیا ہے یہ دنیا کون سی اے دل مجھے کیا ہو گیا

اس کے بعد او پی نیّر کی ایک اور فلم میدان میں اتری، گویا وہ زمانہ چلتی ہوئی فلموں اور چلتے ہوئے نغموں کا تھا، جس میں ہمارا شاعر بے تکان گیت پر گیت لکھے چلا جا رہا تھا۔ وہ فلم تھی سی آئی ڈی اور اُس میں کچھ ایسے گانے تھے:

- بوجھ میرا کیا ناؤں رے، ندی کنارے گاؤں رے، پیپل جھومے مورے آنگنا، ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں رے
- کہیں پہ نگاہیں، کہیں پہ نشانہ
- لے کے پہلا پہلا پیار، بھر کے آنکھوں میں خمار، جادو نگری سے آیا ہے کوئی جادوگر

اس کے بعد تو کمال ہی ہو گیا۔ راک اینڈ رول کا زمانہ آ گیا اور موسیقار نرائن دت نے مخصوص امریکی انداز کی طرز بنا کر مجروح صاحب کو تھما دی کہ لیجئے اس پر بول لکھیے۔ وہ لکھتے گئے:

لال لال گال، جان کے ہیں لاگو، دیکھ دیکھ دل پہ رہے قابو، چور چور چور، بھاگ پردیسی بابو

اُس وقت کی واحد خاتون میوزک ڈائریکٹر اوشا کھنّہ فلم دل دے کے دیکھو کی طرزیں بنا رہی تھیں، مجروح نے اُن کے لئے بڑا نازک سا نغمہ لکھا:

ہم اور تم اور یہ سماں، کیا نشہ نشہ سا ہے　　　بولئے، نہ بولئے، سب سُنا سُنا سا ہے
بے قرار سے ہو کیوں، ہم کو پاس آنے بھی دو　　　گر پڑا جو ہاتھ سے وہ رومال اٹھانے بھی دو
ہنستے کیوں ہو، جانے بھی دو........　　　ہم اور تم اور یہ سماں، کیا نشہ نشہ سا ہے
آج بات بات پر آپ کیوں سنبھلنے لگے　　　تھرتھرائے ہونٹ کیوں، اشک کیوں مچلنے لگے
لپٹے گیسو کھلنے لگے..........　　　ہم اور تم اور یہ سمان، کیا نشہ نشہ سا ہے

او پی نیّر کی ایک اور فلم تم سا نہیں دیکھا (۵۷ء) ریلیز ہوئی۔ مجروح صاحب نے لکھا:

جوانیاں یہ مست مست بن پئے　　　جلاتی چل رہی ہیں راہ میں دیئے
نہ جانے ان میں کس کے واسطے ہوں میں　　　نہ جانے ان میں کون ہے مرے لئے

اب ایس ڈی برمن سامنے آئے اور وقت کے ساتھ قدم ملا کر انہوں نے بھی ویسی ہی طرزیں بنائیں مگر کچھ بھی ہو، الفاظ مجروح سلطان پوری کے تھے:

-چاند پھر نکلا　　مگر تم نہ آئے　　جلا پھر میرا دل　　کروں کیا میں ہائے
-چھوڑ دو آنچل زمانہ کیا کہے گا　　ان اداؤں کا زمانہ بھی ہے دیوانہ　دیوانہ کیا کہے گا؟
-مانا جناب نے پکارا نہیں　　　کیا میرا ساتھ بھی گوارہ نہیں
مفت میں بن کے، چل دیئے تن کے　　　واللہ جواب تمہارا نہیں

فلم پے انگ گیسٹ کے اس گانے کا بہت دلچسپ قصہ خود مجروح صاحب سنایا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ انہیں اس فلم کے گانے لکھنے کا کام سونپا گیا اور بتایا گیا کہ منظر یہ ہے کہ اک وکیل ایک خوبصورت لڑکی کے لئے گا رہا ہے۔ مجروح صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک پڑھے لکھے وکیل کے منہ میں کیسے الفاظ ڈالیں۔ ان کی مشکل آسان کرنے کے لئے ان سے کہا گیا کہ جتنی فلم تیار ہے وہ دیکھ لیں۔ دیکھا تو منظر یہ تھا کہ اداکارہ نوتن سڑک پر چلی جا رہی ہیں اور اداکار دیو آنند ان کے پیچھے پیچھے گاتے چلے جا رہے ہیں۔ مجروح صاحب نے کہا کہ تم لوگوں نے کیا وکیل وکیل کی رٹ لگائی ہوئی

تھی، یہ کہو کہ سڑک پر ایک لوفر ایک لڑکی کے پیچھے پیچھے گاتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر انہوں نے لکھا 'مانا جناب نے پکارا نہیں'۔

یا پھر برمن کی ایک اور فلم نو دو گیارہ آئی جس میں مجروح نے مکالمے کے انداز میں نغمہ لکھنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ دوگانا ہے جس کے مصرعے کشور کمار اور آشا بھونسلے کی آوازوں میں ہیں:

کسی کا آنچل   بادل میں کیا جی؟   روپہلا بادل   آنکھوں میں کیا جی؟
تیرے دم کی بہار ہے   رنگیں ہے موسم   عجب سی ہلچل   آنچل میں کیا جی؟
پر ہو بڑی چنچل   دیکھنے میں بھولی ہو   بس تیرا انتظار ہے   پھر بھی کچھ کم
اڑنے دو ہونٹ چوم کے   اڑتی ہیں زلفیں   جھکنے دو اور جھوم کے   جھکتی ہیں پلکیں
رستہ کٹ جائے چین سے   ساتھی بن جائیں   نیناں مل جائیں نین سے   جھومیں لہرائیں
دیکھنے میں بھولی ہو   پر ہو بڑی چنچل

روی بہت اچھے موسیقار تھے، اور بنگالی موسیقاروں سے یوں مختلف تھے کہ پہلے سے طرزیں بنا کر شاعر کو آزمائش میں نہیں ڈالتے تھے۔ آنکھوں میں کیا جی؟ کی طرح تو نہیں مگر انہوں نے بھی کشور کمار اور آشا بھونسلے کی آوازوں میں دوگانا لکھنے کی فرمائش کی۔ مجروح صاحب نے پیار کے اس نغمے میں غزل کا انداز اختیار کیا جو ان کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ (فلم دلّی کے ٹھگ ۵۸ء)

یہ راتیں، یہ موسم، ندی کا کنارا، یہ چنچل ہوا   کہا دو دلوں نے کہ مل کر کبھی ہم نہ ہوں گے جدا
ستاروں کی محفل نے کر کے اشارہ   کہا اب تو سارا جہاں ہے تمہارا
محبت جواں ہو، کھلا آسماں ہو   کرے کوئی دل آرزو اور کیا

موسیقار مدن موہن کا تعلق پنجاب سے تھا اور غزل کو خوب سمجھتے تھے۔ اپنی ۵۸ء کی فلم آخری داؤ میں انہوں نے مجروح صاحب سے مل کر محمد رفیع کے لئے غزل تیار کی:

تجھے کیا سناؤں اے دل ربا، ترے سامنے مرا حال ہے
تری اک نگاہ کی بات ہے، مری زندگی کا سوال ہے

میری ہر خوشی تیرے دم سے ہے، میری زندگی ترے غم سے ہے
ترے درد سے رہے بے خبر، مرے دل کی کب یہ مجال ہے
ترے حسن پر ہے مری نظر، مجھے صبح و شام کی کیا خبر
مری شام ہے تری جستجو، مری صبح تیرا خیال ہے
مرے دل جگر میں سما بھی جا، رہے کیوں نظر کا بھی فاصلہ
کہ تیرے بغیر او جانِ جاں، مجھے زندگی بھی محال ہے

اُسی برس فلم لاجونتی کے لئے مجروح صاحب نے یہ حساس نغمہ لکھا

کوئی آیا دھڑکن کہتی ہے دھیرے سے پلکوں کی یہ گرتی اٹھتی چلمن کہتی ہے

اس نغمے میں مجروح نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ گاؤں دیہات والے اس کی باریکیوں کو نہیں سمجھ پائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سمجھ گئے۔

سنہ ۵۸ء مجروح صاحب کا سب سے زیادہ مصروف برس رہا ہوگا۔ او پی نیّر کے لئے انہوں نے فلم بارہ بجے کا نغمہ لکھا۔ اس میں بھی سامنے نظر آنے والے فاصلوں سے بھی آگے نکل چلنے کا وہ عزم نظر آتا ہے جو مجروح سلطان پوری کے لکھے ہوئے نغموں کی شناخت سا بن گیا ہے۔ اس کے بول یوں ہیں:

تم جو ہوئے میرے ہم سفر، رستے بدل گئے لاکھوں دیئے میرے پیار کے راہوں میں جل گئے
کیا منزلیں، کیا کارواں باہوں میں تیری ہے سارا جہاں
آ جان جاں، چل دیں وہاں ملتے جہاں پہ زمین آسماں
منزل سے بھی کہیں دور ہم آگے نکل گئے
لاکھوں دیئے میرے پیار کے راہوں میں جل گئے

اسی برس مجروح نے ایس ڈی برمن کی فلم کالا پانی میں ہیمنت کمار کے لئے لکھا

ہے اپنا دل تو آوارہ نہ جانے کس پہ آئے گا

اور اُسی رَو میں برمن کی فلم کالا پانی کے لئے ایک دلچسپ تجربہ کیا گیا۔ ایس ڈی برمن نے اپنا گایا ہوا ایک بنگالی نغمہ سنایا اور مجروح کو دعوت دی کہ اسی طرز پر اردو لفظ

بٹھائیں۔ میرا خیال ہے کہ برمن کو اندازہ نہ تھا کہ جو طرز انہوں نے بنگلہ میں گائی ہے وہ غزل کی طرز ہے۔ مجروح نے بنگالی بدن پر اردو کا جامہ پہنایا:

ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے ساغر میں زندگی کو اتارے چلے گئے
دیکھا کیے تمہیں ہم بن کے دیوانہ اترا جو نشہ تو ہم نے یہ جانا
سارے وہ زندگی کے سہارے چلے گئے
تم تو نہ کہو ہم خود ہی سے کھیلے ڈوبے نہیں یوں ہی نشے میں اکیلے
شیشے میں آپ کو بھی اتارے چلے گئے

۱۹۵۹ء میں مجروح نے فلم کالی ٹوپی لال رومال، چلتی کا نام گاڑی اور سُجا تا جیسی کلاسیکی فلم کے اتنے ہی کلاسیکی نغمے لکھے۔ سجاتا میں طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ کیا ہوا یہ نغمہ فلمی شاعری کا شاہکار ہے:

جلتے ہیں جس کے لئے تیری آنکھوں کے دیئے ڈھونڈ لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لئے
درد بن کے جو مرے دل میں رہا ڈھل نہ سکا جادو بن کے تیری آنکھوں میں رہا، چل نہ سکا
آج لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لئے
دل میں رکھ لینا اسے ہاتھوں سے یہ چھوٹے نہ کہیں گیت نازک ہے مرا شیشے سے بھی، ٹوٹے نہ کہیں
گنگناؤں گا یہی گیت میں تیرے لئے
جب تلک نہ یہ تیرے رس کے بھرے ہونٹوں سے ملے یوں ہی آوارہ پھرے گا یہ تیری زلفوں کے تلے
گائے جاؤں گا یہی گیت میں تیرے لئے

فلم سجاتا کے لئے مجروح نے ایک چھوٹی سی لوری لکھی جس میں نیند کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ کسی آہٹ سے رانی جاگی تو اُسے بہلانے کی ذمے داری نیند پر ہوگی۔

ننھی کلی سونے چلی، ہوا دھیرے آنا نیند بھرے پنکھ لئے جھولا جھلا جانا
ریشم کی ڈور اگر پیروں کو الجھائے گھونگھر کا دانا کوئی شور مچا جائے
رانی مری جاگی تو پھر نندیا تو بہلانا

سجاتا کے بعد برمن نے فلم بامبے کا بابو کی موسیقی ترتیب دی۔ صاف ظاہر ہے کہ

طرزیں پہلے بنائی گئیں۔ اُن پر لفظ بعد میں بٹھائے گئے اس لئے انہیں غزل یا بند نظم کی طرح پڑھنا ممکن نہیں مگر مجروح نے ان میں غزل کی مٹھاس بھی گھولی ہے اور نظم کی طرح خیالات ایک ہی لڑی میں پروئے ہیں:

چلا مجھے لے کے اے دل اکیلا کہاں
ساتھی نہ کوئی منزل دیا ہے نہ کوئی محفل
بے درد ہے زمیں دور آسماں
ہمدم کوئی ملے کہیں ایسے نصیب ہی نہیں
کس کو کہے کوئی اپنا یہاں
گلیاں ہیں اپنے دیس کی پھر بھی ہیں جیسے اجنبی
شیشے کا دل لئے جاؤں کہاں
پتھر کے آشنا ملے پتھر کے دیوتا ملے

کشور کمار گلوکار اور اداکار کے علاوہ موسیقار بھی تھے۔ ان کی فلم جھمرو کا نام جتنا غیر سنجیدہ تھا، اتنا ہی سنجیدہ مجروح کا لکھا ہوا یہ نغمہ تھا

ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا
کوئی ہمدم نہ رہا، کوئی سہارا نہ رہا
جو مجھے راہ دکھائے وہی تارا نہ رہا
شام تنہائی کی ہے، آئے گی منزل کیسے
جو مجھے پھر سے بلائے وہ اشارہ نہ رہا
کیا بتاؤں میں کہاں یونہی چلا جاتا ہوں

اس کے بعد نہایت سریلی طرزیں بنانے والے سلیل چوہدری نے فلم مایا کے لئے مجروح صاحب سے اپنے مخصوص رنگ میں نغمے لکھوائے:

جا رے۔ جا رے اڑ جا رے پنچھی بہاروں کے دیس جا رے
یہاں کیا ہے میرے پیارے کیوں اجڑ گئی بگیا میرے من کی

سلیل چوہدری بنگالی تھے اور روایت کے مطابق طرزیں پہلے بناتے ہوں گے، مثلاً

جس دن سے اتاری ہے
تصویر تری دل میں
نئے نئے رنگ لے کے
پھروں تجھے سنگ لے کے
سپنوں کی محفل میں

اسی طرح ۶۲ء میں ایس ڈی برمن نے مجروح صاحب کے نغمے کے لئے طرز تیار کی ہوگی: (فلم بات ایک رات کی)

نہ ہم تمہیں جانیں
نہ تم ہمیں جانو

مگر لگتا ہے کچھ ایسا میرا ہمدم مل گیا

موسیقار روشن اپنی طرزوں میں نغمگی کے بڑے قائل تھے۔ چونکہ اکثر فلموں میں کہانیاں محبت کے گرد گھومتی تھیں، روشن کی طرزوں میں بھی عشق کی خوب خوب آمیزش ہوتی تھی۔ ایسے میں ان کے لئے مجروح سلطان پوری سے بہتر نغمہ نگار دنیا میں تخلیق ہی نہیں ہوا تھا۔ ٦٢ء کی فلم آرتی میں دونوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے اور باقی کسر محمد رفیع اور لتا منگیشکر نے پوری کر دی۔ آرتی کے چار نغمے لاجواب مثال پیش کرتے ہیں:

آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا　　کہ میرے دل پہ پڑا کوئی غم کا سایہ
میں بھی کیا چیز ہوں کھایا تھا کوئی تیر کبھی　　درد اب جا کے اٹھا چوٹ لگے دیر ہوئی
تم کو ہمدرد جو پایا تو مجھے یاد آیا　　کہ میرے دل پہ پڑا تھا کوئی غم کا سایہ
میں زمیں پر ہوں نہ سمجھا، نہ پرکھنا چاہا　　آسماں پر یہ قدم جھوم کے رکھنا چاہا
آج جو سر کو جھکایا تو مجھے یاد آیا　　کہ میرے دل پہ پڑا تھا کوئی غم کا سایہ
لتا: میں نے بھی سوچ لیا ساتھ نبھانے کے لئے　　دور تک آؤں گی میں تم کو منانے کے لئے
دل نے احساس دلایا تو مجھے یاد آیا　　آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

اس نغمے کا یہ مصرعہ توجہ کے قابل ہے: درد اب جا کے اٹھا چوٹ لگے دیر ہوئی۔ اردو روزمرہ کا کیسا برجستہ اظہار ہے۔ کبھی یہ نغمہ سننے کا موقعہ ملے تو غور کیجئے کہ رفیع نے لفظ 'جھوم کے' کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی　　انسان بن گئی ہے کرن ماہتاب کی
چہرے میں گھل گیا ہے حسیں چاندنی کا نور　　آنکھوں میں ہے چمن کی جواں رات کا سرور
گردن ہے اک جھکی ہوئی ڈالی گلاب کی　　اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی
گیسو کھلے تو شام کے دل سے دھواں اٹھے　　چھو لے قدم تو جھک کے نہ پھر آسماں اٹھے
سو بار جھلملائے شمع آفتاب کی　　اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی
دیوار و در کا رنگ یہ آنچل یہ پیرہن　　گھر کا مرے چراغ ہے بوٹا سا یہ بدن
تصویر ہو تم ہی مرے جنّت کے خواب کی　　اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی

اردو شاعر سے کبھی جھوٹوں کہہ دیکھئے کہ محبوبہ کے حُسن کی شان میں غزل کہو، وہ دیوانہ تو پورا دیوان لکھ لائے گا۔ شکیل بدایونی کی 'چودھویں کا چاند ہو' آپ کو یاد ہی ہوگی۔ مگر نغمہ نگاروں کی یہ مجبوری دلچسپ تھی کہ دو مصرعوں کے شعر کی بجائے تین مصرعے اور پھر مطلع کا پہلا مصرعہ لکھا کرتے تھے۔ یہ قصہ طلعت محمود اور فیاض ہاشمی کی 'تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی' ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ شاعر حضرات اس کو قطعہ بند غزل کہتے ہیں۔

فلم آرتی کا ذکر ابھی جاری ہے۔

جب میوزک ڈائریکٹروں کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ یہ شاعر بھی خوب ہے، کیسی ہی طرز بناؤ یہ اُس پر نہ صرف لفظ بٹھاتا بلکہ لفظ بھی ایسے کہ شاعری کا سارا حسن سمیٹے۔ بول لکھتے لکھتے ایک ایسا لفظ لکھتے ہیں گویا کسی عام سے ہار کی لڑی میں ایک تابناک موتی پرو دیا ہے۔ اس گیت کے آخری بول میں لفظ 'اقرار' غیب سے ہی آیا ہوگا:

لتا: بار بار تو ہے کیا سمجھائے پائل کی جھنکار ترے بن ساجن لاگے نہ جیا ہمار
رفیع: چھپ چھپ کے کرتا ہے اشارے چندا سو سو بار آ تو ہے سجنی لے چلوں دریا کے پار
لتا: چلتے چلتے رُک گئے کیوں سجن مرے
رفیع: ملتے ملتے جھک گئے کیوں نین ترے
لتا: جھکے جھکے نیناں کرتے ہیں تم سے یہ اقرار ترے بن ساجن لاگے نہ جیا ہمار

اور آرتی کے اس چوتھے نغمے میں نہ بحر ویسی ہے جس کے ہم عادی ہیں اور نہ وزن کا اُس طرح خیال رکھا گیا ہے جس طرح ہمارے شاعر رکھتے ہیں مگر شاعری کی ساری نفاستیں اور نزاکتیں مصرعہ بہ مصرعہ قطار باندھے چلی آتی ہے:

کبھی تو ملے گی، کہیں تو ملے گی، بہاروں کی منزل، راہی
لمبی سہی درد کی راہیں، دل کی لگن سے کام لے
آنکھوں کے اس طوفاں کو پی جا، آہوں کے بادل تھام لے
دور تو ہے پر دور نہیں ہے، نظاروں کی منزل، راہی
مانا کہ ہے گہرا اندھیرا، گُم ہے ڈگر کی چاندنی

مَیلی نہ ہو، دھندلی پڑے نہ، دیکھ نظر کی چاندنی
ڈالے ہوئے ہے رات کی چادر، ستاروں کی منزل، راہی

۶۳ء میں مجروح نے فلم 'پھر وہی دل لایا ہوں' کے نغمے لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ گانے اپنے بولوں کی وجہ سے شہرت پاتے ہیں یا اپنی موسیقی کے سبب۔ میری ذاتی رائے ہے کہ بول تو شروع کے دو چار ہوتے ہیں جو لوگوں کو یاد رہتے ہیں۔ ان کے بعد والے مصرعے ذہن میں محفوظ نہیں رہتے۔ یہ رہیں کچھ مثالیں:

آنچل میں سجا لینا کلیاں — زلفوں میں ستارے بھر لینا
ایسے ہی کبھی جب شام ڈھلے — تب یاد ہمیں بھی کر لینا
آیا تھا یہاں بیگانہ سا — چل دوں گا کبھی دیوانہ سا
دیوانے کی خاطر تم کوئی — الزام نہ اپنے سر لینا

......

آنکھوں سے جو اتری ہے دل میں، تصویر ہے اک انجانے کی
خود ڈھونڈ رہی ہے شمع جسے، کیا بات ہے اُس پروانے کی
انداز وہ اس کے آنے کا، چپکے سے بہار آئے جیسے
کہنے کو گھڑی بھر ساتھ رہا، پر عمر گزار آئے جیسے
ان کے بِنا، رہوں گی نہیں
قسمت سے، اب جو کہیں
مل جائے خبر، دیوانے کی

.....

پھر فلم دوستی میں مجروح کی لکھی ہوئی غزل شامل کی گئی

میرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے — کہ تو کہیں بھی رہے، تو میری نگاہ میں ہے
کھرا ہے درد کا رشتہ تو پھر جدائی کیا — جدا تو ہوتے ہیں وہ، کھوٹ جن کی چاہ میں ہے
چھپا ہوا سا مجھی میں ہے تو کہیں اے دوست — میری ہنسی میں نہیں ہے، تو میری آہ میں ہے

کبھی کبھی یہ ہوا کہ بہت دلکش نغمے گمنام رہ گئے۔ نہ طرز کام آئی اور نہ شگفتہ بول۔ چتر گپت بہت اچھے موسیقار تھے جن کے لئے رفیع نے مجروح کا یہ نغمہ گایا اور الفاظ کی مناسبت سے محمد رفیع نے کمال کی تاثیر پیدا کی۔ جس نے نہ سنا ہو، کسی طرح سُنے (فلم: اونچے لوگ):

جاگ دل دیوانہ رت جاگی وصلِ یار کی   بسی ہوئی زلف میں آئی ہے صبا پیار کی
ایک پری، کچھ شاد سی، ناشاد سی   بیٹھی ہوئی شبنم میں تیری یاد کی
بھیگ رہی ہو گی کہیں کلی سی گلزار کی   جاگ دلِ دیوانہ رت جاگی وصل یار کی

بالکل ایسا ہی نازک سا نغمہ فلم آکاش دیپ میں ریکارڈ کیا گیا۔ اس میں بھی رفیع کی آواز تھی اور یہ بھی کچھ گمنام ہی سا رہا جو بڑے خسارے کی بات ہے۔ موسیقار وہی چتر گپت تھے:

مجھے درد دل کا پتہ نہ تھا، مجھے آپ کس لئے مل گئے
میں اکیلے یوں بھی مزے میں تھا مجھے آپ کس لئے مل گئے
یوں ہی اپنے اپنے سفر میں گم، کہیں دور میں کہیں دور تم
چلے جا رہے تھے جدا جدا، مجھے آپ کس لئے مل گئے
نہ میں چاند ہوں کسی شام کا، نہ چراغ ہوں کسی بام کا
میں تو راستے کا ہوں اک دیا، مجھے آپ کس لئے مل گئے

آکاش دیپ کے لئے لتا نے بھی بھلا سا نغمہ گایا مگر اس کے بول غزل کی طرح نہیں، افسوس!

دل کا دیا جلا کے گیا یہ کون مری تنہائی میں   سوئے نغمے جاگ اٹھے ہونٹوں کی شہنائی میں
ایک ہی نظر میں نکھر گئی میں تو   آئینہ جو دیکھا سنور گئی میں تو
تن پہ اجالا پھیل گیا پہلی ہی انگڑائی میں
دل کا دیا جلا کے گیا یہ کون مری تنہائی میں

البتہ ایک سبک سے نغمے کی خاطر میں یہاں سے جست بھر کے سنہ ۷۰ء کی فلم دستک تک جاؤں گا جس میں مجروح کے نغمے کی طرز مدن موہن نے بنائی اور رفیع نے یوں

گایا جیسے اپنا گانا چپکے چپکے کسی کے کان میں سنا رہے ہوں، اوپر سے شاعری اپنے عروج پر ہے اور تخیل کی اڑان ہوا میں ڈولتے ہوئے ایک پر کی مانند:

تم سے کہوں اک بات پروں سے ہلکی ہلکی
رات میری ہے چھاؤں تمہارے ہی آنچل کی
سوئیں گلیاں، بانہہ پسارے، آنکھیں میچے
میں دنیا سے دور گھنی پلکوں کے نیچے
دیکھوں چلتے خواب لکیروں پر کاجل کی
تم سے کہوں اک بات پروں سے ہلکی ہلکی
دھندلی دھندلی رین، ملن کا بستر جیسے
کھلتا چھپتا چاند سیج کے اوپر جیسے
چلتی پھرتی کھاٹ ہواؤں پر بادل کی
تم سے کہوں اک بات پروں سے ہلکی ہلکی
ہے بھیگا سا جسم تمہارا ان ہاتھوں میں
باہر نیند بھرا پنچھی بھیگی شاخوں میں
اور برکھا کی بوند بدن سے ڈھلکی ڈھلکی
تم سے کہوں اک بات پروں سے ہلکی ہلکی

(اُن دنوں مجروح پورے پچاس برس کے ہو رہے تھے، ماشاءاللہ)

ہم ایک بار پھر لوٹتے ہیں سنہ ۶۵ء کی طرف جب او پی نیّر جیسے موسیقار نے تھرکنے والے گیت چھوڑ کر سنجیدہ نغموں کو اپنی طرزوں سے سجایا اور اس کے لئے مجروح سے بہتر نغمہ نگار کون ہوسکتا تھا۔ فلم میرے صنم سے کچھ مثالیں:

جایئے آپ کہاں جائیں گے
یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی
دور تک آپ کے پیچھے پیچھے
میری آواز چلی جائے گی
آپ کو پیار مرا یاد جہاں آئے گا
کوئی کانٹا وہیں دامن سے لپٹ جائے گا
جب اٹھو گے مری بیتاب نگاہوں کی طرح
روک لے گی کوئی ڈالی مری بانہوں کی طرح
دیکھئے چین ملے گا نہ کہیں دل کے سوا
آپ کا کوئی نہیں، کوئی نہیں دل کے سوا
جایئے آپ کہاں جائیں گے

جیسے نگاہیں اٹھتی ہیں ویسے محبوب کا اٹھنا اور جیسے بانہیں روکتی ہیں ویسے راہ میں آنے والی ڈالی کا روکنا، یہ شاعری کے چھوٹے چھوٹے اعجاز ہیں۔

پکارتا چلا ہوں میں گلی گلی بہار کی
بس ایک چھاؤں زلف کی، بس اک نگاہ پیار کی
یہ دل لگی، یہ شوخیاں سلام کی
یہی تو بات ہو رہی ہے کام کی

کوئی نظر تو ہو گی میرے نام کی　　کوئی تو مڑ کے دیکھ لے گا اس طرف
گھٹا اتر کے آ گئی زمین پہ　　سُنی میری صدا تو کس یقین سے
اثر بھی ہو رہے گا اک حسین پہ　　رہی یہی لگن تو اے دل جواں

کسی کی پکار سن کر گھٹا کا بڑے یقین کے ساتھ زمین پر اُتر آنا، یہ تصور مجروح ہی باندھ سکتے ہیں۔ فلم میرے صنم کا یہ اگلا نغمہ شاعری کے وزن اور بحروں سے آزاد ہے اور میوزک ڈائریکٹر کی طے کی ہوئی حدود کا پابند ہے مگر شاعر نے اس حد بندی کے باوجود غضب کے استعارے برتے ہیں:

جہاں تک مہک ہے مرے گیسوؤں کی چلے آیئے　　یہ ہے ریشمی زلفوں کا اندھیرا نہ گھبرایئے
ہلتے، رکتے، اِن رنگیں لبوں کی قسم　　سنئے تو ذرا، جو حقیقت ہے کہتے ہیں ہم
جی تبسّم تو فرمایئے　　جل اٹھیں گے دیئے جگنوؤں کی طرح
تم ہو مہماں تو نہ چھوڑے گی یہ راستہ　　پیاسی، ہے نظر، یہ بھی کہنے کی ہے بات کیا
ارماں بن کے رہ جایئے　　رات جائے، یہیں آپ دل میں مرے

٦٦ء میں مجروح نے فلم ممتا کے لئے جو نغمے لکھے اُن میں غضب کی نازک خیالی تھی۔ مثلاً یہ کہ

ہم جان سے بھی پیاروں کی طرح　　رہتے تھے کبھی جن کے دل میں
ہم آج گنہ گاروں کی طرح　　بیٹھے ہیں انہیں کے کوچے میں

یا ایک اور گیت جس میں تشبیہہ کس کمال کی ہے

جیسے مندر میں لَو دیئے کی　　چھپا لو یوں دل میں پیار میرا کہ
تمہارے چرنوں کا پھول ہوں میں　　تم اپنے چرنوں میں رکھ لو مجھ کو
کہ جیسے مندر میں لو دیئے کی　　میں سر جھکائے کھڑی ہوں کب سے

ممتا کا ایک اور نغمہ میں نے آخر کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے فلم بہاروں کے سپنے، دیور، جیول تھیف اور پیار کا موسم کے نغمے لکھے۔ ٦٨ء میں ان کی فلم ابھیلاشا ریلیز ہوئی جس کے ایک نغمے کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، اس میں بھی تشبیہہ

اور استعارے کسی کلاسیکی غزل سے کم نہیں تھے۔ اس کے موسیقار آر ڈی برمن تھے اور آواز محمد رفیع کی تھی:

وادیاں میرا دامن، راستے میری باہیں جاؤ میرے سوا تم کہاں جاؤ گے
جب چراؤ گے تن تم کسی بات سے شاخ گل چھیڑ دے گی مرے ہاتھ سے
اپنی ہی زلف کو اور الجھاؤ گے
جب سے ملنے لگیں تم سے راہیں مری چاند سورج بنیں دو نگاہیں مری
تم کہیں بھی رہو، تم نظر آؤ گے

اسی برس فلم میرے ہمدم میرے دوست میں مجروح نے وہ نغمہ لکھا جس میں وہی بات نئے انداز میں کہی "جہاں تک مہک ہے میرے گیسوؤں کی چلے آیئے۔" اس میں گیت کا ڈھنگ ہے مگر غزل کی آہنگ ہے:

چلو سجنا جہاں تک گھٹا چلے لگا کر مجھے گلے
سندر سپنوں کی ہے منزل قدم کے نیچے فرصت کس کو اتنی دیکھے جو مڑ کے پیچھے
تم چلو، ہم چلیں، ہم چلیں تم چلو ساون کی ہوا چلے
دھڑکن تمرے دل کی الجھی ہماری لٹ میں تمرے تن کی چھایا، کاجل بنی پلک میں
ایک ہیں دو بدن، دو بدن ایک ہیں آنچل کے تلے تلے
پتھریلی راہوں میں تم سنگ میں جھوم لوں گی کھاؤ گے جب ٹھوکر، ہونٹوں سے چوم لوں گی
پیار کا آج سے، آج سے پیار کا ہم سے سلسلہ چلے

موسیقی میں سُر پلٹے کی اصطلاح سنی تھی مگر شاعری میں الفاظ کی ایسی تکرار کہ جس میں وہ پلٹ جائیں، یہ مجروح ہی کا کمال ہے۔ نازک خیالی کا یہ حال ہے کہ "تمرے تن کی چھایا، کاجل بنی پلک میں" جو رنگ چھایا کا ہوتا ہے وہی کاجل کا۔

اسی فلم میں ایک اور نغمہ جسے آپ چاہیں تو آزاد نظم کی طرح پڑھ لیجیے:

ہوئی شام ان کا خیال آ گیا
وہی زندگی کا سوال آ گیا

ابھی تک تو ہونٹوں پہ تھا
تبسّم کا اک سلسلہ
بہت شاد ماں تھے ہم اُن کو بھلا کر اچانک یہ کیا ہو گیا
کہ چہرے پہ رنگِ ملال آ گیا
ہمیں تو یہی تھا غرور
غمِ یار ہے ہم سے دور
وہی غم جسے ہم نے کس کس جتن سے
نکالا تھا اس دل سے دور
وہ چل کر قیامت کی چال آ گیا
ہوئی شام اُن کا خیال آ گیا

اگلے برس، یعنی ۱۹۶۹ء میں مدن موہن نے فلم چراغ میں مجروح سے یہ بول لکھوائے۔ مدن موہن صرف ذہین میوزک ڈائریکٹر ہی نہیں تھے، شاعری کی انہیں سمجھ بھی خوب تھی:

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے   یہ اٹھیں صبح چلے، یہ جُھکیں شام ڈھلے
میرا جینا میرا مرنا ان ہی پلکوں کے تلے   تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
پلکوں کی گلیوں میں چہرے بہاروں کے ہنستے ہوئے   ہیں میرے خوابوں کے کیا کیا نگر ان میں بستے ہوئے
یہ اٹھیں صبح چلے، یہ جھکیں شام ڈھلے   میرا جینا میرا مرنا انہی پلکوں کے تلے
ان میں مرے آنے والے زمانے کی تصویر ہے   چاہت کے کاجل سے لکھی ہوئی مری تقدیر ہے
یہ اٹھیں صبح چلے، یہ جھکیں شام ڈھلے   میرا جینا میرا مرنا انہی پلکوں کے تلے

فلمی صنعت کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ مجروح سلطان پوری کو یوں ہی تو نہیں دیا گیا تھا (۱۹۹۴ء)

فلم تلاش کے لئے انہوں نے گیت لکھا:

کھائی ہے رے ہم نے قسم سنگ رہنے کی   آئے گا رے اڑ کے میرا ہنس پردیسی
ایسے تو نہیں اس کے رنگ میں ڈھلی میں   پیا انگ لگ لگ کے بھئی سانولی میں

میرے تن پہ چھاؤں ہے اُسی کی کھائی ہے رے ہم نے قسم سنگ رہنے کی
محبوب کے انگ لگ لگ کے سانولا ہو جانا، اس خیال تک ہر ایک کی پہنچ نہیں۔

سنہ ۷۰ء میں فلم دستک کے لئے مجروح نے لوک ڈھنگ میں گیت لکھے جن کی مدن موہن نے کلاسیکی رنگ میں طرزیں بنائیں۔ یہ گیت پڑھنے کی نہیں، سننے کی چیز ہیں:

بیّاں نہ دھرواو بلما نہ کرو مو سے رار
ڈھلے گی چُنریا تن سے ہنسیں گی رے چوڑیاں چھن سے
مچے گی جھنکار بیّاں نہ دھرواو بلما

......

مائی ری، میں کا سے کہوں پیرا اپنے جیا کی مائی ری
اوس نیَین کی ان کے میری لگی کو بجھائے نا
تن من بھگو دے آ کے ایسی گھٹا کوئی چھائے نا
مو ہے بہالے جائے ایسی لہر کوئی آئے نا
پڑی دریا کے کنارے میں پیاسی مائی ری

مگر فلم دستک میں جو کمال ہوا وہ مجروح کی غزل ہے جس میں عربی فارسی کی بہتات کے باوجود اسے فلم میں جوں کا توں شامل کر لیا گیا اور مصرعوں کو سمجھانے کے لئے فلم ساز نے کبھی بازار دکھائے، کبھی دکانیں اور کبھی گلیاں البتہ مجروح سے یہ نہیں کہا کہ زبان مشکل ہے اسے آسان کرو۔

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
وہ تو کہیں ہیں اور، مگر دل کے آس پاس پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح
مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

لتا منگیشکر نے یہ غزل یوں گائی کہ کیا مجال کوئی زیر زبر اِدھر سے اُدھر ہوا ہو۔ مجروح جیسے استاد نے پاس بیٹھ کر مشق کرائی ہوگی۔ باقی ہنرمندی موسیقار مدن موہن کی ہے۔

سنہ ۷۰ء کے بعد وقت پہلو بدلنے لگا۔ بہت سے نغمہ نگار میدان میں آ گئے۔ مجروح صاحب کا نام اکا دکّا فلموں میں سنائی دینے لگا۔ پاکیزہ، میرے جیون ساتھی، یادوں

کی برات، انا میکا، ابھیمان، دھرم کرم، ہم کسی سے کم نہیں، قدرت، جھوٹا سچ، قیامت سے قیامت تک اور خاموشی جیسی فلموں کے لئے وہ نغمے لکھتے رہے۔ فلم قدرت میں ان کا لکھا ہوا یہ نغمہ اپنے مخصوص لہجے کی وجہ سے قابل ذکر ہے:

ہمیں تم سے پیار کتنا، یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے، تمہارے بنا
سنا غم جدائی کا اٹھاتے ہیں لوگ
جانے زندگی کیسے بتاتے ہیں لوگ
دن بھی یہاں تو لگے برس کے سمان
ہمیں انتظار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا

۱۹۶۶ء کی فلم ممتا کا جو نغمہ میں نے آخر کے لئے اٹھا رکھا تھا وہ مجروح کے بہترین گانوں میں شمار ہوتا ہے۔ روشن جیسے موسیقار نے اس کی طرز بنائی تھی اور لتا نے بہت جی لگا کر گایا تھا۔ اس نغمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اسے لکھتے ہوئے مجروح خود اپنے بارے میں پیشن گوئی کر رہے تھے:

رہیں نہ رہیں ہم، مہکا کریں گے
بن کے کلی، بن کے صبا، باغِ وفا میں
موسم کوئی ہو اس چمن میں رنگ
بن کے رہیں گے ہم خراماں
چاہت کی خوشبو یوں ہی زلفوں سے
اڑے گی، خزاں ہو یا بہاراں
یوں ہی جھومتے اور کھلتے رہیں گے
بن کے کلی، بن کے صبا، باغِ وفا میں
کھوئے ہم ایسے کیا ہے ملنا
کیا بچھڑنا نہیں ہے یاد ہم کو
کوچے میں دل کے جب سے آئے
صرف دل کی زمیں ہے یاد ہم کو
اِسی سرزمیں پر ہم تو رہیں گے
بن کے کلی، بن کے صبا، باغ وفا میں
جب ہم نہ ہوں گے
جب ہماری خاک پر تم رکو گے چلتے چلتے
اشکوں سے بھیگی چاندنی میں
اک صدا سی سنو گے چلتے چلتے
وہیں پہ کہیں ہم تم سے ملیں گے
بن کے کلی، بن کے صبا، باغِ وفا میں

۲۴ مئی ۲۰۰۰ء کو لوگوں نے یہ نغمہ بہت یاد کیا۔ اُس روز مجروح سلطان پوری کا انتقال ہوا تھا۔

ایک چہرے پر کئی چہرے چڑھا لیتے ہیں لوگ

اس کتاب میں پاکستان کا ذکر کیوں نہیں؟

سوال اچھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرا یہ جواب بھی برا نہیں کہ پاکستان کا معاملہ ہندوستان سے جدا ہے۔ پاکستان میں سخن ور بہت ہیں اور سخن فہم بہت۔ اوپر سے موسیقار بڑے اور سازندے بے شمار۔ نغمہ نگاری کے لئے اس سے زیادہ زرخیز زمین نہیں ہو سکتی چنانچہ یہ بات طے ہے کہ پاکستان کی مقبول موسیقی اور نغمہ نگاری کے ساتھ ایک باب میں انصاف نہیں ہو سکتا۔ یہ موضوع ایک الگ اور پوری کتاب مانگتا ہے۔ ضروری ہے کہ میری طرح کوئی اٹھے اور یہ کام کر گزرے۔ کسی یونیورسٹی سے یہ امید رکھنا فضول ہے کہ وہ طالب علموں کو اس موضوع پر تحقیق کرنے کی دعوت دے گی۔

اور اگر یوں ہو بھی جائے۔ کسی استاد کے جی میں آئے کہ پی ایچ ڈی کے کسی شاگرد کو ایسا کوئی فرض سونپے تو شاگرد کو دشواری ہی نہیں، مایوسی بھی ہوگی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نغموں اور نغمہ نگاروں کے بارے میں پاکستان میں کہیں بھی، کسی نے بھی اتنا اہتمام نہیں کیا جتنا ہندوستان میں کیا جا رہا ہے۔

اس موضوع پر کتابیں ناپید ہیں اور اب تو انٹرنیٹ کی شکل میں عالمی لائبریری کھل گئی ہے اس میں بھی پاکستان کے نغمہ نگاروں کا باب بند ہے۔ پاکستان کی مقبول موسیقی کے بارے میں کمپیوٹر پر جو بھی ویب سائٹ دستیاب ہے اس نے نغمہ نگاروں کو بری طرح نظر

انداز کیا ہے۔ پاکستانی فلموں کی تاریخ پر ایک پوری ویب سائٹ موجود تو ہے مگر اس میں نغمہ نگاروں کا خانہ ہی نہیں۔ بے شمار فلموں کا ذکر ہے اور ساری تفصیل موجود ہے مگر نغمہ نگاروں کے نام کے آگے ایسی لکیر کھینچ دی گئی ہے جیسے سلے ہوئے ہونٹ۔ کویت میں ایک نوجوان نے بہت محنت سے پاکستانی فلموں کا ڈیٹا بیس ترتیب دیا ہے جس میں نغمہ نگاروں کا باب موجود ہے مگر بُری طرح ادھورا اور نامکمل۔

ایسے میں امید ہی کی جا سکتی ہے کہ کوئی اٹھے گا اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔

یہاں میں پاکستان کے نغمہ نگاروں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا چاہوں گا تا کہ اگلے کام کی بنیاد پڑ جائے:

سب سے پہلے مشیر کاظمی آتے ہیں جنہوں نے ۱۹۵۲ء کی فلم دوپٹہ کے نغمے لکھے اور جن کی طرزیں فیروز نظامی نے بنائیں۔ آدھی صدی کبھی کی گزر گئی، یہ نغمے آج بھی زندہ ہیں۔ مشیر کاظمی نے اسی طرح فلم لختِ جگر، الف لیلیٰ اور کمانڈر وغیرہ کے گانے لکھے۔

ان کے بعد سیف الدین سیف آتے ہیں جنہوں نے فلم گمنام، لخت جگر اور سات لاکھ کے نغموں میں اپنے شاعری کے تجربے اور روایت کو برتا۔

پھر تنویر نقوی ہیں جو برصغیر کی تقسیم سے پہلے سے نغمے لکھتے آئے تھے آزادی کے کافی عرصے بعد پاکستان آئے اور جھومر، کوئل، سلمیٰ، گلفام، گھونگھٹ، سرحد اور شعلہ اور شبنم جیسی فلموں کو سریلے نغمے عطا کئے۔

اسی دوران فیاض ہاشمی مشرقی پاکستان سے لاہور آ گئے اور اپنے بے پناہ تجربے کی بنا پر بے شمار فلموں کے نغمے لکھے جن میں سہیلی، سلمیٰ، شریک حیات اور لاکھوں میں ایک شامل ہیں۔

سنہ ساٹھ کے عشرے میں حبیب جالب اور حمایت علی شاعر جیسے مانے ہوئے شاعروں نے نہایت عمدہ نغمے لکھے۔ حبیب جالب نے فلم موسیقار، زرقا اور جوکر کے نغمے ترتیب دیئے اور حمایت علی شاعر نے فلم آنچل، دامن، کنیز، بدنام اور لوری کو اپنے نغموں سے

آراستہ کیا۔ ان ہی دنوں احمد راہی نے نہ صرف کلاسیکی فلم باجی لکھی بلکہ اس کے نغمے بھی رقم کئے ۔ وہی دن تھے جب جوش ملیح آبادی نے فلم آگ کا دریا کے اور حزیں قادری نے سہیلی کے نغمے تحریر کئے۔

ساٹھ کا عشرہ پاکستانی فلموں پر جوبن لے کر آیا۔ مسرور انور نے تو کمال ہی کیا اور بے شمار فلموں کے نغمے لکھے جن میں بنجارن، جب سے دیکھا ہے تمہیں، شرارت، ہیرا اور پتھر، ایسا بھی ہوتا ہے، ارمان، بدنام، دوراہا، احسان، انجمن، نصیب اپنا اپنا کے ناموں سے ہمارے کان اچھی طرح آشنا ہیں۔ ان کے ساتھ سہیل رعنا جیسے موسیقار اور احمد رشدی جیسے گلوکار تھے جو سارے کے سارے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

ساٹھ کے عشرے میں پائے کے شاعر منیر نیازی نے فلم شہید، سسرال، تیرے شہر میں اور رشتہ ہے پیار کا میں اپنے نغمے دیئے۔ عشرہ رخصت کے قریب تھا کہ کلیم عثمانی اور شیون رضوی نے اس میدان میں قدم رکھا خصوصاً شیون رضوی نے فلم سالگرہ کے یادگار نغمے تحریر کئے۔ اس گفتگو میں ہم طفیل ہوشیار پوری اور بشیر احمد اور تسلیم فاضلی کو شامل کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اب رہ گئے نغمہ نگاری کو بڑی ستھری اور سلجھی ہوئی شاعری سے سنوار کر سننے اور سراہنے والوں کے دل اور دماغ میں گھر کرنے والے قتیل شفائی۔

یہ روایتی باتوں کا مقام نہیں کہ وہ ۲۴ء دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور، ہزارہ میں پیدا ہوئے اور ان کا اصل نام اورنگ زیب خان تھا۔ ان کی پہلی فلم تیری یاد تھی، پھر گلنار، انتقام، قاتل، عشق لیلیٰ، زہر عشق، نائیلہ اور سب سے بڑھ کر فلم انتظار کے نغمے لکھے اور ۱۱ جولائی ۲۰۰۱ء میں لاہور میں وفات پائی۔

اس رسمی گفتگو کے بعد ان کی ایک یادگار گفتگو جس کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمام گزشتہ صفحوں میں میری گواہی تھی لیکن اس بار خود ایک نغمہ نگار کی شہادت ہے۔

یہ ۱۷ء جون ۱۹۹۳ء کی بات ہے، میں اور قتیل شفائی مسقط کے کسی ہوٹل کے

آرام دہ کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے شاعری، نغمے، فلموں اور ٹیلی ویژن کے بارے میں اپنے تجربے کی بنا پر بہت ہی دلچسپ اور بڑے پتے کی باتیں بتائیں۔ اصولاً یہ باتیں اس کتاب کے پہلے باب میں درج ہوتیں تو اچھا ہوتا تاکہ نغمے کے رموز اور بنیادی نکات وہیں واضح ہو جاتے جس کے بعد اس فن کی خوبیوں اور باریکیوں کو جاننا، سمجھنا اور سراہنا آسان ہو جاتا لیکن میں نے جان بوجھ کر انہیں آخر کے لئے اٹھا رکھا۔ آپ پڑھیں گے تو میری اس دلیل کی تائید کریں گے۔ قتیل شفائی کی یہ گفتگو پہلے کبھی نہ نشر ہوئی اور نہ شائع ہوئی۔ بالکل اچھوتی ہے۔ لیجئے:

میں نے کہا: قتیل شفائی صاحب، شعر کا ماشاء اللہ اتنا طویل سفر کر کے آپ جس مقام پر ہیں، کبھی یہاں سے پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہیں؟

وہ بولے: جی کبھی تنہائی میں سوچتا ہوں کہ یہاں تک پہنچنے کا تو کبھی ذہن میں خیال آیا ہی نہیں تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ شروع میں جس چیز کو معمولی جانا تھا، اُس ذوق نے مجھے کہاں پہنچا دیا، تعجب ہوتا ہے۔ تھوڑا سا اس میں شائبہ فخر کا بھی شامل ہو جاتا ہے کہ اس سفر میں جتنی قدرت نے مجھے مقبولیت دی اُس پر فخر ہی کرنا بجا ہے۔ اور ہو سکتا ہے مجھ پر قدرت کی خاص عنایت بھی ہو، وہ تو ہر شاعر پر ہوتی ہے۔ شاعری ودیعت ہوتی ہے لیکن اس میں میرے مطالعے کو، میری محنت کو اور ریاض کو بہت دخل ہے، وہ اب بھی جاری ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی منزل تو بہت دور ہوتی ہے۔ راستے کی منزلیں ہوتی ہیں، کچھ منزلیں طے کیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر عمر نے وفا کی اور یہ لگن جو رہے گی کسی اگلی منزل پر بھی پہنچوں گا۔

میں نے پوچھا: شعر کا معاملہ یوں تو نہیں ہے کہ آنا رک جاتا ہے؟

وہ بولے: جی، کبھی ہوتا ہے ایسا۔ پہلے میں گھبراتا تھا۔ ایک بار یوں ہوا کہ چار پانچ مہینے تک ایک بھی شعر نازل نہیں ہوا۔ کوشش بھی کی جسے آورد کہتے ہیں۔ آورد کا سہارا بھی لیا لیکن چار پانچ مہینے تک شعر نہیں ہو پایا اور میں گھبرا گیا۔ شاید وہ شاعری کے سوتے خشک ہو گئے لیکن اس کے بعد اچانک ایک سیلاب آیا جو ذہن کے کسی تہ خانے میں ذخیرہ

ہوتا رہا اور وہاں سے اڈ کر یہ شاعری آئی۔ پھر یہ چیزیں دہرائی جاتی رہیں۔ لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ بیچ میں ایک وقفہ ہے کہ ذرا دم لے لو اور پھر آگے بڑھو۔

میں نے پوچھا: شعر میں والہانہ پن یا سرشاری کا عمر سے کوئی تعلق ہے؟

وہ بولے: نہیں صاحب، بالکل نہیں ہے۔ جنہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوتا اور جنہیں میرے بارے میں واقفیت نہیں ہوتی اور میری آج کی شاعری پڑھ رہے ہوتے ہیں تو میری عمر کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ خصوصاً میں جب بمبئی گیا جہاں کچھ فلموں کے گانے مجھ سے لکھوائے گئے تو مہیش بھٹ کی فلم کے میں نے گانے لکھے۔ اس سے پہلے جب میری ملاقات ہوئی تو وہ میری شاعری پڑھتے رہے تھے اور انہیں میری شاعری یاد بھی تھی، ادب کا ذوق رکھنے والے ہیں، تو ان کا خیال تھا کہ میں کوئی چالیس پینتالیس کی عمر میں ہوں گا۔ جیسے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کچھ تو ویسے بھی میں عمر چور آدمی ہوں، جتنی عمر ہے اس سے کم ہی دکھائی دیتی ہے، اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے دیکھ کر کہا کہ صاحب میرا خیال تھا کہ آپ چالیس پینتالیس کے ہوں گے لیکن آپ تو ساٹھ باسٹھ کے نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو میری عمر کا ابھی تک اندازہ نہیں ہوا، میں اِس وقت چوہتّر کا ہوں۔ بہت حیران ہوئے اور وہی سوال ہوتا ہے کہ اس عمر میں آپ ایسی شاعری کیسے کر لیتے ہیں۔ اس کا جواب تو یہی ہے کہ یہ چیز مزاج میں ہے۔ ایک مزاج بن گیا ہے وہ شروع سے اب تک چلا آ رہا ہے اور عمر اُس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

میں نے کہا: واردات قلبی کا سلسلہ بھی رک جاتا ہے کیا؟ اس عمر میں محبتیں نہیں ہوتیں کیا؟

جواب ملا: نہیں صاحب، تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا، یہاں تک تو ہے۔ باقی یہ سارے مشاغل جو ہیں جنہیں پیار و محبت کہتے ہیں ان کا تعلق عمر سے ہے اور انہیں عمر کے ساتھ ہی رکھنا چاہیئے اور بریکٹ کرنا چاہیئے۔ اگر آپ اپنی عمر سے پہلے کی باتیں سوچیں گے تو اس میں آپ کی عمر کا زیاں بھی ہوگا اور باقی کئی عیب آپ کے فن میں بھی پیدا ہو جائیں گے، زندگی زائل کریں گے آپ۔ تو آدمی اگر حسن پرستی چھوڑ دے، لیکن چھوڑ سکتا نہیں، یہ اپنے

اختیار میں نہیں ہے تو کم از کم شاعری خوبصورت نہیں رہ سکتی۔ لیکن اگر آپ اسے سیکس (Sex) میں منتقل کر دیں خصوصاً بڑی عمر میں، تو وہ نقصان ہی نقصان ہے۔ رومانس اور سیکس میں فرق کرنا چاہیے۔ رومانٹک مزاج اگر بجھ جائے تو شاعری بجھ جاتی ہے لیکن اگر اس عمر میں سیکس بجھ جاتی ہے تو اُسے بجھنے دیجیے، اس کا رومانس سے کوئی تعلق نہیں۔

میں نے پوچھا: قتیل شفائی صاحب، فلم کی موسیقی سے آپ کا گہرا تعلق رہا اور بجا طور پر کئی ایسے نام ذہن میں آتے ہیں جنہوں نے فلم کی موسیقی کے سہارے شاعری کو نیا اسلوب بھی دیا اور اس میں نئی نئی جہتیں پیدا کیں اور بہت فروغ دیا اور عام لوگوں تک اچھا مصرعہ پہنچایا، کیا اس میں کچھ تسکین کا پہلو ہے یا محض پیشہ وری ہے؟

وہ بولے: صاحب میں تو سمجھتا ہوں کہ عام شاعری سے، جسے آپ ادبی شاعری کہہ لیجیے، صف بندی ہے اور آپ کہہ لیجیے کہ میں ادبی شاعری کی پہلی صف میں ہوں لیکن مجھے فخر ہے کہ فلم میں صرف دو تین نام جو نمایاں ہیں جنہوں نے فلم کو کچھ دیا۔ اُن میں میرا نام نمایاں ہے اور اس پر میں ہمیشہ فخر کرتا ہوں، جب کہ کچھ حاسد جو ہوتے ہیں وہ میری ۱۴ کتابیں سامنے نہیں رکھتے اور میری مذمت کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ فلمی شاعر ہے، تو یہاں آکر مجھے ہنسی آتی ہے کہ جو لوگ یہ باتیں کہتے ہیں، یہ سب فلم میں آنا چاہتے تھے یا آئے اور لوٹ گئے، انہوں نے یہ بھاری پتھر اٹھا کر چھوڑ دیا۔ فلم میں جب میں آیا___ آیا نہیں بلکہ لایا گیا تھا، راولپنڈی کے گورڈن کالج کا مشاعرہ تھا وہاں کچھ لوگ آئے اور مجھے گانے لکھنے کی دعوت دی۔ یہ بات سنہ ۴۶ء کی ہے، مجھے لانے والے باذوق لوگ تھے اور میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ فلم میں کوئی رول ادا کروں گا، رول اداکاری کا نہیں بلکہ یہ کہ جو تنگ بندی ہو رہی ہے اس میں کچھ ادبی آواز پیدا کروں گا، یہ مشن لے کر آیا تھا۔ چنانچہ شروع ہی سے مجھے یہ موقع ملا۔ مجھ سے گیت لکھوانے والوں نے یہ موقع اور یہ سہولت مجھے دی۔ اس کے بعد آگے پھر گڑبڑ ہوتی رہی لیکن بحیثیت مجموعی فلم میں میری کارکردگی یہ ہے کہ اگر میں فلم کی شاعری کو مجموعے کی شکل میں لاؤں تو وہ جو مجھے فلمی شاعر کہتے ہیں، ان کی ادبی شاعری پر بھاری ہوگی۔ انشاء اللہ، اور میں یہ کام کرکے بتاؤں گا۔

اس کی ایک مثال ہمارے دوست اعجاز بٹالوی کی ہے، فلم کے بارے میں اونچے طبقے کی طرح ان کی بھی رائے تھی کہ اچھی شاعری نہیں ہوتی اور کئی دفعہ اِس قسم کی باتیں کر چکے تھے تو ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "جیسے کسی نے کہا کہ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔" یہ تقریر کر کے بیٹھے تو میں نے کہا کہ جناب آپ ہمیشہ فلمی شاعری کو بُرا کہتے ہیں، یہ جو مصرعہ آپ نے پڑھا یہ کسی غالبؔ یا کسی میرؔ کا نہیں ہے، یہ فلمی شاعر کا ہے۔ کہنے لگے کس کا ہے؟ میں نے کہا میرا۔ میں نے کہا کہ اب اس مصرعے کے برابر کا کوئی مصرعہ لا کر بتایئے۔ آپ نے یہی فلم کا مصرعہ کیوں چُنا؟

تو صورت یہ ہے کہ شاعری چاہے فلم میں کریں، چاہے رسائل کے لئے لکھیں، چاہے ٹی وی کے لئے لکھیں، شاعری ہونی چاہیے۔ اس میں کوالٹی ہو تو آپ کو کریڈٹ جاتا ہے۔ مختلف خانوں میں اسے بانٹ کر اچھا یا برا نہیں کہا جاسکتا۔

اب میں نے پوچھا کہ ہر شاعر فلمی شاعر کیوں نہیں ہوسکا اور فلموں میں چند شاعر بہت زیادہ کامیاب ہوئے، اس کا کیا سبب ہے؟

جواب ملا: یہ اتنا ہے کہ جو شاعر صرف غزل گو ہوگا وہ فلم میں ناکام رہے گا کیونکہ اس میں صرف غزل نہیں چلتی، موسیقی سے زیادہ تعلق گیت کا ہے۔ غزل وہ چل جاتی ہے جس میں موسیقیت ہوگی اور شاعر جانتا ہے کہ اس کی تقسیم اس طرح ہو کہ طرز بناتے ہوئے میوزک ڈائریکٹر کو از خود کچھ کرنے کی ضرورت نہ پڑے، خود بخود اس کی تقسیم ہوتی چلی جائے۔ ایسا بعض غزلوں میں ہوتا ہے۔ جس شاعر کو گیت کا ادراک ہوگا اور اُس میں بھی وہ میٹر کے تجربے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ کامیاب رہے گا۔

دوسرا یہ کہ اُس میں سچویشن کی پابندی کرنی ہوتی ہے، یہی نہیں کہ میوزک ڈائریکٹر نے طرز دے دی یا آپ نے لکھ کر دے دیا اور گیت بن گیا، یوں نہیں ہوتا۔ اب جو ذہین شاعر ہے وہ پہلے دیکھے گا کہ کہانی کا کس عہد سے تعلق ہے، جو کریکٹر ہے وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اُس کے منہ میں کون سی زبان ٹھیک رہے گی، اور یہ کہ جس زمانے کی کہانی ہے اس زمانے میں کون سی صنفِ سخن زیادہ مقبول تھی۔ یہ ساری چیزیں شاعر کو چننا پڑتی

ہیں۔ ورنہ یہ ہے کہ تانگے والی کی زبان میں کوئی فلسفیانہ چیز دے دی یا فلسفی کے منہ میں "آ جا مورے بالما تیرا انتظار ہے" نہیں چلے گی۔

میری ایک فلم تھی (نام میں بھول جاتا ہوں) اُس میں دو قسم کے کریکٹر تھے، ایک پڑھا لکھا، دوسرا ان پڑھ۔ ہیرو گریجویٹ تھا، ہیروئن بھٹیارن تھی۔ اب ان کو میں نے الگ الگ زبان دی۔ ہیروئن جو بھٹیارن تھی اُس کی زبان سے میں نے کہلوایا "میرے جوڑے میں گیندے کے پھول، میں تجھے کیسی دِکھوں۔" اس لفظ دِکھوں سے میں نے اس کے طبقے کا اظہار کیا، اور وہ جو ہیرو تھا اس کی زبان سے یہ غزل کہلوائی "ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ" تو یہ چیزیں جو کر پائے اور جسے ان چیزوں پر قدرت ہو وہ فلم میں جا کے کامیاب رہ سکتا ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ میں غزل گو ہوں، جا کے غزل لکھ کے دیتا جاؤں گا، تو وہ ناکام ہو جائے گا۔

میں نے پوچھا: کیا آپ کی طبیعت اور مزاج میں غنائیت ہے؟

بولے: یہ تو قدرتی ہے۔ یہ میری شعوری کوشش نہیں ہے۔ غالباً یہ ہے کہ جس علاقے میں مَیں پیدا ہوا اور بچپن جہاں گزارا، وہ صوبہ سرحد کا ضلع ہزارہ ہے، اُس زمانے کا ہری پور جس میں میں پیدا ہوا، لوک گیتوں کا مرکز، قدرتی مناظر، باغات، نہریں، پرندے، جگنو، یہ ساری چیزیں مل کر ہری پور بنا، شاید وہ قدرت کی دین تھی۔ اس میں میری شعوری کوشش نہیں کہ غنائیت سی پیدا کروں۔ وہ ہو جاتی ہے۔

میں نے کہا: موسیقی کی تربیت ضروری نہیں؟

وہ بولے: نہیں صاحب، بالکل نہیں، یہ تو اس شعبے میں بیٹھ بیٹھ کر چند راگنیوں کے نام اب یاد ہو گئے ہیں ورنہ یہ ہے کہ ذہن میں ایک میٹر ہوتا ہے اسی سے کام چلتا ہے۔ گلے سے اس کا کہنا یا گانا یا سمجھنا سمجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کا الگ ہی عطیہ ہے۔

میں نے پوچھا: کبھی ایسی آزمائش کا مرحلہ بھی آتا ہے کہ موسیقار نے ایک طرز بنا دی اور بغیر الفاظ سوچے آپ کے حوالے کر دی کہ اس پر لفظ بٹھایئے؟

قتیل شفائی نے کہا: ہاں میں کر لیتا ہوں لیکن ان لوگوں کی طرح میں نہیں کرتا کہ

اُس کی اوٹ پٹانگ سی ایک طرز بنادی جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہے، تو یہ تک بندی وہاں سے شروع ہوتی ہے، وہ شاعر اُسی میں سر کھپاتا ہے اور وہ تک بندی ہو جاتی ہے، میں میوزک ڈائریکٹر سے کہتا ہوں کہ دیکھو بیٹے، تمہاری طرز یہاں سے جھول کھاتی ہے، اور یہاں سے بے وزن ہوتی ہے۔ اگر کہو تو میں اسے سیدھا کر دوں، تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا، ذرا سی محنت کرنا پڑتی ہے، تو اس طرح میں مصرعے کو سیدھا کر لیتا ہوں اور کسی قاعدے میں لے آتا ہوں، پھر وہ طرز درست کرتا ہے اور میں لکھ دیتا ہوں۔

انتظار فلم آپ کے ذہن میں ہوگی۔ اس کے میوزک ڈائریکٹر تھے خورشید انور، جو ایم اے گولڈ میڈلسٹ تھے اور امیچر تھے، پیشہ ور نہیں تھے۔ آپ یقین کریں کہ انتظار کے آٹھ گانوں میں سے چھ گانوں کی طرزیں بنی ہوئی تھیں لیکن وہ خورشید انور کی بنائی ہوئی تھیں جو خود پہلے شاعر رہ چکے تھے۔ آپ انتظار کے گانے سنیں تو یہی محسوس ہوگا کہ پہلے لکھے گئے بعد میں طرزیں بنیں۔ اس میں تقسیم کا کمال تھا مثلاً "جس دن سے پیا دل لے گئے، دکھ دے گئے۔" یہ گیت کے میٹر عجیب سے ہیں۔ ذرا دیکھئے ہندی گیتوں میں کیا کیا ورائٹی ملتی ہے۔ مثلاً ایک پرانا گیت ہے، اس کی تقطیع اردو میں کریں گے تو نہیں ہوگی: نیا نینوں میں رنگ۔ اٹھی نئی امنگ۔ جیا بولے میٹھی بانی۔ اک تم ہو ساتھ۔ دوجے ہاتھ میں ہاتھ۔ تیجے شام سہانی۔

کتنا Rythm ہے اس میں۔ یہ ہندی بحر ہے۔ اس کی تقطیع ممکن نہیں۔ اسی طرح میں نے اردو غزلوں میں کچھ تجربے کئے اور میرے دوست اندیور نے، جو بھارت کے بہت اچھے شاعر ہیں اور ادب سے فلموں میں آئے ہیں، میری غزل کے بارے میں پوچھا:

سب دنیا نے کہا تجھے مت اعتبار کر اُس کا
بیٹھا ساری عمر میاں اب انتظار کر اُس کا

کہنے لگے کہ یہ ہندی بحر ہے لیکن آپ نے کہیں سے ہٹایا ہے اسے اور اپنا لیا ہے اس کو۔ تو یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ ہندی میں بڑی ورائٹی ہے۔

میں نے پوچھا: کیا یہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کا ردعمل آپ تک پہنچتا ہے اور آپ اپنے اسلوب کی راہیں بدلتے ہیں؟

بولے: جی جی، وہ بھی شاعر کی ذمے داری ہے، میں اس کی مثال دیتا ہوں کہ ایک فلم دلِ بیتاب آئی اُس میں سچویشن مجھے بتائی گئی۔ وہ جو فلموں میں ہیروئن لُٹ پُٹ جاتی ہے، اسے بے وفائی کا صدمہ ہوتا ہے تو اب سیدھی بات ہے کہ وہ کہہ سکتی ہے کہ میں برباد ہوئی، میں برباد ہوئی۔ عام شاعر یہی لکھے گا اور اسی پر بڑی آسانی سے طرز بن جائے گی، تو میں نے وہاں ایک اور چیز دی جس سے میوزک ڈائریکٹر کو پریشانی بھی ہوئی لیکن ڈائریکٹر ہمایوں مرزا تھے جو باذوق تھے، انہوں نے اُسی پر اصرار کیا، تو اب وہی چیز بائیس تیئس سال بعد انڈیا کی ایک فلم میں مہیش بھٹ نے کہا کہ میں وہی چیز دوہرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ تھا:

زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کئے بغیر　　　ہم سے بدل گیا وہ نگاہیں تو کیا ہوا

تو شاعر کا یہ کام ہے کہ یا تو میں برباد ہوئی لکھ کر کام چلائے یا جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس طرح لکھے۔ اب معیار مقرر کرنا شاعر کا کام ہے۔ یہی شاعر اور تک بند کا فرق ہے۔

میں نے پوچھا: یہ بتائیے کہ اب جو زمانہ بدل گیا ہے اور گانوں کے انداز بدل گئے ہیں، فلم مایوس تو نہیں کرتی آپ کو؟

بولے: جناب میں نے تو کوئی پندرہ سال تک بن باس کاٹا، چھوڑ دیا — چھوڑ کیا دیا، میں ان کی ضرورت ہی نہیں رہا۔ میرے جیسے لوگ جو کچھ لکھتے ہیں وہ تو رکاوٹ بنتے ہیں ایسی فلموں میں جو دھڑ ادھڑ دھڑ ادھڑ جا رہی ہیں۔ لیکن اب ایک رویّہ بدلا ہے، انڈیا میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ اس لئے میں جب انڈیا گیا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، مجھ سے نہ صرف فلم کے گانے لکھوائے گئے، البم الگ بنوائے گئے۔ اب جا کے پھر طرزِ عمل بدلا چونکہ کہانیاں بدلیں، رومانٹک کہانیاں آئیں، مقصدی کہانیاں کچھ آنے لگیں، تو وہ مار دھاڑ بیچ میں سے نکل گئی تو اب پھر ٹارزن کی واپسی ہوگئی ہے۔ (قہقہہ)

آج میں کہتا ہوں کہ یہ شاید بیسویں صدی کا آخری قہقہہ تھا۔ وہ جس کی واپسی ہوئی وہ ٹارزن نہ تھا، ہوا کا ایک جھونکا تھا جو ایسا ساکت ہوا کہ پھر اس کے بعد کھڑکیوں کے

پردوں کی جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ سنبھلی سنبھلائی فلمیں، وہ سنجیدہ کہانیاں، وہ ٹھہری ٹھہری سی موسیقی، وہ قرینے کے بول اور سلیقے کے نغمے، سارے کے سارے ایسے سدھارے کہ اب تو خوابوں میں آنے سے بھی کتراتے ہیں۔

اب تو منظر یوں ہے کہ چالیس لڑکے اور لڑکیاں دیوانہ وار ناچ رہے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان ایک خاتون یا ایک صاحب الاپ رہے ہوتے ہیں:

دل میں میرے ہے دردِ ڈسکو۔ دردِ ڈسکو۔ دردِ ڈسکو

ایسے درد کے بعد جیسے نغمے کی ولادت ہوگی، اس کا ذکر کرتا ہوں تو سننے والے یہ بات کہتے تو نہیں مگر دل میں ضرور کہتے ہوں گے کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔

یہ درست ہے کہ میرا تعلق نئی نسل سے نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ تخلیق کے درد سے گزر کر اُن اعلیٰ نغموں کو جنم دینے والوں کی پوری نسل دنیا سے اٹھ چکی ہے۔ اس کتاب میں جتنے نغمہ نگاروں کا ذکر ہے، دو چار کے سوا سب اپنی اپنی غزلوں کے مقطع کہہ چکے ہیں، سب کے آگے سے شمع اٹھائی جا چکی ہے۔ محفل برخاست ہو چکی ہے۔ انجمن بڑھائی جا چکی ہے۔ یہاں تک کہ اب تو فضا میں ان شمعوں کا دھواں بھی باقی نہیں۔

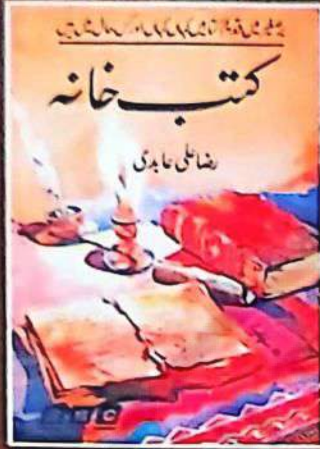
گزرے ہوؤں کا جو اثاثہ رہ گیا ہے وہ اُن کے قدموں کے نشان ہیں۔ جن پگڈنڈیوں پر لوگ چلنا ترک کر دیں ان پر گھاس اُگ آتی ہے مگر گزرے وقتوں کی ہریالی کے درمیان انہوں نے قدموں کے جو نشان چھوڑے اُن پر سُروں کے پھول اُگے ہیں جن سے تانوں کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ وہ لوگ باقی نہیں مگر ان کے نغمے آج بھی دلوں کی طرح دھڑک رہے ہیں اور سانسوں کی طرح آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ لگتا یوں ہے کہ جانے والوں نے فراق کے جس کرب کو نغموں میں ڈھالا تھا وہ کرب رہ جائے گا اور آج کے ڈسکو کا جو درد اٹھا تھا، وہ اور آٹھ دس برس رہ جائے تو غنیمت جانئے۔

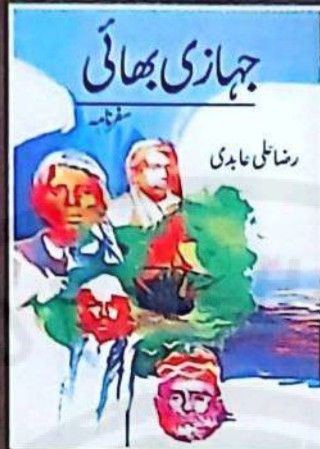
سلطان پور کے ایک طبیب نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جو نسخہ لکھا تھا وہ نغمے کی لوح پر بہت عرصے ثبت رہے گا:

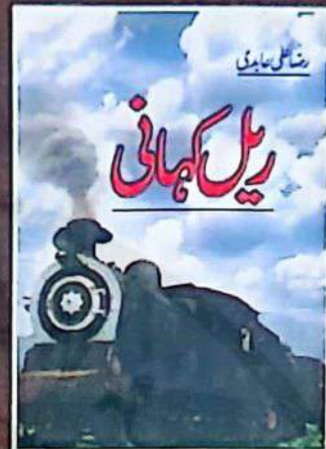
رہیں نہ رہیں ہم مہکا کریں گے
بن کے کلی، بن کے صبا باغِ وفا میں

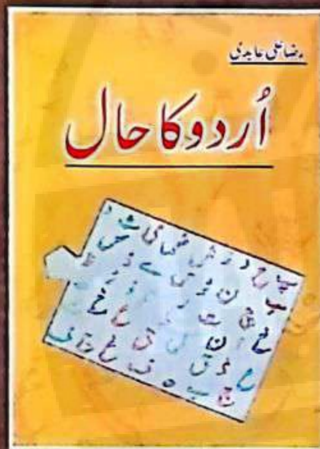
☆......☆......☆

رضا علی عابدی

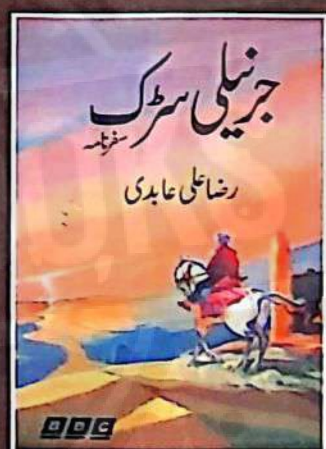


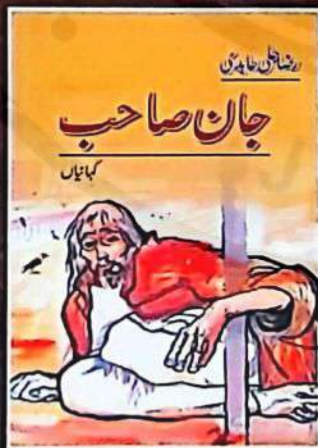


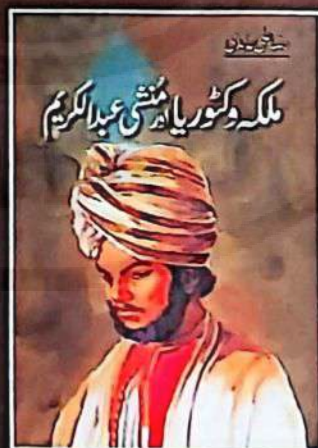












Rs. 900-00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2306-7
ISBN-13: 978-969-35-2306-5



کتاب کے سرورق پر نامور گلوکار طلعت محمود کی ذاتی بیاض کا عکس ہے، جس میں تحریر انہی کے ہاتھ کی ہے۔